نقوشِ خاطر

از قلم

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : نقوشِ خاطر

از قلم : مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم بنگلور

صفحات : ۳۴۹

تاریخ طباعت : رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای۔میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

فہرست

مضامین	صفحہ
مقدمہ	۶
امت مسلمہ کی زبوں حالی اور علماء کی ذمہ داری	۱۰
اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر	۱۵
اسلام دشمنی سے انسانیت سازی تک	۲۲
عشق نبوی ﷺ کا تقاضہ	۲۸
اصلاح معاشرہ کی تحریکات ناکام کیوں؟	۳۳
جنت کا جعلی ٹکٹ	۳۹
امت کا بگاڑ اور علما کی ذمداریاں	۴۵
جاہلیت جدیدہ	۵۱
عصری تعلیم دینی ماحول میں	۵۵
ماہ رمضان اور ہم	۶۲
انقلاب مصر کے پس منظر میں	۶۶
ہمارا عائلی نظام تباہی کے دہانے پر	۶۸

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ ایک درسِ عبرت	۷۲
قرآن فہمی کے نام پر	۷۵
مدارس کے چندے میں بے اصولی اور اس کے نتائج اہل مدارس کی توجہ کے لیے	۸۱
دین میں غلو کا فتنہ	۸۸
ووٹ اسلامی نقطۂ نگاہ سے	۹۶
مدارس اسلامیہ ہدف ملامت کیوں؟	۱۱۱
حالیہ لوک سبھا انتخابات۔ایک جائزہ ایک عبرت	۱۱۸
رمضان المبارک کی قدر کیجیے	۱۲۲
قربانی-ایک عظیم الشان عبادت ہے	۱۲۶
امت میں موجود بگاڑ کے اسباب	۱۳۱
اسلامی قانون کی بالا دستی	۱۴۳
رسم پرستی یا دین پرستی؟	۱۴۹
برادران وطن میں تعارف اسلام کی ضرورت	۱۵۵
ہندوستان کے موجودہ حالات میں۔ملتِ اسلامیۂ ہند کے نام دلِ دردمند کا پیغام	۱۶۲
ملت اسلامیۂ ہند کے نام۔دلِ دردمند کا پیغام	۱۶۹
گھر واپسی کا نعرہ۔ایک حقیقت پسندانہ جائزہ	۱۷۵
اسلام میں انسانیت کا مقام	۱۸۱
قانون اسلامی میں مذہبی آزادی کا حق	۱۹۱
یوگا یا سوریا نمسکار اسلامی نقطہ نظر سے نا قابل قبول	۱۹۹
نظام تربیت	۲۰۶

مسلمانِ ہند کا سیاسی مستقبل۔اہل دانش کی خدمات میں ایک تجویز	۲۲۱
دیہاتوں اور قریوں کی دینی پسماندگی۔اہل علم واصحاب ثروت کے لیے لمحۂ فکریہ	۲۲۶
ربیع الاول کا پیغام امت اسلامیہ کے نام	۲۳۴
دین کے تمام شعبے ضروری اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں دینی محنت کرنے والوں کو اکابر کی اہم نصیحت	۲۳۹
کب تک یہ گستاخیاں؟	۲۵۰
مولانا انظر شاہ کی اچانک گرفتاری ہندوستانی مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ	۲۵۶
مسلمانان ہند کی حب الوطنی	۲۶۱
ہمارے کرنے کا ایک کام یہ بھی ہے	۲۶۴
بھارت کو ’’ماتا‘‘ کہنے کی حقیقت	۲۶۹
مدارس کا چندہ–چند قابل اصلاح پہلو	۲۷۴
آہ! حضرت مولانا قاسم قریشی،مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی	۲۸۶
ایک افسوس ناک صورت حال۔دینی تعلیم اور مدارس کے سلسلے میں امت کا رول	۲۹۳
مومن کی زندگی پر استحضار آخرت کے اثرات	۳۰۱
یکساں سول کورٹ اور مسلمانوں کا نقطۂ نظر	۳۰۹
مسلم پرسنل لا یا یونیفارم سول کوڈ؟	۳۱۸
عہد حاضر کی ’’لادینیت‘‘ کا علاج۔دینی ماحول میں عصری تعلیم کا نتیجہ	۳۲۹
کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں	۳۳۳
معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز	۳۴۱
ایک روزہ جس کو بھلا دیا گیا	۳۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

آج سے سات سال قبل صوبۂ کرناٹک کے شہر بنگلور میں ہندوستان کی معروف ومشہور، معتبر ومستند، جامع علم وعمل شخصیت صاحب تصانیف کثیرہ استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ (بانی ومہتمم وشیخ الحدیث الجامعۃ اسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور) نے صوبۂ کرناٹک کے دینی اعتبار سے بعض انتہائی نازک وپریشان کن حالات دیکھ کر اس سلسلہ میں رجوع الی اللہ کے بعد شہر کے مؤقر علماء کرام کی ایک جماعت کو لیکر حالات کی اصلاح کے لئے ، امت مسلمہ کے ایمان وعمل کے تحفظ کے لئے ''مجلس تحفظ شریعت کرناٹک'' کے نام سے ایک دینی تحریک کی داغ بیل ڈالی جس کے اغراض ومقاصد اس وقت اخبارات وغیرہ میں جو بیان کئے گئے ان کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا:

''مجلس تحفظ شریعت کانفرنس کے انعقاد کا اصل مقصد امت مسلمہ میں در آئے غیر اسلامی نظریات وعقائد، جاہلانہ رسومات وبدعات، معاشرتی ومعاملاتی خرابیوں کی اصلاح ہے، تاکہ عامۃ المسلمین میں ایک روح پھونکی جائے کہ وہ خود میں اور اپنے اہل وعیال میں اور اپنے متعلقہ حلقوں میں دین وشریعت کو نافذ کرنے کی فکر وجد وجہد کریں، ایمان وعقیدہ میں مضبوطی پیدا کریں، توحید وسنت سے پوری طرح وابستہ ہوں، اعمال وعبادات میں آگے بڑھیں، اعمال صالحہ کے عادی بنیں اور منکرات وفواحش سے بچیں، تہذیب ومعاشرت کو پاکیزہ

بنائیں ،اور شادی ہو یا غمی سب میں دین و شریعت کی رعایت رکھیں ،آپسی جھگڑوں ونزاعات سے پرہیز کریں ،طلاق وخلع کے واقعات کو قابو میں رکھیں اور اخلاق وکردار کو سنواریں ،معاملات میں اچھے برے کی پہچان کریں ،حلال و حرام کی تمیز کریں ۔الغرض تمام شعبوں میں شریعت کو داخل کرنے کی فکر ،اور قرآن کا یہ مطالبہ ” اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً “ (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کو پورا کرنیکا جذبہ اور صرف نام کے مسلمان نہیں بلکہ واقعی وحقیقی مسلمان بن کر زندگی گزارنے اور توحید وسنت والی زندگی اختیار کرنے کا حوصلہ پیدا کریں ۔“

اس عظیم تحریک کا آغاز شہر بنگلور کے مشہور ومعروف ادارے ”الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم ،بنگلور“ میں منعقد کئے جانے والے ایک عظیم الشان سیمینار سے ہوا ،جس میں ملک کے نامور اکابرین کو مدعو کیا گیا ،ان اکابرین کی آمد اور ان کے روح پرور خطابات سے ایمانوں کو جلا ملی ،علماء کے قلوب میں احقاق حق وابطال باطل کا جذبہ پیدا ہوا ،پورے صوبہ میں اس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے اس طرح یہ اجلاس صوبہ کا ایک مثالی وتاریخی اجلاس بن گیا۔

”مجلس تحفظ شریعت کرناٹک“ کے اغراض ومقاصد میں ایک علمی اصلاحی مجلّے کا آغاز بھی پیش نظر رہا ،کیوں کہ مسلم اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ عام طور پر باطل کو فروغ دینے ،باطل نظریات کی اشاعت کرنے اور عوام کو حق اور علماء حق سے برگشتہ کرنے اور اسلام کی شبیہ بگاڑ کر امت کے سامنے پیش کرنے کی ناپاک کوشش میں مصروف ہیں ،جس کی وجہ سے وہ طبقہ جس کے پاس علم دین نہیں اور وہ علم حاصل کرنے کے لئے کسی عالم کی خدمت میں جانے کو اپنی توہین سمجھتا ہے ،اسلام کی تعلیمات کے سلسلہ میں غلط نظریات وتصورات کو اپنے دل میں بٹھا کر گمراہی کا شکار ہوتا جارہا ہے۔

چنانچہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے اور امت کے ہر طبقے تک اسلام کی مستند تعلیمات کو پہنچانے کے لئے یہ اقدام ضروری سمجھا گیا کہ خالص علماء حق کی سرپرستی میں ایک مجلّہ شائع کیا جائے۔

چنانچہ ''تحفظ شریعت کانفرنس'' کے انعقاد کے سات ماہ بعد مجلّے کے باقاعدہ آغاز کے لئے شہر بنگلور کی مسجد ''عیدگاہ فورتھ بلاک'' میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کی مقبول ترین عالمی شخصیت حضرت مولانا خلیل الرحمان سجاد نعمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ (خلیفۂ اجل حضرت مولانا پیر ذوالفقار صاحب نقشبندی) بہ طور مہمان خصوصی مدعو تھے ،آپ کے مبارک ہاتھوں سے اس مجلّے کے پہلے شمارے کا آغاز ہوا، جو رجب المرجب ۱۴۳۳ھ مطابق جون ۲۰۱۲ء کا شمارہ تھا،اور اس مجلّے کا نام ''تکبیر مسلسل'' تجویز ہوا۔

اس رسالہ کو شائع کرنے کا مقصد ''تکبیر مسلسل'' کے پہلے شمارے کے شذرات میں حضرت مدیر مسؤل دامت برکاتہم نے اس طرح لکھا ہے:

> ''تکبیر مسلسل محض ایک رسالہ نہیں؛ بل کہ ایک علمی وفکری، اصلاحی و دعوتی تحریک ومشن ہے، جس کا مقصدِ وحید، امتِ اسلامیہ میں دین وشریعت کے حوالے سے پیدا ہونے والی کم زوری وخلل، ایمان واعتقاد کے لحاظ سے ظاہر ہونے والے انحطاط واضمحلال اور اعمال وعبادات، معاشرت واخلاق، معاملات وعادات میں رونما ہونے والی تنزلی وبے حسی کو دور کرنا اور اس سلسلے میں اصلاحی اقدام کرنا ہے۔''

الحمد للہ سات سالوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہونے والا یہ ''تکبیر مسلسل'' اپنے مقصد کی کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے،عوام وخواص کا منظور نظر بنا ہوا ہے،، مجلّہ اپنے ظاہری وباطنی حسن کی وجہ سے ہندوستان کے اکابر علماء سے خوب دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے، اعتدال وتوازن کے ساتھ حق گوئی اس مجلّے کی پہچان بن گئی ہے،اس کے مضامین کے تحقیقی

ہونے کی وجہ سے علمی حلقوں میں مجلّے کو سند کا درجہ حاصل ہے، جس کے حوالے دیگر کتب ومجلّات میں دیئے جاتے ہیں، اس کی مقبولیت کے اسباب وبواعث میں جہاں بہت ساری خوبیوں کو دخل ہے وہیں مجلّے کے مدیر مسئول حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے شذرات بھی اس کی ترقی کا اہم زینہ ہیں۔

یہ شذرات مختلف حالات پر بروقت بے لاگ تبصرے، امت کو پیش آنے والے مسائل کے عمدہ حل، ملت کی روح وساخت کو کھوکھلا کرنے والے امراض کی تشخیص اور قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کی صحیح تجویز پر مشتمل ہونے کی لاجواب خوبیوں کا مرقع ہونے کے ساتھ انشاء وادب کا سیل رواں بھی ان میں قاری کی دلچسپی کو بڑھاتا ہے، ''تکبیر مسلسل'' کے پڑھنے والے بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میں صرف قلم کی فنکاری نہیں بلکہ ایک دردِ دل کی ترجمانی بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ بے شمار علماء کی خواہش تھی کہ ان شذرات کے مجموعہ کو الگ سے شائع کیا جائے تاکہ ان سے استفادہ وقتی نہ رہے بلکہ دائمی ہو، اور یہ قیمتی سرمایہ اور علم وتجربات کا گنجینہ تاقیامت محفوظ رہے۔

اسی غرض سے ان شذرات کو الگ سے شائع کیا جارہا ہے کہ ان کا افادہ عام ہو۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالی اس کو قبول فرمائے اور امت کے لئے باعث نفع بنائے۔

محمد زبیر

(استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم ومرتب ماہنامہ تکبیر مسلسل)

۲؍شوال المکرّم ۱۴۳۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امت مسلمہ کی زبوں حالی اور علماء کی ذمہ داری

الحمد للہ ''تکبیرِ مسلسل'' کا اولین شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، جو محض ایک رسالہ نہیں؛ بل کہ ایک علمی وفکری، اصلاحی و دعوتی تحریک ومشن ہے، جس کا مقصدِ وحید، امتِ اسلامیہ میں دین وشریعت کے حوالے سے پیدا ہونے والی کم زوری وخلل، ایمان واعتقاد کے لحاظ سے ظاہر ہونے والے انحطاط واضمحلال اور اعمال وعبادات، معاشرت واخلاق، معاملات وعادات میں رونما ہونے والی تنزلی وبے حسی کو دور کرنا اور اس سلسلے میں اصلاحی اقدام کرنا ہے۔

یہ بات ہر شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ اسلام نجات کا مدار، کامیابی کا راستہ اور دنیا وآخرت کی صلاح وفلاح کا ضامن اگر کسی چیز کو قرار دیتا ہے، تو قرآنِ کریم اور سنت وسیرتِ نبویہ کی اتباع کرنے، لوائے محمدی وخیمہ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ سایہ لمحاتِ زندگی گزارنے اور فکری واعتقادی، عملی وانتظامی، انفرادی واجتماعی اور تمدنی وسیاسی زندگی کے ہر محاذ پر اسی کی رہبری وسرپرستی میں جینے ومرنے کو قرار دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں دنیا کا کوئی فکروفن ہو، کوئی فلسفہ ونظریہ ہو، کوئی مسلک ومذہب ہو، فکروفن کا کوئی رنگ ہو، زندگی کا کوئی ڈھنگ ہو اور تہذیب وتمدن کا کوئی آہنگ ہو؛ اسلام کے نزدیک اس کی کوئی بھی حیثیت نہیں۔

مگر محض ایک نظریاتی فلسفے کی حیثیت سے نہیں؛ بل کہ اس حیثیت سے اس کو قبول کیا جائے کہ اپنی زندگی کی دوڑ دھوپ میں، میدان عمل کے ہر موڑ پر اور ظاہر سے باطن تک ہر جگہ اسی کا نفاذ ہو، اسی کا چلن ہو اور اسی کا بول بالا ہو۔

لیکن آج اس کے برعکس امت میں ایمان وعقیدے کے لحاظ سے کیا؟اعمال وعبادات کے لحاظ سے کیا؟ اور معاشرت واخلاق کے اعتبار سے کیا؟ ہر لحاظ سے بے راہ روی و بے اعتدالی، بے حسی وتنزلی نظر آتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ اب ہر چیز میں حسن وقبح، نیکی وبدی، غلط وصحیح، حق وباطل اور اچھائی وبرائی کو جانچنے کے لیے اسلام کو معیار بنانے کے بہ جائے کبھی مغربی اقوام کو معیار بناتے ہیں، تو کبھی یوروپی افکار کا حوالہ دیتے ہیں، کبھی دنیوی فلسفوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، تو کبھی عقل ودانش کو معیار بناتے ہیں، کبھی باپ دادوں کے نظریات واعمال کا حوالہ لاتے ہیں، تو کبھی معاشرے میں پھیلے ہوئے رسوم ورواجات کو دلیل بناتے ہیں اور بات یہیں تک نہیں ؛ بل کہ خود اسلام کی صداقت وسچائی ، اس کی معقولیت ومعنویت اور زمانے کے ساتھ چلنے کی قوت وصلاحیت کو جانچنے کے لیے بھی دوسرے فلسفوں، اِزموں، تہذیبوں اور طریقوں اور رواجوں کو معیار بناتے ہیں۔

اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ؛ بل کہ ایک وبائے عام ہے، جس کی شہادت وگواہی ان کی تقریبات وتفریحات، ان کی معاشرت ومعاملات، ان کے اقوال واعمال، ان کے اخلاق وکردار، ان کی تہذیب وتمدن، ان کے انداز واطوار؛ ہر ہر چیز دیتی ہے۔

اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں بہت سے داخلی وخارجی فتنوں کا ہاتھ ہے، جنھوں نے اسلام اور اس کی ربانی دعوت کے خلاف روزِ اول سے یلغار شروع کر رکھی ہے اور اس کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے یا کم ازکم اس کو کم زور کرنے کے لیے اپنی ساری توانائیاں وقوتیں اور اپنی تمام تر ذرائع ووسائل کو بروئے کار لاکر روز بہ روز؛ بل کہ لحہ بہ لحہ قدم آگے بڑھاتے جارہے ہیں اور اسلام واہلِ اسلام کی صفوں میں مختلف ناموں اور لیبلوں اور نئے نئے رنگوں اور طرزوں سے گھستے جارہے ہیں۔

نتیجتاً امت کے ایک بڑے طبقے میں اسلام اجنبی سا معلوم ہونے لگا، معروفات اجنبی ہوتے چلے گئے، اسلام کی صاف وستھری تعلیمات بھی درخورِ اعتنا نہیں رہیں، اسلام کا نام تو موجود؛ مگر حقیقت غائب، معروفات کی جگہ منکرات نے لے لی، سنتوں کی جگہ بدعات کا

قبضہ ہو گیا، حقائق کی جگہ خرافات کو دے دی گئی۔

ایک حدیث میں اس قسم کے فتنے برپا ہونے کی پیش گوئی کی گئی ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يُوشِکُ أنْ يَأتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لاَ يَبْقٰى مِنَ الاِسْلاَمِ اِلَّا اسْمُهُ ، وَلَا يَبْقٰى مِنَ القُرآنِ اِلَّا رَسْمُهُ ، مَسَاجِدُهُم عَامِرَةٌ وَ هِيَ خَرَابٌ مِنَ الهُدٰى ، عُلَمَائُهُم شَرٌّ مَنْ تَحتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ ، مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الفِتْنَةُ و فِيهِمْ تَعُودُ.»

(کنز العمال:۳۱۱۳۶، مشکاۃ المصابیح:۲۷۶، شعب الایمان:۱۹۰۸)

(قریب ہے کہ لوگوں پر وہ زمانہ آئے، کہ اسلام میں سے سوائے نام کے کچھ باقی نہ ہو اور قرآن میں سے سوائے لفظ کے کچھ نہ رہے، ان کی مساجد تو عالی شان ہوں گی؛ مگر ہدایت سے خالی و ویران، ان کے علما آسمان کے نیچے رہنے والوں میں سب سے بدتر ہوں گے، ان ہی سے فتنے پیدا ہوں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے۔)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا، کہ اسلام کا نام تو ہوگا، قرآن کے الفاظ، ان کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بھی خوب ہوگا، مساجد بھی عالی شان ہوں گی؛ مگر یہ سب محض ایک رسم و رواج کے طور پر اور ظاہر ظاہر تک محدود ہوگا، اسلام کے احکام پر حقیقی معنے میں عمل مفقود ہوگا، قرآن کو زندگی کی اساس بنانے کا تصور ختم ہو جائے گا، مساجد علمائے حق اور اہلِ حق سے خالی ہونے کی وجہ سے عالی شان ہونے کے باوجود، ہدایت سے خالی و ویران ہوں گی۔

ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ اور عبداللہ بن مسعود و دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا:

« بَدَأَ الإِسْلاَمُ غَرِيباً وَ سَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ غَرِيباً ، فَطُوبٰى

لِلْغُرَبَاءِ»

(مسلم:۳۸۹،ترمذی:۲۶۲۹،ابن ماجہ:۳۹۸۶،۳۹۸۷،۳۹۸۸،احمد:۱/۳۹۸،۲/۳۸۹)

(اسلام اجنبیت کی حالت میں شروع ہوااور عن قریب جیسا شروع ہوا، ویسا ہی اجنبیت کی طرف لوٹ جائے گا، پس خوش خبری ہو غربا کو(یعنی ان لوگوں کو جو اس حالت میں دین پر قائم رہنے والے ہیں۔)

بعض روایات میں ’’غرباء‘‘ کی تفسیر بھی وارد ہوئی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

«فطُوبىٰ لِلغُرَبَاءِ الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِن بَعْدِي مِن سُنَّتِي. »

(مسند احمد:۴/۷۳،معجم کبیر طبرانی:۵/۷۴۴)

پس خوش خبری ہے ان ’’غرباء‘‘ کو جو میرے بعد، میرے طریقے میں لوگوں کے پیدا کردہ فساد کی اصلاح کریں گے۔

الغرض اب غور طلب یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا تقاضا کیا ہے؟اور اس کا مطالبہ کیا ہے؟ کیا یہ نہیں کہ علمائے کرام وداعیانِ اسلام بلاخوف لومۃ لائم کھڑے ہوں، اس فساد کو دور کریں، امت کی خبر گیری کریں، اس کا ہاتھ پکڑیں، اس کو صراطِ مستقیم کی جانب لانے میں اس کی مدد کریں، اس کے عقائد وایمان کی، ان کے اعمال واخلاق کی، ان کے معاملات ومعاشرت کی نگرانی واصلاح کا فریضہ انجام دیں؟ اور ’’غرباء‘‘ کو دی گئی اس بشارت میں اپنا بھی حصہ لگائیں۔اگر یہ ضروری ہے،تو علمائے کرام وداعیانِ اسلام کو اس فریضے کا احساس کرتے ہوئے اپنی ذمے داری کو نباہنے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔

لہٰذا ہم ’’تکبیرِ مسلسل‘‘ کے ذریعے علمائے کرام وداعیانِ اسلام کو ہماری اس تحریک ومشن سے جڑنے اور حق وصداقت کو پھیلانے میں ہمارے ساتھ تعاون کرنے کی گزارش کرتے ہیں۔

اور دوسری جانب عوام اہلِ اسلام سے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری اس تحریک سے خود کو وابستہ کرتے ہوئے اپنے گھروں میں، رشتہ داروں میں، ساتھیوں اور دوستوں میں اور اپنے متعلقین میں اس رسالے کو پہنچانے اور اس کے مندرجات و مشمولات سے خود بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے کی راہیں نکالیں۔

☆☆☆

اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

آج امت مسلمہ کی زبوں حالی و پریشانی، اس پر یہود و نصاریٰ، کفار و مشرکین کی جانب سے ظلم و تشدد، اپنی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ دنیا بھر میں اس کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا گیا ہے، اسی کے ساتھ پولس جس کو محافظ ہونا چاہیے تھا، وہ بھی ظالموں کے ساتھ دیتی اور مظلوموں پر مزید ظلم ڈھاتی نظر آرہی ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف امت بہ حیثیت مجموعی انتہائی کم زور، بے بس اور نہتی نظر آتی ہے، جس کے پاس اپنے اوپر ہونے والے مظالم و مصائب کے دفعیے کا کوئی سامان نہیں، وہ اپنا دفاع بھی کرے، تو اس کو ظالم قرار دیا جاتا ہے۔

دورِ رسالت و صحابہ سے تقریباً ایک ہزار برس تک اہلِ اسلام کو جو عروج و اقبال نصیب ہوا تھا اور اسلام کے زیرِ سائے ان کی حکومت کو، جو آب و تاب اور شان و شوکت حاصل ہوئی اور تقریباً پوری دنیا پر ان کو جو رعب و دبدبہ اور اقتدار قائم تھا، یہ سب ایک ایسی حقیقت ہے، جس کی گواہی اپنے ہی نہیں غیر بھی دیتے ہیں۔ لیکن (سنہ: ۱۰۰۰ھ) کے بعد سے مسلمانوں میں جو انحطاط اور کم زوری پیدا ہوئی، وہ مسلسل بڑھتی ہی چلی گئی اور بڑھتی ہی جا رہی ہے اور ان کا یہ انحطاط زندگی کے تمام شعبوں میں رونما ہوا ہے: عملی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی ہر شعبہ اس سے متأثر ہے اور اس نے بڑھتے بڑھتے ہم کو اس پوزیشن اور حیثیت میں لا کھڑا کیا ہے کہ ہماری کوئی شان بان تو ایک طرف رہی، رعب و دبدبہ تو ایک طرف رہا، الٹے دوسروں سے مرعوب؛ بل کہ خوف زدہ ہیں، عروج و اقبال تو کجا! نزول و ادبار کی زد میں ہیں اور ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں میں ڈھکیلے جا رہے ہیں اور نکبت و ذلت کے خطرناک

اندھیروں میں گھیرے جا رہے ہیں۔

ہمارے اس شان دار ماضی کے ساتھ اس تاریک حال کو موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟ اس کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟ اور اس صورتِ حال میں امتِ مسلمہ کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں پہلے قرآن حدیث میں عروج واقبال کے اسباب معلوم کرنا چاہیے؛ تا کہ اس سے معلوم ہو جائے کہ اسباب عروج واقبال سے اعراض وروگردانی اور ان سے تہی دامنی ہی پستی اور ذلت، انحطاط و ہلاکت کے اسباب ہیں۔

ایک جگہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِخَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (:۵۵)

(اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے، ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل اختیار کیے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت دے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور ان کے لیے ان کے دین کو جما دے گا، جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور انھیں خوف کے بدلے میں امن عطا کرے گا، وہ لوگ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں گے اور جو ناشکری کرے گا اس کے بعد تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔)

اس سے معلوم ہوا کہ روئے زمین کی خلافت اور وراثت ان لوگوں کو دی جاتی ہے، جو ایمان وعمل صالح اختیار کریں گے۔

ایک جگہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (4:۱۳۹)

(اور تم ہمت نہ ہارو اور رنج نہ کرو اور تم ہی غالب رہو گے، اگر تم پورے اور سچے ایمان والے ہو۔)

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کی مدد و نصرت اور غلبہ و کامرانی ان لوگوں کے لیے ہے، جو ایمان و یقین میں مضبوط اور کامل ہوں اور اس پر پوری طرح جمے ہوئے ہوں۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

(جو کوئی مرد و عورت نیک کام کرے بہ شرطے کہ وہ مومن ہو، تو ہم اس کو (دنیا میں بھی) با لطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کا ان کو بدلہ دیں گے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح سے دنیا کی زندگی میں بھی لطف و راحت میسر آتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر مفسرین نے اس آیت میں اس سے دنیوی زندگی ہی مراد لی ہے، جیسا کہ بیہقی، حاکم، ابن ابی حاتم وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر نقل کی ہے اور ''روح المعانی'' میں ہے کہ بہت سے مفسرین نے یہی مراد لیا ہے۔

(روح المعانی: ۱۴/ ۲۲۷)

قرآن کریم کہتا ہے:

﴿وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

(اگر قریہ والے ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے ،تو ان پر زمین وآسمان سے برکات کھول دیتے؛ لیکن انھوں نے جھٹلایا، پس ہم نے ان کے کرتوت کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔)

اس آیت نے بتادیا کہ انسانوں پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول ایمان اور تقوے کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کے بہ جائے اگر تکذیب وانکار اور اعراض ہو، تو اللہ کی پکڑ ہوتی ہے۔

ایک آیت میں ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۸:O)

(اللہ اس کے رسول اور ان لوگوں کے لیے عزت ہے، جو ایمان والے ہیں؛ لیکن منافق لوگ اس کو جانتے نہیں ہیں۔)

معلوم ہوا کہ عزت وسربلندی ایمان کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔

اب حدیث لیجیے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

«إن هذا الأمر في قريش ، لا يعاديهم أحد إلا كبه الله على وجهه ما أقامو الدين»

(بخاری:۳۲۳۹، احمد:۶۲۴۹، دارمی:۲۴۰۹)

(یہ امر خلافت وسلطنت ہمیشہ قریش میں رہے گی، جو شخص ان سے مخالفت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو منہ کے بل گرادے گا، جب تک کہ وہ لوگ دین کو قائم رکھیں۔)

ان تمام دلائل سے یہ واضح ہوا کہ زمین کی وراثت وخلافت، دنیا کی بالطف ومزیدار زندگی، عزت وعظمت، فتح وکامرانی، غلبہ واقتدار، رحمت وبرکت ان لوگوں کا حصہ ہے، جو ایمان وعمل صالح، تقوی وخشیت سے مالا مال ہوں، بس یہی چیزیں عروج واقبال کے

اسباب ہیں۔

اس کے برخلاف جب کسی قوم میں کفر ومعصیت ، بے عملی وبدعملی، جہالت وجاہلیت، سرکشی وبغاوت ، خدائی احکامات وفرامین سے اعراض وروگردانی ، انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے بتائے ہوئے لائحہ عمل ونمونۂ زندگی سے غفلت، بے خوفی وبدعہدی وغیرہ روحانی امراض پیدا ہوتے ہیں،تو اس کو ذلت ونکبت،زوال وانحطاط کا سامنا کرنا پڑتا ہے،اس سے اللہ کی مدد ونصرت ہٹالی جاتی ہے اور برکت ورحمت کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں۔

یہاں چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

بنی اسرائیل کے تذکرے میں کہا گیا ہے:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآئُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ (2:61)

(اور جم گئی ان پر ذلت وپستی اور مستحق ہوگئے غضب الٰہی کے اور یہ اس وجہ سے کہ لوگ احکام الٰہیہ کے منکر ہوجاتے تھے اور قتل کردیا کرتے تھے،پیغمبروں کو ناحق اور اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے اطاعت نہیں کی اور دائرہ (اطاعت) سے نکلتے جاتے تھے۔)

معلوم ہوا کہ اطاعت سے گریز،احکام الٰہی کا انکار،انبیاء سے بدسلوکی، ذلت وپستی کے اسباب ہیں۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا﴾

(اور ہم بہت سی بستیاں ہلاک کرچکے ہیں، جو اپنے سامان عیش پر نازاں

تھے، سو یہ ان کے گھر ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے؛ مگر تھوڑی دیر کے لیے۔)

معلوم ہوا کہ اپنے سامان عیش پر ناز اور اس کی بنا پر خدا فراموشی وغفلت ایسی چیزیں ہیں، جن کی بنا پر ہلاکت وتباہی، ہلاکت وبربادی کے فیصلے ہوتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ﴾

(4:151)

(ہم ابھی کافروں کے دلوں میں رعب اور ہیبت ڈال دیتے ہیں، اس سبب سے کہ انھوں نے اللہ کا شریک ایسی چیز کو قرار دیا ہے، جس پر کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں کی اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ ظالموں کا برا ٹھکانہ ہے۔)

امت کی پریشانیوں اور مصائب کی وجوہات پر ایک حدیث سے بہ خوبی روشنی پڑتی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ: پانچ باتیں ہیں، جب تم ان میں مبتلا ہو جاؤ (تو یہ عذابات پیش آئیں گے) اور میں اللہ کی اس بات سے پناہ چاہتا ہوں کہ تم ان کو پاؤ، جب کسی قوم میں بے حیائی علی الاعلان ہونے لگے، تو ان میں طاعون اور ایسی ایسی بیماریاں پھیل جائیں گی، جو ان کے اسلاف میں نہیں تھیں اور جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرے گی، تو اس کو قحط سالی وتنگی اور بادشاہ کے ظلم میں گرفتار کیا جائے گا اور جب کوئی قوم زکاۃ کو روکے گی، تو اس سے بارش روک دی جائے گی اور اگر جانور نہ ہوتے، تو اس پر کبھی بارش نہ ہوتی اور جب اللہ ورسول کے عہد کو توڑے گی، تو اس پر غیر قوم میں سے کوئی دشمن مسلط کیا جائے گا، جو اس سے ان کے مال چھین لے گا، اور جب ان کے ائمہ اللہ کی کتاب سے فیصلہ نہیں کریں گے اور اللہ کے نازل کردہ احکام میں اپنی مرضی کے مطابق لے لیں گے، تو اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں لڑائی ڈال

دیں گے۔

(ابن ماجہ:۴۰۰۹)

غرض یہ ذلت وپستی، انحطاط وکمزوری، ہلاکت وتباہی اس وقت آتی ہے جب کہ انسان اللہ کے احکام اور نبی کی سنت وسیرت سے گریز، انبیائے کرام سے ساتھ بدسلوکی اور ان کی توہین، دنیوی ساز وسامان اور عیش وعشرت پر ناز وفخر اور آخرت سے غفلت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اب تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آج امت مسلمہ پر ادبار وانحطاط کے مہیب سائے، ذلت ونکبت کی پھٹکار، خدائی عقاب وعتاب کی سنگ باریاں، پریشانیوں اور مصائب کے طوفان، صرف اسی وجہ سے ہیں کہ ہم میں دین سے دوری، عمل میں سستی، تعلق مع اللہ میں غفلت، گناہوں میں انہماک، خدا سے بغاوت، رسول کے طریقے سے کدورت، غیروں سے مشابہت ومناسبت وغیرہ افعال شنیعہ صادر ہو رہے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے، جس کی جانب علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے:

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہوکر

لہٰذا آج امت کو اپنے اوپر آئے ہوئے ان حالات کو بدلنا ہو اور ادبار سے نکل کر اقبال کی طرف، ذلت سے نکل کر عزت کی جانب، پستی سے نکل کر رفعت کی جانب آنا ہو، تو ایک ہی سبیل ہے کہ وہ پھر ایمان باللہ وتوکل واعتماد علی اللہ تقوی وپرہیزگاری، خوف خشیت، تعلق مع اللہ اور اتباع سنت وسیرت، اعمال صالحہ واخلاق فاضلہ سے اپنے کو آراستہ کرے، پچھلی زندگی پر ندامت وپشیمانی کے ساتھ اللہ کے حضور توبہ استغفار کرے اور ظاہری وباطنی معصیت وگناہوں سے باز آئے اور دور رہے۔

اسلام دشمنی سے انسانیت سوزی تک

یہود ونصاریٰ کے خبثِ باطن نے اسلام دشمنی کا جو سلسلہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ورود مسعود اور دور نزول قرآن سے شروع کیا تھا، وہ ابھی تک ختم نہیں ہوا؛ بل کہ اس میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور اس کے لیے نئے نئے انداز وہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں اور اپنے اس بغض وعداوت کا وقتاً فوقتاً برملا اظہار بھی کیا جا رہا ہے، جس کے بارے میں قرآن نے واضح کیا تھا:

﴿لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالاً، وَدُّوْا مَا عَنِتُّم ، قَدْ بَدَتِ الْبُغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ، وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ.﴾

(یہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، یہ تمہاری تکلیف وپریشانی چاہتے ہیں، ان کی زبانوں سے بغض ظاہر ہو پڑتا ہے اور جو ان کے دلوں میں بغض پوشیدہ ہے، وہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔)

ظلم وعدوان، ضرب وحرب، قتل وغارت گری، فساد فی الارض، وغیرہ کی بے شمار شکلیں وصورتیں ہیں، جن کو ملت اسلامیہ واسلامی ملکوں کے خلاف آزمایا گیا اور آزمایا جاتا رہتا ہے اور ہر تیشے وحربے کو کام میں لاکر اس ازلی بغض وعناد واسلام دشمنی کے جذبات کی تسکین کا سامان کیا جاتا ہے۔

اور اب چند برسوں سے اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر اسلام دشمنی پر مشتمل ''فلموں'' اور ''کارٹونوں'' سے کام لیا جا رہا ہے اور ایک جانب اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت'' کو مجروح وداغدار بنانے کی انتہائی ناپاک

سازش کی جارہی ہے۔اورآئے دن کہیں نہ کہیں یہ تہذیب وانسانیت کے دعوے داراس قسم کے ''انسانیت سوز'' جرائم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور عجیب؛ بل کہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس ساری کارروائی کو وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ '' آزادیٔ رائے'' کا نام دیتے ہیں۔ ابھی بدنام زمانہ فلم کا جو واقعہ پیش آیا، یہ اس کی تازہ ترین مثال ہے،جس پر عالم اسلام میں احتجاج ہوااور ناحق کئی جانوں کا ضیاع ہوا۔

سوال یہ ہے کہ کیا پاکیزہ شخصیات پر بہتان طرازی،ان کے ساتھ گستاخی و بداخلاقی اوران کی توہین وتذلیل تہذیب وانسانیت کا ہم معنی ہے،اور کیا '' آزادی رائے'' کا یہی مطلب ہے کہ کسی کی توہین وتذلیل کی جائے،کسی کو داغدار بنانے کی ناپاک کوشش کی جائے اورحقائق سے قطع نظر جو جی میں بک دیا جائے،خواہ اس کے پیچھے بغض وحسد کارفرما ہو یا دشمنی وعناد کی یہ کرم فرمائی ہو، یا جھوٹ ودغابازی نے اس کو جنم دیا ہو یا مکاری وعیاری وچالبازی نے اس کا خاکہ تیار کیا ہو؟

اگرآزادیٔ رائے یہی ہے،تو پھر نہ کوئی مقدس شخصیت کا تقدس باقی رہ سکتا ہے، نہ کوئی انسانی اقدار ہی اس آزادیٔ رائے کی دست برد سے بچ سکتے ہیں؛ کیوں کہ اس دنیا میں ہر ایک کا دشمن موجود ہے،خواہ وحضرت مسیح جیسی معصوم شخصیت ہو، یا حضرت موسی علیہ السلام جیسی بے داغ ذات ہو یا حضرت محمد ﷺ جیسی تقدس مآب ہستی ہو۔کیا ان ساری عظیم و مقدس ذوات کے دشمنوں کو آزادیٔ رائے کا حق دیتے ہوئے ان ذوات مقدسہ پر کیچڑ اچھالنے اوران کو بدنام کرنے،ان کی توہین وتذلیل کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ اگرنہیں ---اور واقعی ہونا بھی نہیں چاہیے---تو پھرآزادیٔ رائے کے جو حدودِاربعہ حضرت مسیح علیہ السلام وحضرت موسی علیہ السلام ودیگر مذاہب کی مقدس شخصیات کے لیے مقرر ومسلم ہیں ،کیا وہی پیغمبر اسلام کے لیے نہیں ہیں؟

یہ دو پیمانے ان انسانیت نوازی کے دعوے داروں کی متعصب وشرانگیز طبائع اور شرافت انسانی سے دور فطرتوں کی جانب غمازی کررہے ہیں، جو ہرایک انصاف پسند وسیکولر

قلب وذہن کے لیے دکھ ورنج وملال کا باعث ہے۔اوراس سے یہ بات بھی صاف طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ان کی یہ حرکات اسلام دشمنی سے چلیں اور انسانیت سوزی تک پہنچ گئیں ۔گویا اسلام دشمنی کے جذبات سے اس قدر مغلوب الحواس؛ بل کہ مخبوط الحواس ہوئے کہ انسانی اقدار واخلاقی قدروں کا بھی کوئی پاس ولحاظ نہ رہا۔

ایک جانب تو ان کا یہ حال ہے اور دوسری جانب یہ لوگ اپنی زبانوں سے اخلاق و انسانی اقدار کے نعرے بھی بلند کرتے رہتے ہیں اور ان کی جانب سے انسانی حقوق کی پاسداری پر چیخ چیخ کر لکچرس وبیانات بھی دئے جاتے ہیں اور ساری دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے، کہ اگر تہذیب وتمدن، اخلاق وکردار، انسانیت کا پاس ولحاظ کسی قوم میں پایا جاتا ہے،تو وہ صرف اور صرف ان ہی میں پایا جاتا ہے۔اوراس کے برخلاف مسلمان کو دہشت گرد، خوں خوار، غیظ وغضب سے مغلوب، حواس باختہ باور کرنے کی بھی منظّم سازش رچائی جاتی ہے۔

حالاں کہ پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی شاید کسی سچے مسلمان کا کوئی نہ دکھا سکے گا ،جس نے کسی بانیٔ مذہب یا کسی مقدس شخصیت کی توہین وتذلیل کا ارتکاب کیا ہو؛ کیوں کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو یہ سبق دیتا ہے کہ کسی بھی مقدس شخصیت کی توہین وتذلیل جائز نہیں ، یہاں تک کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق بتوں کی توہین اوران کو گالی دینا بھی جائز نہیں، جب کہ اسلام کے نزدیک بتوں کی کوئی حیثیت نہیں ؛ بل کہ اسلام دراصل بتوں کو مٹانے اور شرک وکفر کے خلاف لگانے اوران کا قلع قمع کرنے ہی کے لیے آیا ہے،اس کے باوجود یہ تعلیم دیتا ہے کہ بتوں کو گالی نہ دی جائے۔

قرآن کا حکم ہے:

﴿وَلَاتَسُبُّواالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ﴾

اور تم لوگ ان معبودوں کو برا بھلا نہ کہو، جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، کہیں وہ لوگ اللہ کو بے ادبی سے برا کہہ بیٹھیں بغیر علم کے)

اس آیت کی تفسیر میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے ”شیخ الہند کے ترجمے“ پر فوائد میں لکھا ہے کہ: کسی مذہب کے اصول وفروع کی معقول طریقے پر غلطیاں ظاہر کرنا یا اس کی کمزوری اور رکاکت پر تحقیقی والزامی طریقوں سے متنبہ کرنا جداگانہ چیز ہے؛ لیکن کسی قوم کے پیشواؤں یا معبودوں کی نسبت بہ غرضِ تحقیر وتوہین دلخراش الفاظ نکالنا قرآن نے کسی وقت بھی جائز نہیں رکھا۔ (تفسیر عثمانی)

مفسر قرآن علامہ ادریس کاندھلوی لکھتے ہیں:

”جاننا چاہیے کہ سب وشتم اور دشنام دہی یعنی گالیاں دینا اور چیز ہے اور معبودان باطلہ کے معایب ونقائص اوران کے عجز ودرماندگی کو اس لیے بیان کرنا کہ یہ بے حقیقت اور حقیر چیزیں ہیں، قابل الوہیت ولائق عبادت نہیں، یہ اور چیز ہے۔ مناظرہ ومباحثہ میں تحقیق حقیقت کے لیے کسی شئ کے اوصاف اور نقائص بیان کرنا اور چیز ہے اور گالیاں دینا اور چیز ہے۔ قرآن کریم نے مشرکوں کے معبودوں کو برا کہنے سے منع کیا، جس سے مسلمانوں کو حسن اخلاق کی تعلیم دینا ہے۔“

(معارف القرآن ادریسی: ۲/۷۱۵)

یہ ہے اسلام کی تعلیم، جس میں معبودان باطلہ تک کو برا بھلا کہنے اور گالیاں دینے سے منع کیا گیا ہے، پھر کیا خیال ہے ان ذوات وشخصیات کے بارے میں، جن کا تقدس اسلام میں مقرر ومتعین ومسلم ہے، جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام، کیا ان کی توہین وتذلیل یا ان کو گالیاں دینے کا کوئی جواز ہوسکتا ہے؟ توہین وتذلیل تو ایک جانب، اسلام تو یہاں تک کہتا ہے کہ حضرات انبیا علَیہِم الصّلاۃُ والسَّلامُ میں بھی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے میں وہ طرز وانداز بھی روا نہیں، جس سے کسی کی توہین لازم آجائے۔

اسی لیے حدیث میں ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

«لاَ يَنبَغِي لِعَبدٍ أنْ يَّقُولَ: أَنَا خَيرٌ مِنْ يُونُس بِنْ مَتّٰى.»

(بخاری:۳۳۹۵، مسلم:۶۳۰۹)

(بندے کے لیے مناسب نہیں کہ وہ یوں کہے کہ میں یونس بن متی سے افضل ہوں۔)

یہاں بندے سے مراد بہت سے علماء کے نزدیک خود آپ ﷺ کی ذات ہے؛ یعنی آپ کو یہ کہنا پسند نہیں تھا کہ میں یونس بن متی سے افضل ہوں۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار ایک یہودی اور ایک مسلمان میں بات چل گئی اور مسلمان قسم کھاتے ہوئے کہا ''وَالَّذِي اصْطَفٰى مُحَمَّداً عَلَى العَالَمِيْن'' (یعنی اس ذات کی قسم، جس نے محمد ﷺ کو سارے عالموں پر فضیلت دی) تو یہودی نے کہا کہ: ''وَالَّذِي اصْطَفٰى مُوسٰى عَلَى العَالَمِيْن'' (یعنی اس ذات کی قسم، جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام عالموں پر فضیلت دی) اس پر مسلمان نے یہودی کو ایک تھپڑ رسید کر دیا، یہودی اس واقعے کو لیکر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا اور شکایت کرنے لگا کہ مسلمان نے مجھے تھپڑ مارا ہے، آپ نے مسلمان کو بلایا اور وجہ پوچھی، جب معلوم کہ یہ واقعہ ہے، تو آپ نے فرمایا:

«لاَ تُخَيِّرُونِي مِنْ بَيْنِ الْأَنْبِيَاء» (انبیا کے درمیان مجھ کو فضیلت نہ دو)

اور ایک روایت میں ہے کہ فرمایا:

« لاَ تُخَيِّرُونِي عَلَى مُوسٰى، فَإِنَّ النَّاسَ يَصْعَقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَأَكُونَ أَوَّلَ مَنْ يُّفِيقُ، فَإِذَا مُوسٰى بَاطِشٌ بِجَانِبِ الْعَرْشِ، فَلاَ أَدْرِي أَكَانَ فِيمَنْ صَعِقَ، فَأَفَاقَ قَبْلِي أَوْكَانَ مِمَّنْ اسْتَثْنَى اللّٰه.»

(بخاری:۳۴۰۸، ۶۵۱۷، مسلم:۶۳۰۲، ابوداود:۴۶۷۳، احمد:۷۵۷۶)

(حضرت موسی پر مجھ کو فضیلت نہ دو؛ کیوں کہ لوگ قیامت میں بے ہوش ہو جائیں گے، پس میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا، تو میں دیکھوں گا کہ حضرت موسی عرش کا پایہ پکڑے ہوئے ہیں، میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے تھے یا وہ ان لوگوں میں سے ہوں گے، جن کو اللہ نے بے ہوشی سے مستثنیٰ کیا ہے۔)

یہ ہے وہ اسلام اور اس کی اخلاقی تعلیم اور اہل اسلام کے لیے اس کی ہدایت، جس کے نتیجے میں اہل اسلام میں سے گیا گزرا انسان بھی تمام مقدس شخصیات کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور دوسرے مذاہب کی اہم شخصیات کی توہین و تذلیل کو ایک غیر انسانی و غیر اخلاقی حرکت و انسانیت سوز گناہ قرار دیتا ہے۔

الغرض اسلام کی سچی و پاکیزہ تعلیمات و ہدایات کو اور اہل اسلام کی دیگر مذاہب کی اہم شخصیات کے بارے میں احترام و ادب کا انداز ایک جانب رکھئے اور دوسری جانب یہود و نصاریٰ کے طرز عمل، ان کی بد اخلاقی و انسانیت سوز حرکات کو ایک جانب رکھئے، تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

اور ان کی ان انسانیت سوز حرکات سے اہل اسلام کو غیض و غضب ایک فطری بات ہے؛ تاہم ایسے مواقع پر اہل اسلام کی خدمات میں ایک بات ضرور پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ ہمارا ان کی حرکات کے خلاف احتجاج اور اپنے دکھ و رنج کے اظہار میں کوئی ایسی صورت اختیار نہ کی جائے، جس سے ان لوگوں کو اسلام و مسلمانوں کو بدنام کرنے کے مواقع فراہم ہو جائیں؛ کیوں کہ ان لوگوں کا ایک مقصد اس قسم کی حرکات سے یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سے مسلمانوں میں غیض و غضب پیدا ہو اور وہ مشتعل ہوں اور اسی کو ان کے تشدد و دہشت گردی کی دلیل بنا کر ان کے خلاف محاذ تیار کیا جائے۔

عشق نبوی ﷺ کا تقاضہ

ماہ ربیع الاول وہ مقدس مہینہ ہے، جس میں محسن انسانیت، رونق قصر نبوت، فخر موجودات، باعث وجود کائنات، خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمد ﷺ کی تشریف آوری سے سارا جہاں جگمگا اٹھا اور یہاں کی تاریکیوں وظلمتوں کو زوال ہوا، کفر وشرک کی حکومتیں سرنگوں ہوئیں، ظلم وسرکشی کی قوتوں کو نیچا دیکھنا پڑا، باطل طاقتیں پسپا ہوئیں، عدل وانصاف کا بول بالا ہوا، انسانیت کو عروج وفروغ نصیب ہوا، اسلام وایمان کی حکومت قائم ہوئی، مظلوموں اور بے کسوں کو سہارا ملا اور یہ تاریک دنیا پھر سے جاگ وجگمگا اٹھی۔

یہ سب آپ کا ہی طفیل تھا، آپ ہی کی کرم فرمائی تھی، آپ کے حسن وجمال کا کرشمہ تھا، آپ کی نوازشوں کا نتیجہ تھا، آپ ہی کی روحانیت کا اثر تھا کہ دنیا میں ایک حیرت انگیز وخوشگوار انقلاب رونما ہوا۔ آپ آئے، تو ایک نسخہ کیمیا ساتھ لائے، جس میں انسانوں کی ہدایت کا بھرپور سامان ہے، آپ وہ عمل وطریقہ لے کر آئے، جس میں ہر قوم وملت اور ہر ہر فرد کی بیماری کا تیر بہ ہدف علاج ہے، آپ کے اخلاق وکردار میں وہ کشش ہے کہ دشمن بھی دوست ہو جائیں، الغرض آپ کی آمد ساری انسانیت کے لیے رہبری وہدایت اور ساری مخلوقات کے لیے عین رحمت ہے۔

لہٰذا ہمارے اوپر لازم ہو جاتا ہے کہ آپ سے محبت کریں، آپ سے عظمت وجلالت کا معاملہ کریں اور آپ کی لائی ہوئی ہدایات پر عمل کریں اور اس کو غیروں تک پہنچائیں۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے؛ مگر یہاں ایک نہایت ہی اہم بات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اس بات میں، تو کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ورسول اللہ کی عظمت و

محبت ہر مسلمان کی جان وایمان ہے اور دنیوی واخری سعادتوں کا سب سے بڑا اور اولین زینہ اور اسی لیے ان پر یہ فرض بھی ہے اس کے بغیر ایمان کا تصور نہیں ہوسکتا ہے؛ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے لیے ہر معاملے میں راہ عمل وہی ہے جو اللہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن وحدیث میں متعین فرمادیا ہے اور پھر اس کی روشنی حضرات علما اور ائمہ دین نے واضح کیا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور راہ صلاح وفلاح کی ہے، نہ ہوسکتی ہے، اسی طرح اللہ تعالی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت کے سلسلے میں بھی ہمیں وہی راہ اختیار کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے متعین فرمائی ہے، اس بارے میں بھی کوئی من گھڑت طریقہ یا کسی اور قوم کا طریقہ اختیار کرنا روا نہیں ہوسکتا۔

اور یہ بات قرآن وحدیث سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اللہ ورسول سے محبت کا طریقہ یہی ہے کہ دین وشریعت کی تعلیمات کو دل وجان سے قبول کیا جائے اوران عمل کیا جائے پھر ان کو دنیا میں عام ورائج کرنے کے لیے محنت ومجاہدہ کیا جائے ان کی دعوت وتبلیغ کی جائے اور لوگوں کو اس کی ترغیب دی جائے۔

کتب احادیث میں یہ روایت آئی ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ میرے نزدیک میری ذات سے اور میری اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں اور میں جب گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کی یاد آجاتی ہے تو میں اس وقت تک صبر نہیں کرسکتا جب تک آپ کی خدمت میں آکر آپ کو دیکھ نہ لوں اور میں جب آپ کی وفات اور میرے مرنے کا تصور کرتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ جنت میں نبیوں کے ساتھ بلند مقام پر پہنچادیے جائیں گے اور میں جنت میں جا کر بھی اندیشہ کرتا ہوں کہ آپ کی زیادرت نہ کرپاؤں گا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ج وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ﴾

(اور جو اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ رہیں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ رہیں گے اور یہ لوگ بڑے اچھے رفیق ہیں۔)

بعض روایات میں ہے کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت رکھتے تھے اور آپ کو دیکھے بغیر ان کو صبر نہیں آتا تھا، یہاں تک اپنی موت کے بعد اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ ہونے کے اندیشے سے ان کا جسم نحیف اور رنگ متغیر ہو گیا تھا، انھوں نے اس اندیشے کا ذکر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(روح المعانی: ۵/۷۵)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک انصاری صحابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے آپ کی ذات خود مجھ سے میری اولاد سے، میرے گھر والوں اور میرے مال و دولت سے زیادہ محبوب ہے، اگر میں آپ کے پاس آ کر آپ کی زیارت نہ کرلوں، تو مجھے گمان ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا۔ یہ عرض کر کے وہ صحابی رونے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ کیوں روتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کی وفات اور میرے مرنے کا خیال کیا، پھر آپ کے جنت میں انبیا کے ساتھ بلند مقامات پر جانے کا تصور کیا، تو رونا آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی سے فرمایا کہ لو خوش خبری سن لو۔

(الدر المنثور: ۴/۵۲۹)

ایک حدیث میں ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہما نے آپس میں کہا کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں ہم دیکھتے ہیں؛ لیکن آخرت میں آپ کے درجات بلند ہوں گے، تو ہم آپ کو نہ دیکھ سکیں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(تفسیر طبری: ۸/۵۳۴)

اسی طرح اور بھی متعدد صحابہ کرام سے اسی قسم کی بات مروی ہے اور ان روایات کو علمائے تفسیر نے اپنی تفاسیر میں درج کیا ہے۔

ان روایات میں غور کیجیے، تو ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر انتہاء درجے کی محبت رکھتے تھے، حتی کہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ جنت میں آپ کے بلند ترین درجات کی وجہ سے شاید ہم آپ کی زیارت سے محروم رہ جائیں گے، اس اندیشے کی وجہ سے وہ بے قرار و بے چین ہو جاتے تھے، دوسری بات یہ کہ ان حضرات صحابہ نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں اپنی بے تابی و بے قراری کا تذکرہ کیا تو، ان کو جو جواب عطا ہوا، اس میں یہ بتایا گیا کہ جو اللہ و رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس کو آپ کی صحبت و معیت جنت میں بھی عطا ہوگی۔ اس سے اس قدر بات واضح ہوگئی کہ محبت کے اظہار کا اصل راستہ و طریقہ یہ ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کی جائے اور تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو اطاعت کا راستہ اختیار کرتا ہے، اس کو آخرت میں انبیا و اولیاء اللہ کی صحبت و معیت و زیارت کا شرف حاصل ہوتا رہے گا۔

لہذا ہمیں بھی محبت الٰہی و عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں یہی کام کرنا چاہیے کہ تمام امور میں اللہ و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور اس کے علاوہ کسی اور چیز سے محبت کا اظہار اسلامی طریقہ نہیں ہے۔

مگر آج امت کا ایک طبقہ اس بات کو فراموش کر چکا ہے اور وہ آپ کی محبت کے نام پر وہ وہ کام کرتا ہے، تو خود آپ کی شریعت کے خلاف ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ عید میلاد کے نام سے اور محبت رسول و عشق رسول کے نام سے قوالی گاتے بجاتے اور ناچتے نظر آتے ہیں، نیز

پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔تصاویر، وغیرہ لیتے ہیں، جب کہ یہ سارے کام آپ کی منشاء وسنت وشریعت کے خلاف ہیں۔

میں اہل اسلام کودعوت غوروفکر دیتاہوں کہ خدارا سنجیدگی کے ساتھ سوچیں اورغور کریں کہ اللہ ورسول اللہ کی محبت وعظمت کا تقاضا کیا ہے؟اور آپ کی یادمنانے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟افسوس کہ ہم نے اللہ ورسول کی محبت کوکس قدر سستا سمجھ لیا ہے کہ اللہ ورسول سے محبت کا اظہار کے لیے ہماری تمام تر کوششیں وکاوشیں صرف چند ظاہری رسموں اور کھوکھلے مظاہروں تک محدود ہوگئی ہیں،جن میں روح نامی کوئی چیز نہیں،بل کہ اس سے بڑھ کر کھیلوں اور تماشوں اورخلاف شرع باتوں تک کودین وشریعت اوراللہ ورسول سے محبت کا نام دے کرہم نے دین سے کھلواڑ کرنا شروع کردیا ہےاورہم خودکواس دھوکے میں رکھے ہوئے ہیں کہ ہم نے اللہ ورسول سے محبت وعشق کا حق ادا کردیا ہے۔

کیا ہم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ ان کھیل تماشوں اور خلاف شرع کاموں سے کیا اللہ ورسول کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے؟ کیا اللہ ورسول کے احکامات ہمارے لیے یہی ہیں؟ کیا ہم نمازوں کی پابندی کرتے ہیں؟ کیا دین وشرع کالحاظ کرتے ہیں؟ حلال وحرام کی تمیز میں ہمارا کیا حال ہے؟سنتوں کی پابندی کہاں تک کرتے ہیں ؟ ہماری معاشرت، ہمارے اخلاق ، ہمارے معاملات کہاں تک قرآن وسنت کے دائرے میں ہوتے ہیں؟

لہذا ہمیں حقیقت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور سیرت نبوی سے اپنی زندگیوں کومعمور ومنور کرنا چاہیےاوران تمام باتوں سے دور ونفور ہونا چاہیے، جواللہ ورسول کو ناپسند ہیں اورجن کوشریعت نے حرام وممنوع قرار دیا ہے۔اوراپنے عمل وکردار سے بھی اوراپنی زبان سے بھی سیرت وشریعت کے پیغام کو عام کرنا چاہیے۔آپ ﷺ سے محبت کا حقیقی وواقعی تقاضا یہی ہے۔

اصلاحِ معاشرے کی تحریکات ناکام کیوں؟

یہ حقیقت نا قابل فراموش ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کی تحریکات بڑا اہم حصہ ہوتی ہیں، امت میں جاری وساری مختلف قسم کی تعلیمی ودعوتی اوراصلاحی وتجدیدی سرگرمیوں کا اوران سرگرمیوں کے بغیرکوئی معاشرہ اپنے تخصصات وتشخصات کے ساتھ باقی رہے، یہ بات تقریبا ناممکن التصور ہے۔اس لیے امت میں جہاں دعوتی وتعلیمی واصلاحی سرگرمیاں کا وجودناگزیر ہے، وہیں پر وقتا فوقتا اصلاح معاشرے کی تحریکات کا سلسلہ بھی لازمی ولابدی ہے؛ تاکہ امت مسلمہ اپنے تشخصات وتخصصات کے ساتھ زندہ وباقی رہے۔

اور یہ بھی دیکھنے کوملتا ہے کہ وقفے وقفے سے بعض نیک طینت وصالح عناصراس تحریک کو لے کراٹھتے ہیں؛ تاکہ امت میں درآنے والے فتنے، جواسلامی عقائدودینی اعمال اور شرعی اخلاق کواپنی لپیٹ میں لے کررسومات ورواجات، بدعات وخرافات کے دلدل میں اس کو پھنساتے جاتے ہیں،اس کا سدباب ہواورامت اس شاہراہ پرقائم ہوجائے جواس کو اللہ کے نبی پیغمبرآخرالزمان حضرت محمد ﷺ نے بتائی وسمجھائی ہے۔

مگر حیرت ناک طریقے پر یہ بات بھی محسوس کی جاتی ہے کہ عموماً یہ تحریکات بہت جلد ناکامی کا شکارہوجاتی ہیں اورپھرلوگ اس کواس قدرجلد طاق نسیان پر رکھ دیتے ہیں کہ حیرت بالائے حیرت کے سواکوئی تاویل وتوجیہ ممکن نظرنہیں آتی۔

آخراس قدراہم کام وضروری امرمیں یہ ناکامی کیوں؟احقر نے جہاں تک اس سوال پرغورکیا،تواس کی چندوجوہات سمجھ میں آئیں، جو یہاں پیش کرتا ہوں:

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کے داعی ومحرک لوگ خوداپنی

دعوت پر مطلوب یقین نہیں رکھتے؛ یعنی ان کی دعوت تو یہ ہے کہ امت کی صلاح و فلاح و کامیابی کا راز اس طریقے میں ہے، جو شریعت نے اس کو دیا ہے؛ مگر خود ان کو اس پر اس قوت کے ساتھ یقین نہیں ہوتا جیسا کہ ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ داعی کو اگر خود اپنی دعوت پر یقین نہ ہو، وہ دعوت کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔

اسی لیے ہمیشہ دین کے کامیاب داعی و قائد وہ لوگ ہوئے، جن کو اس دعوت ربانی پر پورا پورا یقین تھا اور وہ جب اس کو لے کر اٹھے، تو چہار دانگ عالم میں ان کی آواز پھیل گئی۔

(۲) ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ دعوت پر یقین کے باوجود خود داعی و محرک لوگ اس پر عامل نہیں ہوتے اور مختلف قسم کے اعذار پیش کر کے اس سے خود دست بردار ہوتے جاتے ہیں۔ یہ بحث کہ غیر عامل کو دعوت دینے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ یہ اعذار کس حیثیت کے ہیں اور شرعی ہیں یا غیر شرعی؟ قابل لحاظ ہیں یا نہیں؟ ان تمام بحثوں سے صرف نظر کرتے ہوئے غور اس پر کیجیے کہ جب خود داعی اپنی دعوت پر عمل نہیں کرے گا، تو دوسروں پر اس کا کیا اثر چھوڑے گا؟

شہر بنگلور میں چند سال قبل اصلاح معاشرہ کی تحریک بڑے زور وشور سے اٹھائی گئی اور ایسا لگ رہا تھا کہ بہ مصداق: ''تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے'' ہم اسلاف کے زمانے کی جانب لوٹ رہے ہیں اور اس کی برکات کا مشاہدہ کریں گے؛ مگر دیکھتے ہی دکھتے یہ تحریک سرد خانے میں جا پڑی۔ اس کی من جملہ وجوہات کے ایک اہم وجہ یہی تھی کہ داعی لوگ خود اس تحریک کے اصول پر کاربند نہیں تھے۔

اس تحریک نے جو ابتدائی طور پر چھ نکاتی اصلاحی خاکہ تیار کیا اور ان نکات میں سے ایک یہ تھا کہ نکاح خوانی کی مجالس مساجد ہی میں منعقد کی جائیں، مساجد سے باہر شادی محل وغیرہ میں نہ کی جائیں اور ایک بات یہ طے کی تھی کہ تصاویر کا لینا حرام ہے؛ لہذا اس سے اجتناب کیا جائے۔

اس میں کیا شک ہے کہ یہ نکات اہم تھے اور اس پر عمل درآمد کیا جاتا، تو وہ دن دور نہیں

تھے، جس کے خواب دیکھے جارہے تھے؛ مگر ہوا یہ کہ ان ہی دنوں اس تحریک کے داعی ایک مالدار کے یہاں شادی کی تقریب تھی اوراس شادی میں وہ سب کچھ ہوا، جو ہر شادی میں مالداروں کے یہاں ہوتا ہے۔اسی کے چند دنوں بعد اصلاح معاشرے کی ایک میٹنگ تھی، احقر بھی شریک تھا اور وہ صاحب بھی موجود تھے اور بات وہی اصلاح معاشرے کے کام کو آگے بڑھانے کی چل رہی تھی، احقر نے عرض کیا کہ جب خود داعی لوگوں کے قول وعمل سے اس تحریک کے خلاف امت کو عملی پیغام جائے گا، تو یہ تحریک کیسے چل پائے گی؟ اور کس طرح کامیاب ہوسکے گی؟

نیز تصاویر کی حرمت کا فتوی تو شائع کیا گیا تھا اور عوام کو اس سے اجتناب کی تلقین کی جا رہی تھی؛ مگر عین اسی اثناء میں آئے اخبارات میں علماء وعمائدین کی تصاویر عوام الناس کے سامنے آتی رہتی تھیں، جس پر عوام میں بجا طور پر یہ تبصرے ہوتے تھے کہ کیا شریعت کا حکم صرف ہمارے لیے ہیں، ان حضرات کے لیے نہیں؟

نیز مساجد میں نکاح خوانی کے متعلق ایک عالم تو مساجد کی شرط لگا رہے تھے اور دوسرے کے یہاں اس کی کوئی ضرورت یا اہمیت نہیں تھی اور وہ پہلے کے مدمقابل کی طرح شادی محل میں بھی آن بان کے ساتھ جا کر نکاح خوانی کر رہے ہیں۔

ہر ذی ہوش وذی عقل ودانش کے سامنے یہ بات بالکل واضح وظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ صرف یہی ہوسکتا تھا اور یہی ہوا کہ تحریک ٹوٹ گئی اور سارے اصول ونکات دھرے کے دھرے رہ گئے۔

(۳) اصلاحی تحریکات کے ٹوٹ جانے اور ناکام ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کچھ عناصر معاشرے میں ایسے ہوتے ہیں، جو اصلاح کی کوششوں کو نہیں چاہتے؛ کیوں کہ اس سے خود ان پر قدغن لگتی ہے، مثلاً اصلاح معاشرے میں اگر یہ قرار دیا جائے کہ جوڑا جہیز نہیں لیا جائے گا، تو بہت سے لوگوں کو یہ بات ہضم نہیں ہوتی، وہ چاہیں گے کہ یہ تحریک نہ چلے اور ان پر یہ پابندی معاشرتی طور پر نہ لگے؛ لہٰذا وہ اس کو ناکام بنانے کی کوشش یا صحیح لفظوں میں

سازش میں لگ جاتے ہیں، وہ اس کو ناکام بنانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے اور غلط پروپگنڈے سے کام لیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ عوام میں یہ تحریکات اپنا اعتماد کھو دیتی ہیں؛ لہٰذا محرکین و داعیوں کو سب سے پہلے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس قسم کی ذہنیت کے لوگ جو اپنا کوئی وقار یا کوئی مقام رکھتے اور عوام الناس پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ یا تو ہماری تحریک سے جڑے رہیں اور اس سے مطمئن ہو جائیں اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود ان کی ذوات پر دینی لحاظ سے محنت کی جائے، یا یہ کہ اس بات کی کوشش کی جائے کہ ان کی بات کا کوئی اثر تحریکات پر مرتب نہ ہو سکے۔

(۴) عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اس قسم کی تحریکات میں مالداروں کو سرپرست قرار دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے یا سمجھی جاسکتی ہے کہ مالداروں سے تحریک کو مالی منفعت ہوتی ہے اور کام کو آگے بڑھانے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مالداروں کی بھی ہر تحریک کو ضرورت ہے اور اللہ نے ان کو مال دے کر ان سے یہی چاہا بھی ہے کہ وہ اپنا مال دینی و اصلاحی، تعلیمی و دعوتی تحریکات و سرگرمیوں میں لگائیں؛ مگر یہاں ایک بات پر توجہ ضروری ہے وہ یہ کہ مالداروں میں سے جو حضرات تحریک سے عقیدتاً و عملاً متفق ہوں، وہ تو سرپرست ہو سکتے ہیں؛ تاہم دینی تحریکات کے لیے سرپرستی علما ہی کے شایان شان ہوتی ہے؛ مگر محض مالداری کو بنیاد بنا کر سرپرست قرار دینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ تحریک ٹوٹ جاتی ہے؛ کیوں کہ عقیدتاً یا عملاً اتفاق نہ ہونے سے یا تو پہلا سبب رونما ہوگا یا دوسرا سبب واقع ہوگا، جس کو بیان کیا جاچکا ہے۔

(۵) ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اصلاحی تحریکات جب بھی وجود میں آتی ہیں، تو اس کا عمل شروع ہوتا ہے شادی بیاہ کی رسومات و رواجات سے اور اسی کی اصلاح سب سے مقدم مانی جاتی ہے؛ مگر یہ ترتیبِ اصلاح نبوی طریقہ و ترتیب سے ہم آہنگ نظر نہیں آتی؛ کیوں کہ نبوی طرق و ترتیب یہ ہے کہ وہ اولا ایمان و عقیدے پر محنت کرتے ہیں، یقین بناتے ہیں، اللہ پر توکل و اعتماد کا درس دیتے ہیں، آخرت کا فکر پیدا کرتے ہیں، جب انسان اپنے ایمان و

عقیدے کی مضبوطی، یقین واعتماد کی پختگی، دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری پر پورا یقین اور فکر وطلب آخرت میں راستی کا حامل ہوجاتا، تو اس کو عمل واخلاق سے گزارتے تھے۔ محرمات سے بچنے کی تلقین کرتے تھے، رسومات ورواجات کی برائی اس کے دل میں بٹھاتے تھے۔

یہاں یہ ہوتا ہے کہ لوگ عقیدے میں کمزوری کا شکار ہیں اور دینا کے حسن و جمال پر فریفتہ ہیں، آخرت سے بے خبر ہیں، موت کو بھلا چکے ہیں، قبر وحشر کی منزلیں ان کے لیے ایک کہانی کا درجہ رکھتی ہیں، ایسی صورتِ حال میں ان کو یہ کہا جائے کہ رسم ورواج کو چھوڑو اوران برائیوں سے بچو، تو اس پر کاربند ہونا بڑا مشکل ہے۔

شراب کی حرمت سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جس طرح ایمان ویقین کی منزلوں سے گزارا گیا اور آخرت کی فکر سے جس طرح مزین کیا گیا، اس کا نتیجہ تھا کہ حرمت شراب کے نازل ہوتے ہی وہ اس طرح اس کو چھوڑنے پر آمادہ ہوگئے جیسے دن رات اسی کا ان کو سبق پڑھایا گیا ہو۔ حتی کہ جب حرمت شراب کا حکم لے کر منادی نے گلی گلی، کوچے کوچے اعلان سنانے لگایا، تو ایک گھر میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم میں شراب کا دور چل رہا تھا اوراس منادی کی آواز کو سنتے ہیں، وہ وہیں رک گئے جہاں تھے اور کسی کے کنہ تک شراب آچکی تھی، تو اس نے وہیں شراب کو روک لیا، کسی کے حلق میں جانے والی تھی، تو اس نے اس کو وہیں سے باہر نکال دیا۔ تاریخ سیرت کا یہ حیرت انگیز واقعہ اس بات کی واضح شہادت ہے کہ ان حضرات کا ایمان وعقیدہ اس طرح بنادیا گیا تھا کہ وہ اللہ ورسول کے ہر حکم پر مر مٹنے کو تیار تھے۔

لہٰذا اصلاح کی کوشش کرنے والے حضرات اگر اس اصول کو اپنائیں، تو تحریکات کامیابی سے ہمکنار ہوں گی۔ ورنہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے خون کی خرابی والے مریض کو جب پھوڑے نکلنے لگے، تو ڈاکٹر نے اوپر اوپر لگانے کے لیے مرہم کا انتخاب کیا اور اس کو لگانے سے اس جگہ کا پھوڑا تو مندمل ہوگیا؛ مگر خون کی خرابی نے دوسری جگہ سے پھوڑا نکال دیا۔ یہی حال ہوتا ہے اس تحریک کا جس میں ایمان وعقیدہ بنایا نہ جائے، دنیا کی بے ثباتی

ہے، آخرت کی پائیداری، اللہ پر یقین وتوکل، جنت کی طلب اور دوزخ کا خوف پیدا نہ کیا جائے اور صرف عمل واخلاق پر ابھارا جائے۔ اوپر کی مثال کی طرح یہاں بھی یہی ہوگا کہ تحریک کی وجہ سے ایک رواج، تو ختم ہوگا، ایک بدعت تو مندمل ہوگی؛ لیکن وہ خود کوئی اور رسم یا رواج یا بدعت پیدا کرلے گا۔

الغرض اصلاحی تحریکات کو کامیاب بنانے کی فکر کرنا چاہیے اور اس کی ناکامی کے اسباب پر غور کرنا چاہیے؛ تاکہ تحریکات کامیاب ہوسکیں۔

☆☆☆

جنت کا جعلی ٹکٹ

ابھی چند دنوں قبل کرنول سے بعض احباب ملاقات کے لیے تشریف لائے اور دوران گفتگو ایک ساتھی نے بتایا کہ وہ کسی کام سے ایک علاقے میں گئے، وہاں اچانک ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے ان سے تشکیل کرتے ہوئے کہا:

''کیا آپ جنت کا ٹکٹ خریدنا چاہتے ہیں؟''

ہمارے دوست نے حیرت سے پوچھا کہ ''جنت کا ٹکٹ؟ وہ کیا ہوتا ہے؟''

ان صاحب نے کہا کہ یہاں ہمارے گاؤں میں ایک مرشد آئے ہوئے ہیں، وہ جنت کا ٹکٹ دیتے ہیں، ایک ٹکٹ کی قیمت پینتیس ہزار روپے ہے۔

ہمارے دوست نے سوال کیا کہ اس کو لے کر کیا کرنا ہے اور یہ کیا کام آئے گا؟

انہوں نے کہا کہ یہ جنت کا ٹکٹ ہے، اس میں مرشد صاحب کی طرف سے گناہوں کی معافی کی سند ہوتی ہے اور اس کو لینے کے بعد اپنے پاس اس کو محفوظ رکھنا چاہیے اور جب موت کا وقت آئے، تو اس کو کفن میں رکھ دینے کی وصیت کرنا چاہیے، جب قبر میں فرشتے آئیں، تو ان کو یہ دکھا دیں، وہ جنت میں بھیج دیں گے۔

یہ ایک بہت چھوٹا سا واقعہ ہے، ان ہزاروں واقعات میں سے جو اس قسم کے مرشدوں اور پیر قسم کے لوگوں کی جانب سے امت کو گمراہ کرنے اور اپنے پیٹ کی دنیا کو آباد کرنے کے لیے پیش آتے رہتے ہیں۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس دور جدید اور علم و ترقی کے زمانے میں بھی اس قسم کے لوگ اپنا شکار امت کے بھولے بھالے لوگوں میں سے تلاش کر لیتے ہیں اور وہ بھی ان پیروں اور مرشدوں کی اندھی عقیدت و محبت میں ان کو خدائی مقام

تک پہنچا دیتے ہیں اور اس اندھی عقیدت میں دوسروں کو بھی شریک کار بنانے کی کوشش یا سازش کرتے ہے۔

حالاں کہ کسی کی مغفرت و بخشش کا حق سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہے۔قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر یہ اعلان واضح الفاظ میں موجود ہے:

﴿یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء﴾

(وہ جس کی چاہے مغفرت کرے اور جس کو چاہے عذاب دے۔)

دین کے مضامین میں تحریف کرنے والوں کی یہی روش ہوتی ہے اور دراصل اس قسم کی بات پوپ کے زمانے میں پوپ نے عیسائیت میں بطور بدعت جاری کی تھی، اور یہ اس کے بقایا ہیں، جو یہاں ملتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ دین اسلام سے اس قسم کے عقیدے کا کوئی دور دور تک کا واسطہ نہیں۔

تاریخ کی گواہی سنیے، وہ کہتی ہے کہ پاپائیت کے دور میں جہاں بہت ساری خرافات ودین سے کھلواڑ کی عجیب وغریب اور ناقابل فہم صورتیں وشکلیں پیدا کی گئی تھیں، وہیں (ایک صفحہ ترک ہوا) ''میں پوپ فلاں ہوں اور فلاں آدمی کے لیے اس کے اگلے پچھلے گناہوں کی مغفرت و بخشش عطا کرتا ہوں اور یہ شخص اس طرح بری و پاک ہوگیا جیسے آج ہی اس کی ماں نے اس کو جنا ہو اور یہ قیامت میں جنت میں داخل ہوگا اور اللہ کے نزدیک مبارک ہوگا''۔

شیخ محمد قطب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ: پوپ نے ان مغفرت ناموں کو مال کے عوض بیچنا شروع کیا، تو گناہوں اور جرائم کا ارتکاب کرتے تھے، پھر پوپ سے یہ مغفرت کی چک خریدتے تھے، اس خیال سے کہ وہ جنت میں داخل ہوجائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کو حقیقی مغفرت ان سے مل جائے گی۔

(رکائز الایمان:۱۵۳)

اور حضرت علامہ رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ نے ردعیسائیت پر اپنی لاجواب کتاب ''اظہار الحق'' میں اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ عیسائیوں کے فرقے کیتھولک میں

عقائد میں کس کس طرح کی بے عقلیاں وخرافات شامل ہو گئے تھے،لکھا ہے ان عقائد میں سے ایک یہ بھی تھا:

''پوپ اوراس کے متعلقین کے پاس زبردست خزانہ ہے، جوان کو پاک ہونے یعنی توبہ کرنے والوں کی جانب سے نذرانوں کی شکل میں ملتا ہے،ان نذرانوں کے عوض میں پوپ کی جانب سے ان کومغفرت وبخشش عطا کی جاتی ہے۔بالخصوص جب کہ وہ اس کی گراں قدر قیمت اور پورے پورے دام اصول کرلیں،جس کاان میں کافی رواج ہے''۔

(اظہارالحق:۲/۵۶)

نیزان عیسائیوں کا یہ بھی عقیدہ لکھا ہے:

''صدیقین کی روحیں جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہیں اورآگ میں لوٹ پوٹ ہوتی رہتی ہیں ،یہاں تک کہ پوپ اعظم ان کوبخشش عطا کرے،یاپادری لوگ اپنی دعاؤں کی طاقت سے اس کی پوری قیمت وصول کرنے کے بعدان کورہائی عطا کریں، یہ یعنی کیتھولک لوگ پوپ یا اس کے نائبین سے حصول نجات کے لیے سندیں حاصل کرتے ہیں۔''

(اظہارالحق:۲/۵۷)

پھرآگے چل کرآپ نے یہ کھولا ہے کہ یہ مغفرت نامے یا جنت کا ٹکٹ جو دیا جاتا تھا، اس کی عبارت کیا ہوتی تھی،آپ لکھتے ہیں:

''پوپ لیودہم نے مغفرت اوربخشش کے لیے دستاویزی ٹکٹ ایجاد کیے، جواس کی طرف یااس کے وکیل کی جانب سے اپنی گذشتہ اورآئندہ خطاؤں اورگناہوں کی مغفرت کےخریدارکودیے جاتے ہیں،جس میں حسب ذیل مضمون لکھا ہوتا ہے:

''ربنا یسوع المسیح یرحمک ویعفو عنک باستحقاقات

آلامه المقدسة. وبعد: فقدوهب لی بقدرة سلطان رسله بطرس وبولس و البابا الجلیل فی هذه النواحی أن أغفرلک اولاً عیوبک الاکلیروسیة، مهما کانت، ثم خطایاک ونقائصک مهما کانت تفوت الإحصاء بل أیضاً الخطایا المحفوظ حلها للبابا، وبقدر امتدادمفاتیح الکنیسةالرومانیة أغفر لک کل العذابات التی سوف تستحقهافی المطهروأردک إلی أسرار الکنیسة المقدسة وإلی اتحادهاوإلی ماکنت حاصلاعلیه عند عمادک من العفة والطهارة حتی أنک متی مت تغلق وجهک أبواب العذابات وتفتح لک أبواب الفردوس وان لم تمت الآن فهی باقیة لک بفاعلیة تامة إلی آخرساعة موتک باسم الأب والابن والروح القدس. آمین.“

(ہمارا پروردگار یسوع مسیح تجھ پر رحم کرے اور تجھ کو اپنی ان مقدس تکالیف سے حاصل ہونے والے استحقاق سے معاف کرے امابعد! مجھے سلطان الرسل پطرس وپولس اوراس علاقے کے بڑے پوپ کی جانب سے جو اختیارات دیے گئے ہیں، ان کی بنا پر میں سب سے پہلے تیرے گناہوں کو بخشتا ہوں خواہ کیسے بھی ہوں یا کتنے بھی ہوں، پھر تیری ان قصوروں ولغزشوں کو جن کا شمار نہیں ہوسکتا، ان کو معاف کرتا ہوں، بل کہ ان خطاؤں کو بھی معاف کرتا ہوں جن کا کھولنا صرف پوپ کے اختیار میں ہے، اور کلیسا کی کنجیاں جب تک رومی حکومت کے ہاتھ میں ہیں، ان گناہوں کو بھی معاف کرتا ہوں، جن کا تو جہنم میں مستحق ہونے والا ہے اور میں تجھ کو مقدس کلیسا کے اسرار، اس کے اتحاد وخلوص میں شریک کرتا ہوں اور بپتسمہ کے بعد جو طہارت

تجھے حاصل ہوگی ،اس سے تو جب مرے گا تو تجھ پر جہنم کے دروازے بند اور جنت الفردوس کے دروازے تجھ پر کھلے پائے گا اور اگر تجھے فی الحال موت نہ آئی تو یہ مغفرت کا پروانہ تیری موت کی ساعت تک اپنے پورے اثر کے ساتھ باقی رہے گا، باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام سے،آمین۔)

اور جناب سعد رستم نے اپنی کتاب''**الأناجيل الأربعة ورسائل بولس**''میں اس کو ذرا سے فرق کے ساتھ ایک عیسائی نوفل آفندی نوفل کی کتاب''**سوسنه فی اصول العقائدو الادیان**''کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

(الأناجيل الأربعة ورسائل بولس:١٠٩)

حضرت مولانا تقی عثمانی نے''اظہار الحق'' کی تحقیق میں لکھا ہے:

''پادری خورشید عالم لکھتے ہیں کہ مغفرت ناموں کی تجارت عام تھی، جس کے باعث انسان بشب صاحب کو گناہ کا بدل روپیہ دیکر سزا سے بری قرار دیا جاتا تھا۔''

(بائبل سے قرآن تک:٢/٣٨٠)

نیز لکھتے ہیں:

''مغفرت ناموں کی ایسی بہت سی تحریریں تاریخ میں ملتی ہیں، پوپ کو پیسے دے کر گناہ معاف کرانے کی یہ رسم سالہا سال سے بغیر کسی روک ٹوک کے جاری رہی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ: اس رسم کے لیے کیسے کیسے گھناؤنے کاموں کا لائینس دیا گیا تھا؟ تاریخ میں اس کے عجیب عجیب واقعات ملتے ہیں، کلیرک نے تاریخ کلیسا میں کڈ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ١٥١٧ء میں ایک پادری جان ٹیٹزل نے عام اعلان کر دیا تھا کہ اگر کسی عیسائی نے اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کی ہو اور وہ کچھ رقم پوپ کی مغفرت کے صندوق میں ڈال دے، پوپ کو دنیا و آخرت میں یہ اختیار ہے کہ وہ اس کے گناہ معاف کر دے

اوراگر پوپ نے گناہ معاف کردیا،تو خدا کوایسا ہی کرنا پڑے گا۔‘‘

(بائبل سے قرآن تک:۲/۳۸۳)

یہ سب پڑھیے اور دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ تحریف دین کے عادی لوگوں نے اپنے دین کو جس طرح مسخ و برباد کیا اور اصل حقیقت سے دور، کوسوں دور ہو گئے، کیا اس امت میں بھی ان مرشد و پیر قسم کے لوگ یہی کچھ کرنا چاہتے ہیں؟!!!

لیکن اللہ کا وعدہ ہے کہ دین اسلام کی حفاظت ہوتی رہے گی وہ قیامت تک محفوظ رہے گا؛اس لیے اس کو ڈر تو کوئی معنی نہیں رکھتا؛مگرافسوس اس کا ہے اورخوف بھی اسی کا ہے کہ امت جو اشخاص وافراد ان لوگوں کا شکار ہو جاتے ہیں ،وہ کس قدر دین کی حقیقت سے دور ہو جاتے اور کس قدر بدعقیدگیوں میں غافل ہو جاتے اور محرمات میں پڑ جاتے اور اس کے باوجود خود کے لیے جنت کو ریز رو سمجھتے ہیں؛ لہٰذا علماء کا اس جانب توجہ صرف کرنا اور امت کے ان بھٹکے ہوئے افراد و اشخاص کی صحیح رہبری کرنا؛ان کا ایک فریضہ ہے۔

امت کا بگاڑ اور علما کی ذمے داریاں

امت اسلامیہ جس کو اللہ تعالی کی طرف سے امت وسط اور امت خیر کے بلند القاب کے ساتھ ملقب کیا گیا تھا اور جس کو خیر و بھلائی کی دعوت، معروفات کی نشر و اشاعت اور منکرات کے ازالے و روک تھام کے لیے بھیجا گیا تھا اور جس کے حق میں یہ کہا گیا تھا:

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰه ﴾ (4:١١٠)

(تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی بھلائی کے لیے ظاہر کیا گیا، کہ تم معروف کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے رہو اور اللہ پر ایمان رکھو۔)

آج اس امت کا ایک بڑا طبقہ جہالت کی وادیوں میں بھٹکتا اور ضلالت کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا دکھائی دیتا ہے؛ چناں چہ جائزہ لیجیے، تو معلوم ہوگا کہ عقائد و ایمانیات کا باب ہو یا اعمال وعبادات کا، معاشرت کا باب ہو، یا معاملات کا، اخلاقیات کا باب ہو یا سیاسیات کا، ہر باب میں ہم اسلامی رہنمائی وہدایت، اس کی تعلیم وتلقین اور اس کے احکام وفرامین سے دور ہو چکے ہیں یا دور ہوتے جا رہے ہیں؛ بل کہ اب اس سے آگے یہ ہو رہا ہے کہ بہت سے لوگ کسی چیز میں یہودی فلسفے کو اپناتے ہیں، تو کسی میں نصاری کو قائد مانتے ہیں، کسی چیز میں امریکی نظریات کا سہارا لیتے ہیں، تو کسی میں ہندومت کا حوالہ لیتے ہیں۔

اس طرح موجودہ مسلم معاشرے کی بنیاد خالص اسلام کے بجائے ایسا لگتا ہے کہ مختلف افکار ونظریات، جدید رجحانات وخیالات اور جاہلانہ رسومات ورواجات کا ایک مرکب بن گئی ہے۔ اور امت کا جو پرانا طبقہ ہے وہ تو رسم ورواج، بدعات ولغویات کے چکر میں پڑا ہوا

ہے، جب کہ نئے ذہن کے لوگ جدت پسندی، نئے افکار ورجحانات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

اس صورتِ حال میں اصل ذمے داری حضرات علمائے کرام کی ہے کہ وہی امت کی اصلاح وہدایت میں حضرات انبیائے کرام علیہ السلام کے نائب ووارث ہیں اور اس نیابت نبوی کی وجہ سے ان کو یہ کام انجام دینا ہے۔

﴿ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّ نُوۡر‌ٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَ الرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ ﴾

(بلا شبہ ہم نے توارت نازل کی جس میں ہدایت ونور ہے، اس کے موافق حکم دیتے ہیں انبیا جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور علما و مشائخ؛ کیوں کہ ان کو اللہ کی کتاب کی حفاظت کا ذمہ دیا گیا تھا اور وہ اس پر نگران تھے۔)

امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"وقد أخذ الله على العلماء حفظَ كتابه على الوجهين : أحدهما : أن يحفظوه في صدورهم و يدرسوه بألسنتهم ، والثاني : أن لا يضيعوا أحكامه ولا يهملوا شرائعه."

(التفسیر الکبیر للرازی: ۱۲/ ۳۳۶)

(اللہ تعالی نے علما پر دو طریقے سے اپنی کتاب کی حفاظت کا عہد لیا تھا: ایک یہ کہ اس کی اپنے سینوں میں حفاظت کریں اور اپنی زبانوں سے اس کی تدریس وتعلیم کریں، دوسرے یہ کہ اس کے احکام کو ضائع نہ کریں اور اس کی شرائع کو مہمل نہ چھوڑیں۔)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے:

''یعنی یہ انبیا اور ان کے دونوں قسم کے نائبین علما و مشائخ تورات کے احکام جاری کرنے کے پابند اس لیے تھے کہ اللہ تعالی نے تورات کی حفاظت ان کے ذمے لگادی تھی اور انھوں نے اس کی حفاظت کا عہد و پیمان کیا تھا''۔

(معارف القرآن: ۳/۱۶۰)

اس میں وارثین انبیاء علماء ومشائخ کی ایک اہم ذمہ داری کا بیان ہے اور وہ ہے کتاب اللہ کی حفاظت اور اسی میں دین وشریعت کی حفاظت کا بیان آ گیا۔

﴿وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾

(اور آپ ان میں سے بہت سوں کو دیکھیں گے کہ گناہ اور ظلم اور حرام کھانے میں آگے بڑھتے ہیں، پس برا ہے وہ کام جو یہ کر رہے ہیں، کیوں نہیں ان کے علماء ومشائخ ان کو گناہ اور حرام کھانے سے منع کرتے؟ برا ہے جو یہ کرتے ہیں۔)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ما في القرآن أشدُّ توبيخاً من هذه الآية''

(پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہ کسی اور جگہ نہیں ہے۔)

اور امام تفسیر حضرت ضحاک رحمہ اللہ سے فرمایا:

''ما في القرآن أخوف عندي منها''

(میرے نزدیک یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے۔)

(تفسیر خازن:۲/۵۹،تفسیر کبیر:۱۲/۳۹۳)

امام رازی رحمہ اللہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: اللہ تعالی نے علمائے اہل کتاب سے اس بات کو بعید قرار دیا ہے کہ عوام الناس کو وہ معاصی سے نہ روکیں، اور یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ نہی عن المنکر کا تارک، خود مرتکب گناہ کے درجے میں ہوتا ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالی نے دونوں فریق (گناہ کے مرتکب و نہی عن المنکر کے تارک) کی مذمت ایک ہی لفظ (لَبِئْسَ) سے فرمائی ہے؛ بل کہ ہم کہتے ہیں کہ نہی عن المنکر کے تارک کی مذمت یہاں زیادہ قوت سے کی گئی ہے؛ کیوں کہ گناہ، ظلم اور حرام خوری پر اقدام کرنے والوں کے بارے میں یہ فرمایا کہ ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ اور نہی عن المنکر کے تارک علما کے بارے میں یوں فرمایا: ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ اور صنع فعل سے زیادہ قوی ہے؛ کیوں کہ عمل کو صناعت سے اس وقت تعبیر کرتے ہیں، جب وہ خوب اچھی طرح راسخ و پیوست و مستحکم ہو جائے؛ لہٰذا گناہ کرنے والوں کا جرم تو غیر راسخ ہوا اور نہی عن المنکر کے تارکین کا جرم راسخ و مستحکم ہوا۔

(تفسیر کبیر:۱۲/۳۹۳)

اور اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

”اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اصل ذمے داری ان دو طبقوں پر ہے، ایک مشائخ، دوسرے علماء اور اس میں آخر میں فرمایا کہ ﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴾ یعنی علماء و مشائخ کی یہ سخت بری عادت ہے کہ اپنا فرض منصبی امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھوڑ بیٹھے، قوم کو ہلاکت کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں۔“

نیز لکھا:

”جس قوم کے لوگ جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کے مشائخ وعلما کو یہ بھی اندازہ ہو کہ ہم ان کو روکیں گے، تو یہ باز آجائیں گے، ایسے حالات میں اگر یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ان جرائم اور گناہوں کو نہیں روکتے، تو ان کا جرم اصل مجرموں، بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ اشد ہے۔“

(معارف القرآن:۳/ ۱۸۵-۱۸۶)

حضرات علمائے کرام کی انہی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے ایک بیان میں فرمایا:

”شاید انسانوں کی کوئی جماعت اتنی مشغول اور فرائض و ذمے داریوں سے اتنی گراں بار نہیں جتنی نائبان رسول اور علماء و مصلحین اسلام کی جماعت ہے، جسمانی امراض کے طبیبوں کو بھی آرام اور فرصت کا موقعہ میسر آجاتا ہوگا ؛لیکن ان اطبائے روح کے لیے کوئی موسم اعتدال وصحت کا نہیں؛ لیکن علمائے حق اور” قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ“ (اللہ کے لیے کھڑی ہو جانے والی اور انصاف کی گواہ) جماعت کا کام بعض مرتبہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں ختم ہونے کے بجائے کچھ بڑھ ہی جاتا ہے۔ کچھ چیزیں ہیں، جو حکومت وطاقت و دولت وفراغت ہی کے زمانے میں پیدا ہوتی ہیں اور علمائے اسلام ہی کا فرض ہوتا ہے کہ ان کی نگرانی کریں، وہ اپنے فریضۂ احتساب، نگرانی، اخلاقی اور دینی رہنما کے منصب سے سبکدوش نہیں ہوتے۔ اس وقت بھی ان کا جہاد اور ان کی جدوجہد، جاری رہتی ہے۔

کہیں مسلمانوں کی مسرفانہ زندگی پر روک ٹوک کر رہے ہیں؛ کہیں سامان عیش وغفلت پر ان کی طرف سے قدغن ہے؛ کہیں چوری کی شراب کو گرفتار کیا ہے اور اس کو انڈیل رہے ہیں؛ کہیں باجوں اور موسیقی کے آلات کو توڑ رہے

ہیں؛ کہیں مردوں کے لیے ریشم کے لباس اور سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال پر چیں بجبیں ہیں؛ کہیں بے حجابی، مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط پر معترض ہیں؛ کہیں حماموں کی بے قاعدگیوں اور بداخلاقیوں کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں؛ کہیں غیر مسلموں اور عجمیوں کی عادات اور خصوصیات اختیار کرنے پر ان کی طرف سے مخالفت ہے؛ کبھی مسجدوں کے صحن اور مدرسوں کے ایوانوں میں حدیث کا درس دے رہے ہیں اور قال اللہ وقال الرسول کی صدا بلند کر رہے ہیں اور کبھی خانقاہوں میں یا اپنے گھروں اور مسجدوں میں بیٹھے ہوئے دلوں کا زنگ دور کر رہے ہیں؛ اللہ کی محبت وطاعت کا شوق پیدا کر رہے ہیں؛ امراض قلب، حسد، تکبر، حرص دنیا، دوسرے نفسانی وروحانی امراض کا علاج کر رہے ہیں؛ کبھی منبر پر کھڑے ہوئے جہاد کا شوق دلا رہے ہیں اور اسلام کی سرحدوں کی حفاظت، یا اسلامی فتوحات کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔

پوری اسلامی تاریخ میں آپ کو زندہ اور ربانی علما جو حکومت وقت کے دامن سے وابستہ نہیں تھے، یا حقیر جھگڑوں میں مشغول نہیں تھے، انھی مشاغل میں منہمک نظر آئیں گے اور مسلمانوں کا کوئی دور حکومت ان علمائے حق اور ان کی جد وجہد سے خالی نہیں رہا۔"

(خطبات علی میاں: ۶/ ۲۲۳-۲۲۴)

لہٰذا موجودہ دور میں بلا کسی تفریق کے تمام اہل حق علما کو اس کام کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے؛ تاکہ امت کے اندر کا یہ اعتقادی بگاڑ، عملی کجروی، اخلاقی گراوٹ، معاشرتی بے اعتدالی اور معاملاتی فساد دور ہو اور امت اس صراط مستقیم پر گامزن ہو جائے، جو حضرت نبی کریم ﷺ نے کامل ومکمل طور پر امت کے سپرد فرمائی تھی۔

جاہلیت جدیدہ

اسلام کی آمد سے قبل لوگ جاہلیت کے شکار تھے اور وہ دور دورِ جاہلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس کے عناصر میں جہالت و لاعلمی ، بے ایمانی و بے یقینی ،فسق و فجور و بے حیائی ، تہذیب و شائستگی سے بعد و دوری ، اخلاقی اقدار کی گراوٹ و کمزوری وغیرہ چیزیں شامل و داخل ہیں ،جن کے نتیجے میں پورا معاشرہ انتہائی خطرناک قسم کے جرائم و رذائل کا مرتکب بنا ہوا تھا اور جرائم بھی صرف انفرادی حیثیت کے نہیں ؛ بل کہ اجتماعی قسم کے تھے ، ایک طرف پورا سماج اپنے خالق و مالک سے بے تعلقی و دوری ،غفلت و ناسپاسی کا شکار تھا،تو دوسری جانب انسانیت کے اصول اور شرافت کے اقدار سے بھی کوسوں دور ہو چکا تھا اور قتل و غارت گری ، عداوت و دشمنی ، قطع رحمی و قساوت قلبی ،نزاع و لڑائی ، وغیرہ رذائل و جرائم ان لوگوں کی فطرت ثانیہ بن چکے تھے ۔یہی وہ امور ہیں، جن کے تسلط و غلبے نے اس دور و زمانے کو جاہلیت کا دور بنا دیا تھا۔

مگر موجودہ زمانہ جو ترقیات وتطورات کا زمانہ کہلاتا ہے ، سائنسی وعصری علوم کی بہتات کا زمانہ کہا جاتا ہے اور مختلف قسم کی نئی نئی ایجادات ومصنوعات کی ریل پیل کا دور مانا جاتا ہے، اس میں غور کیا جائے ،تو جاہلی دور کے وہ سارے عناصر یہاں بھی کارفرما نظر آتے ہیں اور پوری شدت وقوت کے ساتھ اپنا کام کرتے دکھائی دیتے ہیں، کہنے کو تو یہ علم وعقل کی روشنی کا دور ہے؛ مگر جہالت وضلالت کی تاریکیاں یہاں بھی پورے طور پر اپنا اڈہ جمائی ہوئیں ہیں۔

اس سے زیادہ قابل افسوس وحیرت یہ ہے کہ اسلام کے نام لیوا، اللہ ورسول کے ماننے

والے، جاہلیت کو غلط ٹھہرانے والے لوگوں میں سے بھی بے شمار لوگ آج ایسے ملیں گے، جن کی زندگیوں میں وہی جاہلی عناصر موجود ہیں، وہی بے ایمانی و بے یقینی، وہی خدا سے بعد و دوری، وہی اخلاقی گراوٹ، وہی فحش و بے حیائی، وہی ظلم و زیادتی، وہی عدوان و سرکشی، وہی بغض و دشمنی، وہی قتل و غارت گری؛ یہاں بھی نظر آتے ہیں، جو وہاں موجود تھے۔

ایک دو مثالیں بطور ''نمونہ از خروارے'' ذکر کرنا مناسب لگتا ہے، جاہلی معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کی جو لہر چلتی تھی، جس نے انسانیت کا سر شرم کے مارے جھکا دیا تھا، کس قدر قابل حیرت و افسوس ناک بات ہے، کہ وہ کسی نہ کسی درجے میں آج بھی موجود ہے۔ جوڑے جہیز کی مانگ، شادیوں میں بے جا مطالبات، جسمانی و ذہنی اذیت، مار توڑ اور قتل، وغیرہ اخلاقی جرائم و روحانی رذائل کی رپورٹیں روز روز اخبارات و جرائد میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کیا یہ جہالت و جاہلیت نہیں ہے؟

جاہلی دور کی ایک انتہائی ظالمانہ و مجرمانہ ذہنیت یہ تھی کہ لڑکی کی پیدائش کو معیوب و منحوس خیال کیا جاتا تھا اور کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی، تو اس ذہنیت کا منفی اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کا باپ اس کو زندہ درگور کر دینے ہی میں اپنی عزت سمجھتا تھا۔ اور آج ہمارے مسلم معاشرے میں بھی لڑکیوں کے وجود کو منحوس و معیوب سمجھنے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اس قسم کی ذہنیت کے لوگوں میں عموماً یہ دیکھا گیا کہ لڑکی کی پیدائش کی سزا میں اپنی بیوی کے ساتھ ظلم و زیادتی و بدسلوکی کرتے ہیں اور حد یہ ہے کہ بعض لوگ تو طلاق بھی دیدیتے ہیں، کیا یہ وہی جاہلی ذہنیت نہیں ہے؟

دور جاہلیت میں فحش و بے حیائی کوئی معیوب چیز نہیں تھی؛ بل کہ یہ اس زمانے کا ایک فیشن تھا، لڑکوں اور لڑکیوں میں معاشقہ، معاشقے کا برملا تذکرہ، اپنے قصائد و غزلوں میں اس کے اشارے، کنائے کیے جاتے تھے؛ بل کہ بعض وقت صراحت سے بھی گریز نہیں ہوتا تھا اور پھر اس سے آگے زنا و حرام کاری میں بھی کوئی باک نہ ہوتا تھا۔ غور کیجیے، تو آج کا دور بھی

اسی کی عکاسی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کا ماحول اس وقت جاہلیت کا پورا پورا نقشہ پیش کررہا ہے اور یہ سارے امور یہاں کے ماحول میں بھی ایک فیشن بن چکے ہیں، حتی کہ جو اسٹوڈنٹ اس قسم کی خرافات میں حصہ نہ لیتے ہوں، ان کو اس ماحول میں بے وقوف سمجھا جاتا اور اجنبی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

نیز اس صورتِ حال میں مزید قوت وشدت پیدا کرنے والے عوامل میں ٹی وی، موبائیل فون، انٹرنیٹ، فیس بک، وغیرہ کا بڑا عمل دخل ہے، جنھوں نے گھر گھر میں فحش و بے حیائی کو داخل کردیا ہے اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگیوں کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اور یہ سب کچھ جدت نوازی وترقی پسندی کے عنوان پر کیا جارہا ہے اور لوگ ان جدید آلات کو اپنے ترقی یافتہ ہونے کی دلیل خیال کرتے ہیں اور جوان آلات سے واسطہ نہ رکھتا ہو، اس کو پس ماندہ ودقیانوس قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسی لیے آج کل کے بعض روشن خیال لوگ اہل مدارس کو پوری سنجیدگی، وخلوص وللّٰہیت سے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ مدارس میں بھی ان مواصلاتی آلات ووسائل ابلاغ کو داخل کیا جائے اور طلبہ کو انٹرنیٹ کی دنیا سے ضرور روشناس کرایا جائے۔ ان حضرات کے ان مشوروں کے پیچھے کتنا بھی خلوص وللّٰہیت ہو اور اہل مدارس سے کتنی بھی ہمدردی وغمخواری ہو؛ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیوی مفادات ومادی منافع کے پیش نظر ان وسائل وآلات کے مفاسد وخطرناک نتائج ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اگر یہ حضرات ذرا سی بھی توجہ ان کے مفاسد وہولناک نتائج کی جانب کریں اور ان مفاسد وخطرناک نتائج کا ان کے منافع سے موازنہ کریں، تو شاید یہ مشورہ دینے میں احتیاط برتیں۔

اسی طرح جاہلی عصر کا ایک امر خاندانی تعصب ہوا کرتا تھا، کہ جاہلی لوگ اپنے خاندان پر فخر، اس کی بڑائی وعظمت، دوسرے خاندانوں کی تحقیر وتذلیل کیا کرتے تھے، یہ خاندانی تعصب بھی بیشتر لوگوں میں آج پایا جاتا ہے، حتی کہ بعض خاندان ایسے ہیں، جن میں اپنے

خاندان یا قبیلے کی جانب منسوب کر کے مساجد بھی بنائے جاتے ہیں اور نکاح رجسٹر بھی ان کا الگ ہوتا ہے اور نکاح ہونے والے لڑکے ولڑکی کا بھی ایک ہی خاندان سے ہونے کو لازم تصور کیا جاتا ہے؛ بل کہ بعض علاقوں میں برادریوں میں بھی اس کا خیال لازمی طور پر رکھا جاتا ہے کہ نکاح ہونے والے جوڑے کا ایک ہی برادری سے تعلق ہو اور اس کے خلاف کرنے کو نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے؛ بل کہ بعض جگہ اس کی خلاف ورزی پر خلاف ورزی کرنے والوں کا برادری والے بائیکاٹ کر دیتے ہیں۔

حالاں کہ یہ مسئلہ کفو والی بات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا؛ کیوں کہ کفو کی جو حقیقت ہے، اس میں فقہا کے مطابق اہل ہند کے کئی خاندان ایک دوسرے کے کفو ہیں؛ مگر یہاں لوگ ہر خاندان کو دوسرے سے الگ خیال کرتے ہیں اور اس سے آگے یہ کہ برادریوں کو ایک دوسرے سے الگ مانتے ہیں اور پھر ان میں ایک دوسرے سے نکاح کو معیوب سمجھتے ہیں، جو اسلامی کفو سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

الغرض یہ جاہلیت آج ہم میں رائج ہے اور ہمیں اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ جس جاہلی نظام کو ختم کرنے اللہ تعالی نے آقائے مدنی ﷺ کو بھیجا اور آپ نے بڑے مصائب جھیل کر اور ہزاروں قسم کی جانی و مالی قربانیوں کو پیش کر کے اس کی جگہ اسلامی نظام قائم فرمایا ،آج ہم خود اس نظام اسلامی کو چھوڑ کر جاہلی نظام پر کار بند ہیں۔

اللہ کرے کہ ہمارے معاشرے میں رواج پذیر جاہلانہ باتیں وتصورات ونظریات سے ہم توبہ کریں اور دور ہوں اور اس سچے و پاکیزہ اسلامی نظام پر جینے و مرنے کی ہمت کریں۔

عصری تعلیم دینی ماحول میں

جوہر میں ہو لاالٰہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

یہ بات ہراس شخص پر واضح وظاہر ہے، جو ذرا بھی عقل وشعور رکھتا ہواور دانش وبینش کا حامل ہو کہ تعلیم؛ انسانی ضروریات میں سے ایک اہم ترین ضرورت اور روحانی فضائل میں سے ایک بلند ترین فضیلت ہے، علم وتعلیم ہی وہ جوہرِ لازوال ہے، جس کے سامنے فرشتوں کو سرنگوں ہونا پڑا اور جس کی بنا پر انسان مسجودِ ملائک بنا اور یہی وہ وصف خصوصی ہے کہ شرافتِ انسانی اور کرامتِ انسانی جس پر مرتب ہوتی ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں، جن میں دورائے نہیں ہو سکتی۔

مگر یہاں یہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ علم وہی ہے، جس سے انسان کو انسانیت کا سبق ملے ،اخلاق فاضلہ میں رسوخ حاصل ہو، تہذیب وشرافت پروان چڑھے اوراس کے ساتھ وہ حق وباطل میں تمیز، مغز و پوست میں فرق اور صلاح وفساد میں امتیاز کرنے کی صلاحیت بخشتا ہو اور انسان کو صراط مستقیم پر گامزن کرتا ہو اور رضائے الٰہی اور قرب خداوندی کی دولت سے مالامال کرتا ہو، اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ سائنس وٹکنولوجی Science & Tecnology کے علوم ہوں یا طب وانجینئری کے فنون ہوں، تاریخ وفلسفہ کے اسباق ہوں، یا زبان وادب کے دروس ہوں۔ اگر یہ تمام علوم وفنون انسان کو اس مقصد تک پہنچاتے ہیں، جو ابھی مذکور ہوا، تو بلا شبہ یہ علوم وفنون ہیں اور اگر اس مقصد تک نہیں پہنچاتے ،تو یہ سب ایک شعبۂ جنون ہے۔

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے کہا ہے

جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف

تعلیم ہو گو فرنگیانہ

چناں چہ جس دور میں یہ تمام علوم وفنون اہل اسلام کے ہاتھوں پروان چڑھ رہے تھے، ان علوم وفنون سے انسان کو انسانیت کا سبق، شرافت کا درس، اخلاق فاضلہ میں رسوخ، حق وباطل میں تمیز وپہچان کی صلاحیت، بھر پور طریقے پر حاصل ہوتی رہی اور انسان ہدایت کی شاہراہ پر گامزن اور صراط مستقیم پر قائم تھا، سائنس کا ہر سبق اس کے لیے وجود خداوندی اور توحید باری کا سبق تھا، ٹکنولوجی کے فنون اس کے لیے قدرتِ خداوندی پر یقین کا باعث بن جاتے تھے، تاریخ کے واقعات اور قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں اس کے لیے عبرت وموعظت کے اسباق قرار پاتے تھے اور وہ ان سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا ؛غرض یہ کہ یہ تمام علوم وفنون اس کی رہنمائی کرتے تھے اور وہ رضائے الٰہی وقرب خداوندی کی دولت سے مالا مال ہو جاتا تھا۔

مگر اسپین کے زوال کے بعد جب یہ تمام علوم وفنون (جن کو ہمارے اسلاف نے ایمانی فراست اور روحانی حرارت کے ذریعے پروان چڑھایا تھا اور ان علوم وفنون سے انسانیت کی خدمت لیتے رہے)الحادودہریت کے شکار لوگوں، خداو رسول کے باغیوں، انسانیت وشرافت سے محروم لوگوں، حرص وہوس کے پجاریوں کے ظالمانہ ومجرمانہ پنجے اور قبضے میں چلے گئے، تو ان علوم وفنون کو ان کے اصل مقصد ومنشا کے خلاف استعمال کیا جانے لگا اور اپنے ذاتی مفادات کے لیے ان کا کھلے طور پر استحصال کیا جانے لگا۔اور یہ ملحد و زندیق اور اہل حرص و ہوا لوگ اپنی مکاری وعیاری' چالاکی وچالبازی سے شعبۂ تعلیم پر چھاتے ہی چلے گئے، یہاں تک کہ ان علوم وفنون کو انھوں نے خدا اور رسولوں سے بغاوت، مذہب وایمان سے عداوت، انسانیت وتہذیب سے تلعب واستہزاء اور اخلاقی اقدار کی تحقیر و

توہین کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا۔

اور آج کے دور میں علم وتعلیم نام ہی اس بات کا ہے کہ مذہب وایمان کو فضول اور بے کار چیز سمجھا جائے، اخلاقی اقدار جیسے شرم وحیاء، تواضع وانکساری، احسان وسلوک وغیرہ کو عجز وکمزوری پر محمول کیا جائے اور انسانی اقدار کو دقیانوسی ٹھہرایا جائے اور اس کے برعکس ہر بے حیائی اور بے شرمی کو تعلیم کا لازمہ اور ہر بے ایمانی اور بداعتقادی کو عقل وشعور کا نتیجہ اور ہر بداخلاقی وبدتہذیبی کو روشن خیالی کا اثر قرار دیا جائے۔

موجودہ عصری تعلیم گاہوں کا نصاب ونظام اسی قسم کا نتائج پیدا کرتے ہیں۔اسی وجہ سے اس نظامِ کے تحت پرورش پانے والے لوگ عام طور پر بے دینی اور الحاد ودہریت یا کم ازکم دین ومذہب کے بارے میں تشکک وتذبذب کا شکار ہوجاتے ہیں اور اسلام اور اس کی تعلیمات پر حملے کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے اپنے خطبات میں فرمایا ہے:

''جدید تعلیم میں مذہبی اثر نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں تعلیم یافتہ مذہبی مسائل کو تقویم پارینہ سمجھتے ہیں، اخباروں میں آرٹیکل نکلتے ہیں کہ اسلام کا قانون وراثت خاندان کو تباہ کردینے والا ہے؛ اس لیے اس میں ترمیم ہونی چاہیے، ایک صاحب نے مضمون لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکے میں تھے، پیغمبر تھے، مدینہ جاکر بادشاہ ہوگئے اور اس لیے قرآن مجید میں جو مدنی سورتیں ہیں، وہ خدائی احکام نہیں؛ بل کہ شاہانہ قوانین ہیں، ایک موقعے پر مجھ سے لوگوں نے لکچر دینے کی درخواست کی، میں نے پوچھا کس مضمون پر لکچر دوں؟ ایک گریجویٹ مسلمان نے فرمایا کہ اور جاہے جس مضمون پر تقریر کیجیے؛ لیکن مذہب پر نہ کیجیے، ہم لوگوں کو مذہب نام سے گھن آتی ہے (نقل کفر کفر نہ باشد) یہ صرف دو چار شخص کے خیالات نہیں، مذہبی بے پروائی کی عام

وبا چل رہی ہے،فرق یہ ہے کہ اکثر لوگ دل کے خیالات دل ہی میں رکھتے ہیں اور بعض دلیر طبع لوگ ان کو ظاہر بھی کر دیتے ہیں۔

(خطبات شبلی:۵۸-۵۹)

علامہ اقبال رحمہ اللہ جوان ہی کالجوں کے پروردہ اور یورپی دنیا اور وہاں کے لوگوں کی عیاریوں ومکاریوں سے خوب واقف تھے،انھوں نے ان ہی حالات کے مطالعہ ومشاہدے کے بعد کہا تھا:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے شارحِ اقبالیات پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے:

"تعلیم حاصل کر کے نوجوانوں کو سرکاری ملازمت تو بیشک مل جاتی ہے؛ لیکن اس مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کے اندر الحاد کا رنگ بھی تو پیدا ہو جاتا ہے ،مسلمان کے گھر میں دولت آرہی ہے ؛لیکن کفر کی لعنت بھی اس کے ساتھ ساتھ داخل ہو رہی ہے،تو ایسی دولت کس کام کی ؟ واضح ہو کہ مغربی تعلیم کے مضر ہونے پر اقبال نے فیصلہ ۱۹۱۳ء میں صادر کیا تھا اور قوم اس وقت سے لے کر تا ایندم اسی سمِ قاتل کو نوشِ جانِ ناتواں فرما رہی ہے،تو ناظرین خود اندازہ کرلیں کہ مریض اب کس منزل میں ہوگا ؟

(بانگ درا مع شرح:۵۵۷تا۵۵۸)

غرض یہ کہ مغربی تعلیم کی ساخت وپرداخت ہی کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس سے کفر وشرک اور بغاوت وطغیانی اور الحاد ودہریت کے جذبات وخیالات جنم لیتے اور پرورش پاتے ہیں ؛ کیوں کہ ان تعلیم گاہوں میں علوم فنون کی تعلیم کا جو منہج ہے، وہ مغربی ثقافت و تہذیب کے مزاج وخصوصیات سے تشکیل پایا ہوا ہے اور ان فکری وفلسفیانہ رجحانات کا آئینہ

دار ہے، جن سے مغربی ثقافت وتہذیب پروان چڑھی ہے۔

عقائد ونظریات کے علاوہ اس مغربی تہذیب وثقافت کے اثر سے مسلم سماج کو بے حجابی ،عریانیت ، فحاشی و ننگے پن کا ایک سیلاب بلا خیز بھی اپنی رو میں بہالے جارہا ہے اور فیشن کے نام پر انسانیت سوز مراسم وانداز اختیار کیے جارہے ہیں۔

بہت سارے لوگ اس حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی سامراج نے جو مغربی تعلیم نظام رائج کیا، اس کا مقصد انگریزی تعلیم سے زیادہ انگریزیت کی تعلیم تھی ، وہ اس نظام کے ذریعے ہندوستانی لوگوں میں انگریزی ذہنیت کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس کی تصدیق ''لارڈ میکالے'' کی رپورٹ سے ہوتی ہے، جو اس نے ۱۸۵۳ء میں مقبوضہ ہندوستان کے گورنر جنرل کو پیش کی تھی؛ چناں چہ وہ کہتا ہے:

''ہمیں اس وقت بس ایک طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے، جو ہمارے اوران کروڑں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے، جن پر ہم اس وقت (ہندوستان میں) حکمران ہیں، ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو؛ مگر ذوق ،طرزِ فکر، اخلاق اور فہم وفراست کے نقطۂ نظر سے انگریز ہو۔''

(میکالے کا نظریہ تعلیم: ۶۹ بحوالہ ہمارا نظامِ تعلیم: ۵۰)

الغرض جدت پسندی کے اس طوفان ورجحان نے اس طبقے کے ایمان کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور وہ بے ایمانی وارتداد کی طوفانی لہروں میں غوطہ کھاتا دکھائی دے رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال سے نکلنے کی کیا صورت ہے اور تعلیمی مسئلہ کو حل کرنے کی سبیل کیا ہے؟ جس سے ایک طرف علوم وفنون سے وابستگی وتعلق؛ بل کہ ان میں اختصاص و مہارت پیدا ہو اور دوسری طرف یہ سارے علوم وفنون ،معرفت خداوندی کا ذریعہ بن جائیں، اخلاق فاضلہ کے حصول کا سبب بن جائیں اور شرافت وتہذیب کی طرف گامزن کردیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں مسئلے کے حل کے لیے مغربی نصاب ونظام تعلیم کو یکسر

ختم کر کے ایک ایسے نصاب اور نظام کی تشکیل کرنی ہوگی، جو ہماری ذات اور ہمارے مقاصد سے مناسبت و ہم آہنگی رکھتا ہو اور اس میں ان باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو، جن کا ایک مسلمان کو لحاظ رکھنا ہے اور اس کی طبیعت سے ان کو مناسبت ہو۔

ہم یہاں اس سلسلے میں حضرت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی رحمہ اللہ بات پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں، جو آپ نے اسی مسئلے کے حل کے لیے فرمائی ہے:

''اس غیر فطری اور غیر ضروری صورت حال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ اس پورے تعلیم نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اسکو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظام تعلیم تیار کیا جائے، جو اپنی ملّت اور امت کے قد و قامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی و دنیوی ضروریات پوری کر سکتا ہو، اس مسئلے کا حل خواہ کتنا ہی دشوار نظر آتا ہو اور صبر آزما اور دقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادیت، خدا سے سرکشی، اخلاقی و روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم و خواہشات کی پرستش کی روح اور اسپرٹ کو ختم کیا جائے اور اس کے بجائے تقویٰ، انابت الی اللہ، آخرت کی اہمیت اور فکر اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح جاری ساری کر دی جائے، اس مقصد کے لیے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک اور علومِ عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات و معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنی ہوگی، مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہوگا، اس کی قیادت اور امامت کا انکار کرنا ہوگا، اس کے علوم و نظریات پر علمی تحلیل و تجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہوگا۔'' (اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت:۲۱-۲۲)

نیز ایک اور کتاب اسلامی ممالک میں مغربیت و اسلامیت کی کشمکش میں تقریباً یہی

بات فرماتے ہوئے مزید یہ بھی کہتے ہیں:

''زبان وادب سے لے کر فلسفہ ونفسیات تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر معاشیات وسیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا جائے، مغرب کے ذہنی تسلط کو دور کیا جائے، اس کی معصومیت وامامت کا انکار کیا جائے، اس کے علوم ونظریات کو آزادانہ تنقید اور جراتمندانہ تشریح (پوسٹ مارٹم) کا موضوع قرار دیا جائے، مغرب کی سیادت وبالاتری سے عالمِ انسانی کو جو عظیم الشان نقصانات پہنچے، ان کی نشاندہی کی جائے، غرض مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے علوم وفنون کو پڑھا جائے اور اس کے علوم وتجارب کو موادِ خام (Raw -Material) فرض کر کے اپنی ضرورت اور اپنے قد و قامت اور اپنے عقیدہ ومعاشرت کے مطابق سامان تیار کیا جائے۔

(اسلامی ممالک میں مغربیت واسلامیت کی کشمکش)

اس تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ ہم مغرب سے استفادہ اسی صورت میں کر سکتے ہیں، جب کہ ہم اس کے نصاب اور نظام کو حذف وترمیم اور اصلاح و تجدید کی راہ سے مکمل طور پر گذاریں گے اور اس کو اس قابل بنائیں گے کہ وہ ہمارے قد و قامت پر راست آسکے۔

یہ ہے وہ عظیم ونازک ترین کام ہے، جس کے بغیر یہ امت یا تو ناکارہ رہے گی یا مغرب کی غلام بن جائے گی، یہ کام اگرچہ طویل المیعاد ہے؛ مگر ہے ضروری؛ اس لیے بہر حال اس کام کو کرنا چاہیے۔

اس کے لیے مسلمانوں کو اپنے اسکول وکالج کھولنے چاہئیں اور وہاں ایک ایسا ماحول بچوں کے لیے فراہم کرنا چاہیے، جوان کو ایک جوان کو عصری علوم میں مہارت ولیاقت پیدا کرنے میں مفید ومعین بنے، تو دوسری جانب وہ ایک مسلمان، ایک تقوی شعار، ایک ہمدرد قوم وملت شخصیت بننے کے لیے بھی مفید ہو۔

ماہ رمضان اور ہم

رمضان کا مبارک مہینہ، ہر سال اپنی تمام تر برکتوں، فضیلتوں، بڑائیوں اور بزرگیوں کے ساتھ ہم پر جلوہ فگن ہوتا اور پھر اپنے وقت پر رخصت ہو جاتا ہے؛ مگر ہم جن برائیوں، غفلت اندیشیوں، نالائقیوں اور اندھریوں میں گھرے ہوئے اور پڑے ہوئے ہوتے ہیں، ان سے ذرا برابر نہیں نکلتے؛ بل کہ اور گھرتے چلے جاتے ہیں، آخر اس کی علت و وجہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ماہ رمضان آتا اور جاتا ہے؛ مگر ہم اس سے استفادہ کرنے اور فیض اٹھانے کی کوئی سعی اور کوشش نہیں کرتے، جیسے سورج نکلے، روشنی پھیلے، دن نمودار ہو جائے اور کوئی بیوقوف آنکھ بند کیے بیٹھا رہے، تو اس بیوقوف کو اس عظیم الشان روشنی اور نور سے کوئی حصہ نہ ملے گا اور وہ جیسے رات کی اندھریوں میں ٹھوکرے کھاتا پھرتا رہا تھا، اب بھی بھٹکتا پھرے گا، اب کون کہہ سکتا ہے کہ روشنی نمودار نہیں ہوئی یا روشنی نے فائدہ نہ دیا؟ نہیں؛ بل کہ روشنی پھیلی، اس نے اپنی جلوہ نمائی سے سارے عالم کو منور کر دیا، ہر ایک نے اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق اس سے فیض بھی پایا، ہاں جس نے نور دیکھنا ہی نہ چاہا، فیض پانا ہی گوارا نہ کیا، آنکھ کھولنے کی زحمت ہی نہ اٹھائی، وہ بلاشبہ محروم رہا اور رہے گا۔

یہی حال ہمارا ہے کہ رمضان کی مبارک ساعتیں ہم پر اپنا سایہ پھلا دیتی ہیں، اس کے نور کی بدلیاں سارے عالم پر نور افشانی کرتی ہے اور ذرہ ذرہ معمور و اور اس کے نشے سے مخمور ہو جاتا ہے؛ مگر ہم اس نور کا مشاہدہ کرنے کے لیے آنکھ نہیں کھولتے، اس کے برکات و فضائل سے اخذ فیض کے لیے کبھی راغب نہیں ہوتے، کبھی خیال تک نہیں آتا کہ رمضان جیسے عظیم البرکات مہینے کا ہم استقبال کریں، اس کا احترام کریں، اس سے اپنے تعلق کا اظہار

کریں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم جہاں تھے، وہیں اور جیسے تھے، ویسے ہی رہ جاتے ہیں اور رمضان اپنا سایہ ہم پر سے اٹھالیتا ہے اور رخصت ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال کس قدر سنگین اور دردناک اور خطرناک ہے، یہ بالکل ظاہر ہے۔

الغرض ہماری غفلت حد کو پہنچ چکی اور ہم نہایت نکمے ہو چکے؛ اس لیے اب ضرورت ہے اس کی کہ ہم ان غفلت کے پردوں کو جو ہم پر پڑے ہوئے ہیں، چاک کر ڈالیں اور بے عملی و بد عملی کی سیاہیوں کو دھوڈالیں اور بیدار، متیقظ، ہوشیار اور پاک وصاف ہو جائیں، گناہوں کی جہنم سے اپنے آپ کو آزاد کرائیں، نیکیوں اور اعمال صالحہ کے خزانوں کو جمع کر لیں اور ہر طرح کی محرومیوں سے نکل کر خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے لٹائی جانے والی رحمتوں و برکتوں سے خوب خوب فیض پائیں۔

ایک طویل حدیث میں جس کو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دن خطبہ دیا اور اس میں ایک بات یہ بھی فرمائی:

« وَهُوَ شَهْرٌ أَوَّلُهُ رَحْمَةٌ وَّ أَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَّ آخِرُهُ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ »

(أخرجه ابن خزيمة في صحيحه: ۱۹۱/۳، والبيهقي في شعب الايمان: ۳۶۰۸، عن سلمان الفارسي في حديث طويل)

(ماہ رمضان وہ مہینہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ آگ سے آزادی وہ خلاصی ہے۔)

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رمضان کے تین حصے قرار دیے گئے ہیں: اول، اوسط اور آخر۔ اور یہ دس دس ایام پر مشتمل ہوں گے، یا پہلا اور اوسط حصہ دس دس ایام کا اور آخری حصہ نو ایام کا ہوگا، پھر پہلے عشرے کو رحمت کا دوسرے کو مغفرت کا اور تیسرے کو یعنی آخری حصے کو دوزخ سے خلاصی کا قرار دیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ ''آدمی تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن پر گناہوں کا بوجھ نہیں، ان کے لیے شروع ہی سے رحمت وانعام کی بارش ہوجاتی ہے، دوسرے وہ لوگ، جو معمولی گنہگار ہیں، ان کے لیے کچھ حصہ روزہ رکھنے کے بعد ان کے روزوں کی برکت اور بدلے میں گناہوں کی معافی ہوتی ہے، تیسرے وہ جو زیادہ گنہگار ہیں، ان کے لیے زیادہ حصہ روزہ رکھنے کے بعد آگ سے خلاصی ہوتی ہے۔''

(فضائل رمضان:۱۱)

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی مایۂ ناز کتاب ''معارف الحدیث'' میں اسی شرح کو اختیار فرمایا ہے۔

(دیکھو! معارف الحدیث:۵۳)

لہذا ہم رمضان کے ان تینوں حصوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں؛ تاکہ اس کی رحمت ومغفرت ودوزخ سے نجات تینوں میں سے کسی ایک کے تو مستحق ہوجائیں۔

''تکبیر مسلسل'' کے اس نمبر میں جو دراصل دوشماروں پر مشتمل ہے، کوشش کی گئی ہے کہ رمضان کے سلسلے میں اہم وضروری مضامین پیش کیے جائیں؛ لہٰذا اس میں روزے کے متعلق بھی مضامین ہیں اور ان میں بھی تنوع کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ روزے کی اہمیت و ضرورت، اس کی تشریع میں حکمت ومصلحت، اس کے فوائد وبرکات پر مضامین پیش کیے گئے ہیں، اسی طرح زکاۃ کے عنوان پر بھی متنوع امور پر بحث کی گئی ہے، اس کی ضرورت واہمیت، اس کی حکمت ومصلحت، اس کے اہم وجدجد مسائل وغیرہ، اسی طرح رمضان میں تراویح ایک اہم عبادت ہے اور اس سلسلے میں ''رکعات تراویح'' کا عنوان عام طور پر زیر بحث لایا جاتا ہے اور بعض حضرات کی جانب سے اس سلسلے میں ''آٹھ رکعات'' ہی پر اصرار کیا جاتا ہے اور بیس رکعات کو بدعت کہہ کر عوام الناس کو بہکانے کی ایک تحریک چلائی جاتی ہے؛ لہذا اس سلسلے میں ایک مبسوط مضمون بھی اس میں پیش کیا گیا ہے، جو مدلل طریقے پر بیس رکعات

تراویح کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔اسی طرح رمضان کے بعد عید کا نمبر ہوتا ہے؛اس لیے عید کے بارے میں بھی مضامین پیش کیے گئے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''تکبیر مسلسل'' کے ذریعے پیغام حق وصداقت کو بلند کرنے اور گھر گھر پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے اور اس سے امت کو مستفید ہونے کا بھر پور مواقع فراہم فرمائے۔آمین۔

☆☆☆

انقلاب مصر کے پس منظر میں

ہے گرم خوب قتل کا بازار دیکھنا
فرعونیت کا مصر میں دربار دیکھنا
جمہوریت کا چہرہ ہوا داغدار اب
ہنستے ہیں ہم پہ دنیا میں اغیار دیکھنا
مسلم ہیں ہم یہی ہے قصور اپنا منصفو!
قاتل کے ہاتھ دیتے ہو ہتھیار دیکھنا
اسلام کا ہے دعویٰ پر اسلام سے ہیں دور
ہائے ! صفوں میں اپنی ہیں غدار دیکھنا
اعزاز قاتلوں کا ، سزا بے قصور کو
کیا احمقانہ ان کا ہے معیار دیکھنا
اسلام سے عناد ، تعصب و سنگ دلی
رکھتے ہیں کس قدر ذرا اشرار دیکھنا
بدرُ واُحد ، حنین ، یہ امت کا تھا عروج
اب کس قدر وہ ، ہوگئی لاچار دیکھنا
عالم میں چاہتے ہیں ، سکیولر نظام ہو
یعنی نظامِ کفر ہو مختار دیکھنا
دشمن بشر بشر کا ہوا ، ہائے یوں لگے

انساں ہے خود سے ، برسر پیکار دیکھنا
قتل وفساد کر کے ،مہذب بنے ہیں وہ
آتی نہیں اُنھیں تو ذرا عار دیکھنا
شرّ و فساد پھیل گیا اس زمین پر
یہ شر پسند ٹولے کا کردار دیکھنا
کہتے ہیں اہل دین کو دہشت پسند یہ
دہشت پسند کون ہیں اے یار دیکھنا
ہم دین چھوڑدیں یہ نہ ہوگا،کہو شعیبؔ
اعلان ِحق ہے یہ مرا صد بار دیکھنا

ہمارا عائلی نظام تباہی کے دہانے پر

چند دنوں قبل ایک خط موصول ہوا، جس میں ایک خاتون نے اپنی یہ داستان سنائی ہے:

''میں بنگلور کی رہنے والی ہوں، میرے والد ایک دیندار شخص تھے، جو اگریکلچر ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور ملازمت کے لیے چنئی میں وہ رہتے تھے، انھوں نے مجھے اچھی طرح پڑھایا اور اعلی تعلیم دلائی، پھر میری شادی ایک ڈاکٹر سے کردی، جو امریکے میں ملازمت کے لیے مقیم تھے اور خاندانی لحاظ سے مالدار بھی تھے،شادی کے بعد میرے شوہر ایک ماہ میرے ساتھ رہے، پھر وہ امریکہ روانہ ہوگئے، اب میں میرے ساس، سسر، نندوں اور دیوروں کے ساتھ رہنے لگی اور مجھے گھر کا سارا کام کرنا پڑتا تھا، جس میں پکوان سے لے کر صفائی و کپڑوں کی دھلائی بھی تھی، ابھی میرے شوہر کے گئے ہوئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ میری ساس کی جانب سے مجھے ٹارچر کیا جانے لگا، کبھی وہ جوڑے جہیز کی کمی کا طعنہ دیتیں، کبھی میری خوبصورتی کی کمی پر لعن وطعن کرتیں، کبھی میرے کام دھام پر اعتراض کرتیں اور خوامخواہ ہر بات پر اعتراض کر کے ایک جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کرتیں اور ان کے ساتھ میری نندیں بھی اس میں شریک ہوجاتیں، میں کوئی جواب دینے کے بجائے خاموش رہتی، یہاں تک کہ یہ لوگ یہ کہنے لگے کہ دیکھو کوئی جواب تک نہیں دیتی، ہماری اس کے پاس کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اس پر میں نے کوئی وضاحت پیش کرنا چاہی، تو کہنے لگے کہ یہ کس قدر بدتمیز ہے کہ پلٹ کر ہمارا جواب دیتی ہے۔ پھر یہی

نہیں؛ بل کہ میرے شوہر کو فون سے میرے خلاف اُکسانے کی کوشش کرنے لگیں، ان کو یہ بتایا گیا کہ میں بات بات میں جواب دیتی ہوں، کوئی کام ٹھیک نہیں کرتی، کسی کا احترام نہیں کرتی، وغیرہ۔ اس پر میرے شوہر وہاں پریشان ہوکر مجھے فون سے پوچھنے لگے، میں نے صورت حال بتائی، وہ خاموش ہو گئے؛ مگر ان کو برابر فون سے ساس بھی نندیں بھی میرے خلاف ابھارتی رہیں، اس پر میرے شوہر کبھی خفا ہوکر بات کرتے اور پھر انھوں نے مجھے میرے ماں باپ کے گھر جانے سے منع کر دیا اور میرے والدین کو بھی مجھ سے ملنے کے لیے آنے پر پابندی لگا دی، پھر یہ سلسلہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ چند ماہ کے بعد شوہر نے فون کرنا بند کر دیا اور میرا فون بھی اٹھانا چھوڑ دیا، میں بار بار فون سے بات کرنے کی کوشش کرتی؛ مگر وہ فون بالکل نہیں اٹھاتے تھے۔ میں نے میری ماں باپ کو بتایا، تو انھوں نے مجھے سمجھا دیا کہ ایسا ہوتا ہے، میں پھر چند ماہ برداشت کرتی رہی اور اسی درمیان میں میری ساس و نندیں مجھے مارنے بھی لگیں، اب میں ان کے مار کھاتی اور فون سے شوہر سے بات کرنا چاہتی، تو وہ فون نہیں اٹھاتے اور دوسری جانب میری ماں باپ مجھے سمجھا کر چھوڑ دیتے اور یہ مار پٹائی کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ میں حاملہ تھی اور مار کی وجہ سے پیٹ کا بچہ ضائع ہو گیا اور آپریشن کے ذریعے اس کو نکالا گیا۔ یہ سب ہوا؛ مگر میرے شوہر سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا اور میں اس کے بعد اپنے میکے میں رہنے لگی، اسی درمیان ایک دن میرے شوہر ای میل خط آیا، جس میں مجھے ''تین طلاقیں لکھ بھیجی ہیں'' میں شادی کے بعد صرف ایک ماہ شوہر کے ساتھ گزار کر اپنی ساری ارمانوں کو خاک میں ملا بیٹھی ہوں۔ اس خط کے اخیر میں اس خاتون نے سوال کیا ہے کہ کیا اسلام میں ہم جیسی مظلوم لڑکیوں کے لیے کوئی ایسا قانون ہے کہ اس کی مدد سے ہمارے اوپر ہونے والے اس ظلم کا مداوا ہو سکے؟''

اس قسم کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں، جن سے موجودہ مسلم معاشرے کی صورت حال کا اندازہ ہوتا رہتا ہے؛ نیز فیصلوں کے لیے بھی لوگ ایسے واقعات و حالات سامنے لاتے رہتے ہیں؛ اس لیے یہ خط یوں سمجھنا چاہیے کہ صرف ایک نمونہ ہے اور یہ ایک خاتون کی داستان نہیں؛ بل کہ نہ معلوم ہمارے معاشرے میں ایسی کتنی خواتین ہیں، جن کے ساتھ ایسے یا اس سے بھی زیادہ ہولناک و خطرناک حالات و مسائل پیش آتے رہتے ہیں اور طلاق کے ذریعے کتنے نکاح برباد ہوتے ہیں اور یہ مظلوم لڑکیاں اپنی ارمانوں کو خاک میں ملا بیٹھتی ہیں اور اسی کے ساتھ عائلی نظام زندگی تباہ و برباد ہو جاتا ہے؛ حالاں کہ اسلام نے ہمیں جو نظام زندگی عطا کیا ہے، اس میں ہمہ جہتی اصول و قوانین بیان کیے گیے ہیں اور اسی میں ہمارا عائلی و خاندانی نظام بھی داخل ہے، جس میں ہمیں ایسے پاکیزہ و معقول اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے کہ ان کا لحاظ و پاسداری ہماری زندگی کو راحتوں و مسرتوں سے معمور اور سکون و اطمینان سے مالا مال کر دے گی؛ مگر اب دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ خاندانی نظام زندگی تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے اور روز روز صدہا خاندان ٹوٹ رہے ہیں، ان کی عزتیں پامال ہو رہی ہیں اور مزید یہ کہ اس کی وجہ سے ان کے بچوں کا مستقبل بھی تباہ ہو رہا ہے۔

شادیاں تو ہوتی ہیں بڑے اونچے پیمانے پر اور یہ ٹوٹتی بھی ہیں، بڑے پیمانے پر۔ اور اس کی وجہ ایسا لگتا ہے کہ علم دین سے جہالت و دوری ہے، کہ نہ میاں کو اپنی بیوی کے حقوق کا علم ہے اور نہ بیوی کو اپنے شوہر کے حقوق کا علم، اسی طرح حدود و آداب شرعیہ سے ناواقفیت اس کی وجہ ہے، شوہر یا اس کے گھر والے لڑکی سے وہ سارا کام لیتے ہیں، جو اس کے ذمے شرعاً لازم نہیں ہے، جیسے گھر کا سارا کام یا سب کے کپڑوں کی دھلائی و گھر کی صفائی، وغیرہ۔

یہ کس قدر ظلم ہے کہ شادی ہونے والی لڑکی پر گھر کے کام کا سارا بوجھ ڈال دیا جائے، پکوان کا بھی، صفائی کا بھی دھلائی کا بھی، گویا شادی اس لیے کر کے لے گئے کہ اس کو ایک خادمہ کی حیثیت دینی تھی اور اس میں بشری تقاضے سے کوئی کمی بیشی ہو، تو اس کو برداشت کرنے کے بجائے اس پر ظلم کیا جائے، مار پٹائی کی جائے اور اس کو ٹارچر کیا جائے اور اس کا

شکوہ کیا جائے اور اس کے شوہر کو اس کے خلاف ابھارا جائے، یہاں تک کہ صرف ایک ماہ شوہر ساتھ رہ کر آخر ان ہی شکایات کی وجہ سے بلا تحقیق طلاق کا خط روانہ کر دے۔

سب سے پہلے تو یہ خود ایک ناجائز و خلاف شرع بات ہے کہ ایک لڑکی پر اس قدر بوجھ ڈالا جائے، جب کہ اسلام نے کسی نوکر و غلام پر بھی اس کی حیثیت و قوت سے زیادہ بوجھ ڈالنے کو منع کیا ہے، دوسرے اس کو ایک نوکر کی حیثیت دینا بھی خلاف اسلام بات ہے؛ کیوں کہ بیوی یا گھر کی بہو کوئی نوکر و خادمہ نہیں ہوتی؛ بل کہ وہ گھر میں ایک حصہ دار کی حیثیت سے آتی ہے، یہاں تک کہ اگر وہ ایسے خاندان کی ہو جہاں گھر میں پکوان کے لیے کسی کو خادم رکھا جاتا ہو، تو اس پر اپنے شوہر کے لیے بھی پکوان واجب نہیں ہے؛ بل کہ خود شوہر پر واجب ہے کہ وہ اس کے لیے کھانے کا نظم کرے۔ پھر کمی بیشی کو برداشت نہ کرنا بھی ایک ظلم کی بات ہے کہ بشری تقاضے سے کچھ نہ کچھ اونچ نیچ تو ہوتی ہی ہے؛ خصوصاً جب کہ وہ کام خود اس کے ذمے نہ ہو، تو اس پر پکڑ ایک قانونی و اخلاقی جرم ہے۔ لیکن لوگ ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور عورتوں سے وہ سلوک کرتے ہیں، جو جاہلی دور کی یاد تازہ کرتا ہے۔

لہٰذا ضرورت ہے کہ اسلام کی معاشرتی تعلیم کا بھی ہر مسلمان مطالعہ کرے اور اسوۂ نبوی کی روشنی بھی حاصل کرے اور اس کے مطابق زندگی کرے؛ تاکہ خود بھی سکون پائے اور دوسروں کو بھی سکون دے۔

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ ایک درسِ عبرت

اسلام کے فضائل ومناقب اوراس کے کمالات وخصوصیات کا کوئی اندازہ لگانا چاہے، تو اس پر غور کر لے کہ اس کی ابتداء سے انتہاء تک کتنے خونوں اور جانوں کی قربانیاں اس کے لیے دی گئیں، ایک بزرگ نے بڑی عجیب بات ارشاد فرمائی:

> ’’دنیا کے ایک مشہور مذہب (عیسائیت کو) ایک خون پر ناز ہے، جب کہ اسلام کی تاریخ کو دیکھو، تو یہاں خون ہی خون نظر آئے گا۔‘‘

حضرت سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے اسلاف کے طریقے پر حق کے لیے جان کی بازی لگادی اور راہ حق میں قربان ہوگئے، حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ مختلف پہلوؤں سے عبرت کا سبق دیتا ہے اور لوگوں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔

مگر سب سے زیادہ روشن وواضح پہلو، جو ایک حق پرست انسان کو بہت ہی متأثر کرنے والا اور سخت دل انسان کو بھی جذبات سے لبریز کر دینے والا ہے، وہ ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا حق پر استقامت کے ساتھ جم جانا اور باطل کے ساتھ ٹکرا جانا، حالات کی نزاکت، بے سروسامانی، افراد کی قلت وکمی، کوئی بھی مانع حضرت حسینؓ کے قدموں کو حق کی راہ میں چلنے سے نہ روک سکا، نیز باطل کی ظاہری شان وشوکت ہو، حکومت کا کرّ وفر ہو، افرادی قوت کی فراوانی ہو، مال ودولت کی ریل پیل ہو، کسی بھی چیز نے باطل سے اتفاق وہم آہنگی پر ان کو نہیں ابھارا، پھر دشمن کی دھمکیوں، بے دردوں کی ایذاؤں وتکلیفوں، درندہ نما انسانوں کی طرف سے کھانے اور پانی پر بندشوں نے بھی ان کے پائے استقامت میں رتی برابر جنبش نہیں پیدا کی۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کچھ چیزوں کو مانع اور رکاوٹ سمجھ کر لوگ حق کی راہ میں چلنے سے گریز کر جاتے ہیں اور بعض لوگ حرص ولالچ کا شکار ہو کر حق سے روگردانی کر لیتے ہیں اور بعض اوقات حق کے علمبردار کسی زبردست حکومت و طاقت کی طرف سے خوف ودہشت میں مبتلا ہو کر حق کا ساتھ چھوڑ بیٹھتے ہیں، حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا یہ واقعہ ان کی حیرت انگیز استقامت کا بین ثبوت ہے کہ ان کو نہ تو اسباب ووسائل کی کمی اور دیگر موانعات نے راہِ حق سے روکا، نہ حرص ولالچ ان کو گرفتار کر سکی اور نہ خوف ودہشت ان کے پائے استقلال کو جنبش دے سکی، اس سے دین وحق پر استقامت واستقلال کا سبق ملتا ہے۔

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے واقعے کا ایک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے جس بات کو حق سمجھا، اس کا بھرپور ساتھ دیا اور اس سلسلے میں انھوں نے اپنی جان کی بھی کوئی پرواہ نہ کی، اس سے حق کے لیے مرمٹنے اور جان دینے کا سبق ملتا ہے، کیوں نہ ہو جب کہ آپ جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا کے صاحبزادہ اور نورِ نظر تھے، ان کو حق پر جان دینا، اور اس کے لیے مرمٹنا سکھایا گیا تھا، ان کی گھٹی میں ڈالا گیا تھا اور اسی پر ان کی تربیت ہوئی تھی، عموماً لوگ حق کا ساتھ اس وقت دیتے ہیں جب کہ ماحول سازگار ہو، یا کوئی خطرہ نہ ہو، یا کوئی مفاد متعلق ہو، حضرت حسینؓ کی زندگی کا یہ انوکھا اور حیرت انگیز واقعہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم حق کے علمبردار ہو، حق کے پرستار ہو اور حق کے وفادار ہو تو آؤ! میری طرح حق کی راہ میں ہر چیز لٹا دو، جان ہو یا مال ہو، یا آل واولاد ہو، گھر بار ہو، حق کے مقابلے میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں، حق کے مقابلہ میں ان میں سے ہر چیز کو قربان کیا جا سکتا ہے، لیکن ان تمام چیزوں کے مقابلے میں بھی حق کو قربان نہیں کیا جا سکتا، حق کو کیا؟ حق کے کسی ادنیٰ جزء کو بھی قربان نہیں کیا جا سکتا۔ حق اگر زندہ ہے، تو تم زندہ ہو اور حق زندہ نہ ہو، تو تمہارا وجود بھی کالعدم ہے۔

واقعہ ٔشہادت کا ایک اہم و روشن باب یہ ہے کہ انھوں باطل سے مفاہمت وہم آہنگی، دین وشریعت کے معاملے میں مداہنت کو قطعاً گوارا نہ فرمایا اور واضح کر دیا کہ حق کا باطل سے کوئی رشتہ نہیں، حق و باطل کا اجتماع واتحاد ممکن نہیں اور باطل کے سامنے حق کے سرنگوں ہونے کا کوئی جواز نہیں، جانیں کٹ سکتی ہیں، خاندان مٹ سکتا ہے، بیویاں بیوہ ہوسکتی ہیں، بچے یتیم کیے جاسکتے ہیں، مال ودولت ہلاکت کے گھاٹ اتر سکتے ہیں، سب گوارا، سب روا؛ مگر باطل کے آگے حق جھک جائے یہ قطعاً روا نہیں، قطعاً گوارا نہیں۔

ایک مؤمن کا جذبہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ حق کو سربلند دیکھے اور باطل کو سرنگوں دیکھے، وہ بے تاب ہو اس کے لیے کہ باطل کی اینٹ سے اینٹ بجادے، وہ بے قرار ہو اس کے لیے کہ حق کی رونق عام ہو اور باطل دب جائے، حضرت سیدنا حسینؓ کے واقعۂ شہادت نے مؤمن کے اسی کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔

بعض لوگ ہمیشہ اتحاد کی دعوت دیتے ہیں، خواہ وہ کفر سے ہو یا فسق وفجور سے ہو، یا باطل سے ہو، ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہر اتحاد، پسندیدہ نہیں اور نہ ہر اختلاف برا ہے، جو اتحاد حق کے ساتھ ہو، وہ اچھا ہے اور جو اختلاف باطل کے ساتھ ہو، وہ بھی اچھا ہے اور وہ اتحاد جو باطل کے ساتھ ہو اور جو اختلاف حق کے ساتھ ہو وہ دونوں مذموم وناپسندیدہ ہیں؛ اس لیے مؤمن حق کے ساتھ تو اتفاق واتحاد کر سکتا ہے؛ لیکن کسی باطل وغلط چیز کے ساتھ وہ کبھی مفاہمت وموافقت نہیں کر سکتا۔!!

غرض حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ، اپنی نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے جس طرح عجیب وحیرت انگیز ہے، اسی طرح سبق آموز ہونے اور عبرت خیز ہونے کے لحاظ سے بھی اپنے اندر انفرادیت رکھتا ہے، وہ حق کے لیے کام کرنے، مرجانے، مٹ جانے کے لیے ابھارتا ہے، باطل سے ٹکرانے اور اس کو نیست ونابود کر دینے کے لیے آمادہ کرتا ہے، حق وباطل میں امتیاز وتشخص باقی رکھنے کی تعلیم دیتا ہے، لالچ اور حرص یا خوف ودھمکی سے متأثر نہ ہونے اور ہر صورت میں اپنے موقف حق پر ڈٹے رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔

قرآن فہمی کے نام پر

ارباب دین واہل علم ودانش حضرات کو دعوت فکر

جدید تعلیم یافتہ طبقے میں آج کل یہ بات دیکھنے میں آرہی ہے کہ وہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں، جو بہت ہی خوش آئند بات ہے؛ کیوں کہ قرآن وحدیث کے بغیر مؤمن کی زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا اور قرآن وحدیث کا سمجھنا اس کے لیے لازم وضروری ہے؛ لیکن اس کے ساتھ اس طبقے میں ایک عجیب وحیرت انگیز بیماری یہ ہے کہ وہ قرآن سمجھنے کے لیے کسی اصول وضابطے اور کسی طریقے وسلیقے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا؛ اس لیے عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ قرآن فہمی کے لیے یا تو خود کچھ مطالعہ کرلینے کو کافی سمجھتے ہیں یا ان لوگوں سے حاصل کرتے ہیں، جن کو خود اس میں کوئی کمال ومہارت نہیں؛ بل کہ وہ اس کی الف با بھی نہیں جانتے۔

چناں چہ مختلف مقامات پر دین سے دور، علم سے دور، عربی زبان کی نزاکتوں سے نابلد لوگ ''قرآن فہمی'' کے ادارے اور مدارس کھولے بیٹھے ہیں اور باقاعدہ فیس لے کر ''قرآن فہمی'' کے نام سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں اور ان کے پاس یہ جدید ذہنیت کے لوگ اس مقصد کی تحصیل کے لیے جارہے ہیں اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگ ''قرآن فہمی کورس'' جاری کرکے یہ دعوی بھی کرتے ہیں کہ تیس دنوں یا بیس دنوں میں قرآن فہمی کا یہ کورس وہ پورا کرادیں گے اور پھر وہ قرآن سمجھنے لگیں گے اور ان کورسوں میں بھی یہی جدت پسند طبقہ شرکت کرکے حق قرآن فہمی ادا کرتا ہے۔

اس سلسلے کا سب سے زیادہ حیرت انگیز وافسوس ناک پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ ایسے کورسس میں عموماً درس دینے والے و دینے والیاں فیشنبل طرز کے لوگ ہوتے ہیں، جن کی زندگیاں دینداری سے خالی اور مغربیت زدہ ہوتی ہیں، پردہ کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں، حتی کہ نمازوں کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں، لباس و پوشاک وطرز زندگی مغرب پسندی وتجدد پسندی کا پورا مظہر ہوتا ہے۔

جہاں تک قرآن فہمی کا ذوق وشوق یا جذبہ ہے، یہ بلا شک وشبہ قابل قدر ولائق تحسین ہے؛ لیکن ان لوگوں کی یہ دوسری صورت حال کہ قرآن فہمی کے لیے نہ کوئی اصول ہے نہ سلیقہ، یہ بات اسی قدر افسوس ناک و قابل رد ولائق تردید بھی ہے اور حیرت در حیرت وافسوس در افسوس پر ہے کہ یہ ''عقل پرست'' حضرات اور ''روشن دماغ'' لوگ عقل کے بالکل خلاف اس بات کو تسلیم بھی کر جاتے ہیں کہ قرآن فہمی کی دولت ''تیس یا بیس دن'' میں مل جائے گی۔ اس کو بھولا پن کہا جائے یا کوئی اور نام دیا جائے؟

کیوں کہ ہر کوئی یہ جانتا ہے کہ قرآن کریم خالص عربی زبان میں ہے اور اس کو براہ راست سمجھنے کے لیے عربی زبان سے واقفیت لازم وضروری ہے اور پھر قرآن کریم کے مضامین کو سمجھنے کے لیے اسلامی علوم سے واقفیت بھی لابدی امر ہے اور یہ سب ایک معتد بہ حصہ اپنے اوقات کا صرف کرنے سے حاصل ہوتا ہے، اس کے بغیر قرآن فہمی کا کوئی مطلب ومعنی نہیں ؛ مگر یہ طبقہ ان سارے اصول وطریقوں کو خیر باد کہہ کر قرآن سمجھ لینا چاہتا ہے؛ حتی کہ بعض جگہ لڑکیاں جو یہ تیس دن یا بیس دن کا کورس ختم کی ہوئی ہیں، وہ بھی قرآن فہمی کی مجالس کا انعقاد کر رہی ہیں اور وہاں بھی یہ طبقہ بہ شوق ورغبت داخلہ لے کر قرآن فہمی کا دعویٰ کرتا جا رہا ہے۔

اگر ان حضرات کو واقعی قرآن فہمی کا ذوق ہے، تو قرآن کے ماہرین کے پاس کیوں نہیں جاتے اور ان سے باقاعدہ کیوں نہیں سیکھتے؟ بات یہ ہے کہ اس طبقے میں علماء بیزاری اور علماء سے نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور یہ لوگ جاہلوں سے تو حاصل کرنا گوارا

کرتے ہیں؛لیکن علماء کے پاس جانے میں اوران کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے میں عارمحسوس کرتے ہیں؛اس لیےان کے پاس نہیں جاتے اور جاہلوں کے پاس جاتے ہیں۔

پھر جب ان کواس سے روکا یااس پرٹوکا جاتا ہے کہ قرآن ایسا سستا نہیں کہ جاہلین اس کا درس دیا کریں اور ناواقف لوگ اس میں دخل دیتے ہوئے اس کی تفسیر بیان کریں،تو اس پران ''عقل پرست'' اور ''جدت پسند'' حضرات کا جواب یہ ہوتا ہے کہ قرآن سب کے لیے ہے،صرف علماء کے لیے نہیں اور اللہ نے اس کوآسان بنایا ہے؛لہٰذا اس کے سمجھنے کے لیے علماء کی کیا ضرورت ہے؟ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنا سب مسلمانوں کا مشترکہ حق ہے، اس لیےعلماءقرآن وحدیث کے ٹھیکے دار نہیں ہیں۔

جہاں تک ان کےاس نظریے کاتعلق ہے کہ قرآن سب کے لیے ہےاورآسان ہے،تو سب سے پہلے میں ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ پھرآپ لوگ جاہلین کے کیوں محتاج ہوتے ہیں؟ جب علماء کی ضرورت نہیں،تو جاہلوں کی ضرورت آپ کو کیوں ہےاورروپیہ دیکرکورس کو پڑھتے ہیں؟ وہاں یہ جواب کیوں نہیں دیتے کہ جب ہمیں علماء کی ضرورت نہیں،توان لوگوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز علماء بیزاری ہے،جس کی وجہ سے یہ لوگ علماء سے کتراتے ہیں، ورنہ ان کو یہ مسلم ہے کہ قرآن آسان ہونے کے باوجود کسی کو استاد بنانے کی ضرورت ہے۔

دوسرے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کسی چیز کے آسان ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کے لیے کسی کواستاد ورہبر بنانے کی حاجت نہیں،مثلاً ایک استاداپنے طلبہ سے کہتا ہے کہ علم سے گھبرانے کی ضرورت نہیں،علم کا حصول آسان ہے، دنیا میں کتنے لوگوں نے اس کو حاصل کیا اور دنیا میں معزز ہوئے،تو کیا اس بات سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے کسی استاد کی ضرورت نہیں؟ اگر کوئی اس سے یہ سمجھتا ہو یا نتیجہ نکالتا ہو،تو اس کو اپنی عقل کا ماتم کرنا چاہیے؛ کیوں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ جب علم کوعلم حاصل کرنے کے اصول و طریقے سے حاصل کیا جائے گا،تو وہ آسان ہے؛لہٰذا یہ کہنے سے کہ ''قرآن کریم آسان ہے

''یہ سمجھنے کی غلطی نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے لیے علماء سے سیکھنے کی ضرورت نہیں۔

تیسرے یہ کہ ایک چیز ایک لحاظ سے آسان اور ایک دوسرے لحاظ سے مشکل ہوسکتی ہے ؛ لہذا قرآن کا آسان ہونا اس لحاظ سے ہے کہ اس میں عبرت ونصیحت کی آیات ہیں، جنت وجہنم کے احوال ہیں، اخلاق حمیدہ ونیکی وطاعت کی ترغیب ہے اور اخلاق رذیلہ و معصیت سے زجر وتوبیخ ہے، مختلف قوموں وملتوں اور افراد واشخاص کے گزرے ہوئے سبق آموز حالات وعبرت انگیز واقعات ہیں، یہ امور آسان ہیں، ان میں کسی معتبر ترجمے کی مدد سے بہ آسانی عبرت حاصل کی جاسکتی ہے ؛ لیکن ایک اور لحاظ سے دیکھا جائے، تو قرآن مشکل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں احکام وقوانین سے متعلقہ آیات، عقائد اسلام ومختلف انسانی احوال کے متعلق جلی وخفی معاملات سے متعلقہ آیات بھی ہیں۔ اور یہ حصہ ہر ایک کے بس کا نہیں ؛ بل کہ یہاں علمی تبحر اور دینی مہارت کے بغیر کام نہیں چلتا۔

الغرض یہ بات کہ قرآن آسان ہے، اپنی جگہ صحیح ہے ؛ مگر اس سے وہ نتیجے جو ان لوگوں نے اخذ کیا ہے اور اس کے ذریعے وہ لوگوں میں غلط فہمی پیدا کرتے ہیں، یہ محض ناواقفیت و سطحیت اور وہی قرآن فہمی سے محرومی کا نتیجہ ہے۔

اب رہا ان لوگوں کا یہ کہنا کہ قرآن فہمی سب کا حق ہے ؛ لہذا علماء قرآن وتفسیر کے ٹھیکے دار نہیں ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص میڈیکل سائنس سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو اور نہ کبھی کسی میڈیکل کالج میں داخلہ لیا ہو، وہ کہنے لگے کہ علاج معالجہ کرنا سب کا حق ہے ؛ لہذا ڈاکٹروں نے اس پر کیوں اجارہ داری کر لی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض کسی بھی عقل مند کے نزدیک معقول نہیں سمجھا جائے گا ؛ بل کہ انتہائی احمقانہ سمجھا جائے گا، اسی طرح جس نے قرآن وحدیث کے علوم سے واقفیت معتبر طریقوں سے نہ پائی ہو اور کسی سند یافتہ استاد سے تفسیر کے اصول نہ سیکھا ہو، وہ اگر یہ کہتا ہے کہ تفسیر کا حق مجھے بھی ہونا چاہیے، صرف علماء ہی کو کیوں یہ حق ہے، تو وہ انتہاء درجے کی احمقانہ بات کرتا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ علماء قرآن کے ٹھیکے دار تو نہیں ہیں ؛ لیکن قرآن وحدیث کے علوم

کے پہرے دار ضرور ہیں؛ تاکہ ان میں کوئی جاہل و اناڑی اور ناقص قرآن و حدیث کی غلط تشریح و تفسیر کر کے دین کو بگاڑ نہ دے اور دین کے حقائق کو مسخ نہ کر دے۔ جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے کہ نہ عربی سے صحیح واقفیت، نہ علوم شرعی سے کوئی تعلق، حتی کہ اسلامی عقائد تک کا صحیح پتہ نہیں؛ مگر قرآن کی تفسیر کرنے یا اس کو پڑھانے کا شوق ہو گیا اور دین کا بیڑا غرق کیا جانے لگا۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو، تو علماء کبھی خاموش نہیں رہ سکتے؛ کیوں کہ وہ اسلام کے پہرے دار ہیں، وہ اگر یہاں خاموش رہیں، تو اللہ کی پکڑ میں آجائیں۔

مجھے یہاں علامہ اقبال رحمہ اللہ کا واقعہ یاد آرہا ہے، جو ایسے لوگوں کے لئے بڑا عبرت خیز ہے:

وہ یہ کہ ایک کالج کے پروفیسر کو تفسیر قرآن لکھنے کا شوق ہوا، جب تفسیر لکھ دی، تو خیال ہوا کہ اس کی کوئی تصدیق کر دے، تو بات بنے گی، مگر علماء کے پاس جاؤں گا، تو وہ میری غلطیوں کو اور تفسیر بالرائے کو نہیں بخشیں گے، وہ ضرور اس کا رد کر دیں گے؛ لہذا خیال ہوا کہ علامہ اقبال جو عالم نہیں ہیں؛ مگر اسلام کے شیدائی ہیں، ان سے اس تفسیر کی تصدیق کرا لوں گا؛ تاکہ لوگوں میں قابل اعتماد ہو جائے؛ چناں چہ وہ علامہ کی خدمت میں گئے اور وہ تفسیر ان کو پیش کی اور تصدیق کی گزارش کی، علامہ نے کہا کہ اب رکھ جانا پھر بعد میں آنا کہ میں وقت فرصت دیکھوں گا۔ وہ صاحب اپنی یہ تفسیر رکھ کر واپس چلے آئے اور دو ماہ کے بعد گئے اور خیال یہ تھا کہ علامہ مجھے دیکھتے ہی اس تفسیر کی تعریف بیان کریں گے؛ مگر علامہ اقبال نے اس بابت کوئی بات ہی نہیں چھیڑی، جب دیکھا کہ وہ خود تو اس بارے میں کچھ نہیں فرماتے ہیں، تو ان جدید مفسر نے پوچھا کہ جناب! میں نے آپ کو میری لکھی ہوئی تفسیر دیکھنے کے لیے دی تھی، اس کا کیا ہوا؟ علامہ نے کہا کہ آپ کی تفسیر دیکھنے سے میری ایک بہت بڑی غلط فہمی دور ہو گئی، پہلے میرا خیال یہ تھا کہ سب سے زیادہ مظلوم اس کائنات میں حضرت حسین کی ذات گرامی ہے؛ مگر آپ کی تفسیر دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ سب سے زیادہ مظلوم تو اللہ کا قرآن، جس پر ہر ایک مشق ستم کرتا رہتا ہے، کوئی پروفیسر، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، جب کچھ

دین کا کام کرنا چاہتا ہے، تو قرآن ہی کو تختۂ مشق بناتا ہے۔

ایسے واقعات علامہ اقبال کے زمانے میں جس قدر پیش آئے ہوں گے، ان کے مقابلے میں آج اس سے زیادہ پیش آتے جارہے ہیں اور افسوس تو یہ ہے کہ ان کے پیچھے وہ لوگ چل رہے ہیں، جو خود کو روشن ضمیر و عقل و دانش میں باکمال سمجھتے ہیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر میں ارباب دین و اہل علم و دانش حضرات کو دعوت غور و فکر دیتا ہوں کہ وہ اس پر غور کریں کہ دین و علوم دین کے ساتھ کس طرح کا مذاق کیا جارہا ہے اور علماء بیزاری کا کس طرح مظاہرہ کیا جارہا ہے اور لوگوں کو تفسیر و قرآن فہمی کے نام سے کس طرح راہ اعتدال سے ہٹا کر دین سے اور اہل دین سے بدظنی میں مبتلا کیا جارہا ہے؟ پھر اس کے تدارک کی سبیل پیدا کی جائے۔

مدارس کے چندے میں بے اصولی اور اس کے نتائج

اہلِ مدارس کی توجہ کے لیے

مدارس اسلامیہ کی ضرورت اہل عقل و دانش کے نزدیک مسلمات میں سے ہے اور ان کے بقاء و تحفظ کی سبیلیں پیدا کرنا اور اختیار کرنا ایک فرض ہے اور ان سبیلوں میں سے ایک سبیل وہ ہے، جس کو سنت رسول ہونے کی وجہ سے عالمگیر حیثیت حاصل ہے یعنی عوام وخواص اہل اسلام سے ان کی حیثیت چندہ جمع کرنا، مگر اس سلسلے میں ایک اہم پہلو کی جانب توجہ دینا ضروری ہے، وہ یہ کہ آج کل بعض اہل مدارس چندہ کرنے کی ایسی صورتیں اختیار کرتے ہیں، جس سے علم دین اور علمائے دین کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے اور علم وعلماء کی ذلت و رسوائی ہوتی ہے؛ کیوں کہ عام طور پر یہ لوگ چندہ وصول کرنے میں نہایت بے غیرتی کا مظاہرہ کرتے ہیں ، مالداروں و دنیاداروں سے تملق و چاپلوسی اور ان کی خوشامد کرتے پھرتے ہیں، حرام کمائی والوں سے بھی وصول کرتے ہیں، حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں کرتے ، ذلت و دنائت والا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

ایسے ہی ایک صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے:

> ’’ایک جگہ ایک مدرسہ تھا، اس کے جلسے میں ایک واعظ نے صاحب فرمارہے تھے کہ افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر اگر ایک کسبی ناچتی تو لوگ اس کو کس قدر دیتے، ہمیں ایک کسبی کے برابر بھی نہیں سمجھتے کہ گھنٹے بھر سے ہم

مانگ رہے ہیں اور کوئی کچھ نہیں دیتا' افسوس اس واعظ کو بیان کرتے ہوئے غیرت بھی نہ آئی۔''

(خطبات حکیم الامت: ۸/ ۴۳۹)

اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے مولویوں کی دیکھنے والے، ایک جانب علماء سے بدظنی کا شکار ہوتے ہیں اور دوسری طرف مدارس؛ بل کہ علم دین سے بھی بے زار ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ سارے علماء اور سارے مدارس ایسے ہی ہوتے ہیں ، اگر چہ کہ ان لوگوں کی یہ غلطی ہے اور سخت قسم کی غلطی ہے؛ کیوں کہ چند اس قسم کے لوگوں کو دیکھ کر سارے علماء اور سارے مدارس سے بدظن ہونا ایسا ہی ہے جیسے بعض دھوکہ باز ڈاکٹروں یا وکیلوں کو دیکھ کر سارے ڈاکٹروں اور وکیلوں کو غلط کار و دھوکہ باز سمجھ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بے انصافی کی بات بھی ہے اور سخت قسم کی بھول بھی؛ لیکن یہاں روئے سخن ہمارا ان علماء و مولویوں یا صحیح لفظوں میں مولوی نما لوگوں کی جانب ہے، جن کی ان بے جا حرکتوں و بے اعتدالیوں کے نتیجے میں علم و علماء کی توہین و تذلیل ہو رہی ہے۔

اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے، جس کو حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''ایک تحصیل دار صاحب تھے، ایک طالب علم کا کھانا ان کے ہاں مقرر تھا، وہ طالب علم روزانہ کھانا لینے کے واسطے آیا کرتا تھا اور کھانے میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی، تو ان کا خالی وقت بے کار جاتا تھا۔ انھوں نے تحصیل دار صاحب سے ایک دل سوزی سے کہا کہ میں روزانہ اتنی دیر بے کار رہتا ہوں اور آپ کا لڑکا بھی کھیلتا پھرتا ہے، اگر آپ کہیں، تو میں اتنی دیر آپ کے لڑکے کو کچھ عربی پڑھا دیا کروں۔ تحصیل دار صاحب نے فرمایا کہ مولانا کیا ہوگا، آپ نے پڑھ کر کیا کیا؟ دروازے پر بھیک مانگنے آتے ہیں اور یہ پڑھ کر آپ کے دروازے پر بھیک مانگنے جائے گا۔'' (خطبات حکیم الامت: ۸/ ۴۳۸۔۴۳۹)

لہٰذا اہل مدارس کو چندے کے سلسلے میں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ ہم مدرسے کو مقصود بنانے کے بجائے علم و تعلیم اور دین و شریعت کو مقصود بنائیں۔ اور اگر مدرسہ ہی مقصود سمجھ لیا اور ٹھہرالیا جائے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیاداروں کی طرح حلال وحرام کی تمیز کے بغیر اور ذلت و رسوائی کی صورتوں کے ساتھ بھی چندہ وصول کیا جائے گا؛ حالاں کہ مدارس مقصود نہیں ؛بل کہ دین و علم ودین کے لیے یہ ایک وسیلہ وذریعہ ہیں۔ اگر دین مقصود ہوگا، تو ہم مدرسے کی خاطر دین کے اصول کو نہیں توڑیں گے۔

یہاں اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے اس سلسلے میں وہ ملفوظات نقل کردینا مناسب ہے، آپ نے اپنے وعظ ''شفاء العی'' میں فرمایا:

> ''اسی طرح احکام کی تحقیق نہ ہونے سے چندہ جمع کرنے میں اس کی رعایت بالکل نہیں ہوتی کہ خوشی سے دے رہا ہے یا بغیر........ دین کے لیے چندہ کی غرض رضائے خداوندی ہے اور جب نصیب ہوتی ہے کہ قواعد شرعیہ کے موافق کام کیا جائے، ورنہ بجائے رضائے باری تعالیٰ کے غضب الٰہی کا اندیشہ ہے۔''

(خطبات حکیم الامت: ۲۱/ ۱۶۷)

آپ نے ایک وعظ ''تاسیس البنیان'' میں فرمایا:

> ''پس یادرکھو کہ بڑی چیز دین کی محبت اور عزت ہے، علماء کو دین کی عزت کا لحاظ رکھنا چاہیے، جس میں ان کی بھی عزت ہوگی اور دین کی عزت استغناء میں ہے، علماء دنیاداروں سے جب تک استغناء نہ کریں، اس وقت تک ان کی عزت نہ ہوگی اور جب علماء استغناء کریں گے، اسی وقت عزت وعظمت رونما ہوگی؛ مگر آج کل تو علماء نے اپنی قدر کھودی ہے کہ دنیاداروں کے دروازوں پر جاتے اور کھانا لاتے ہیں۔''

(خطبات حکیم الامت: ۸/ ۴۳۸)

یہ ساری مصیبت اس لیے ہے کہ دین وعلم دین کو مقصود نہیں بنایا جاتا اور اللہ کے بھروسے کام نہیں کیا جاتا؛ لہٰذا مدارس کی انتظامیہ کو یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مدرسہ اللہ پر توکل کی بنیاد پر چلتا ہے؛ اس لیے انہیں صرف توکل علی اللہ کا سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، جب اللہ پر بھروسہ ہوگا، تو اللہ تعالیٰ غیب سے انتظام کریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ﴾ (جو اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہیں)

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے جب دار العلوم قائم کیا، تو یہی فرمایا تھا کہ یہ مدرسہ توکل علی اللہ کی بنیاد پر چلایا جائے، ورنہ اس کی خیر نہیں۔ تاریخ دار العلوم میں ہے کہ ''جب بنیاد رکھی جا چکی، تو حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ '' عالم مثال میں اس مدرسے کی شکل ایک معلق ہانڈی کے کے مانند ہے، جب تک اس کا مدار توکل علی اللہ اور اعتماد علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔

اس واقعے کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ نے ذیل کے اشعار میں نظم کیا ہے:

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لیے
کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ
یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا
ہے توکل پر بنا اس کی تو بس اس کا تو معین
ایک گر جائے گا پیدا دوسرا ہو جائے گا

(تاریخ دار العلوم دیوبند: ۱/۱۸۴)

یہاں اکابرین کے بعض واقعات کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جن سے توکل علی اللہ کی برکات سامنے آتی ہیں:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’کانپور میں جب میں پڑھاتا تھا، تو مدرسے کی مسجد میں طلباء کے لیے ایک حوض تیار کرانے کی ضرورت ہوئی اور روپیہ نہیں تھا اور کسی سے چندہ مانگنے کو طبیعت نے گوارہ نہ کیا۔ بس میں نے مدرسے والوں سے کہا کہ تم اپنے اختیار کا کام کردو اور ایک جگہ متعین کر کے گڑھا کھدوا دیا گیا اور چھوڑ دیا گیا، لوگ دریافت کرتے کہ یہ کیا ہے؟ ہم کہتے کہ حوض ہے، جتنی ہمارے اندر طاقت تھی اور جتنا سامان ہمارے پاس تھا، اتنا ہم نے کرلیا آگے اللہ تعالیٰ مالک ہے، دو ایک دن تو یوں ہی پڑا رہا، اس کے بعد ایک دن محلّہ میں ایک بڑی بی نے مجھ کو اپنے گھر بلایا اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ ایک حوض تجویز ہوا ہے، اس کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟ میں نے کہا کہ جتنا کام ہمارے اختیار میں تھا، اتنا کرا دیا ہے، کہنے لگیں کہ کیا تخمینہ ہے، میں نے کہا کہ پانچ سو رپے، کہنے لگیں کہ میں دوں گی، میرے سوا کسی کا روپیہ نہ لگے۔ اب لوگ اور بھی آنے شروع ہوگئے کہ صاحب ہمارے پانچ روپئے قبول کیجیے، میں نے کہا کہ ایک بی بی نے ایسا کہہ دیا ہے، ہاں ایک سائبان کی تجویز ہے کہ اس کے اوپر ڈالا جائے، کہنے لگے کہ تو پھر ہم اسی کے لیے دیتے ہیں؛ چناں چہ حوض بھی تیار ہوگیا اور سائبان بھی تیار ہوگیا۔‘‘

(القول الجلیل:۲۲)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’مولانا گنگوہی کے یہاں حدیث کے دورے میں ستر ستر طالب ہوتے تھے، ان کا کھانا بھی کپڑا بھی ہوتا تھا؛ مگر کوئی فکر ہی نہیں، نہ چندے کی تحریک کی، نہ کبھی کسی سے فرمایا، ایک کمرہ بھی نہیں بنوایا، نہ وہاں چندہ تھا نہ کچھ تھا، پھر بھی وہاں خندہ ہی خندہ ہے۔‘‘

(حسن العزیز ۱/ ۵۰۹)

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کے مدرسہ ''جامعہ مفتاح العلوم'' جلال آباد میں آج بھی کوئی مستقل سفیر نہیں ہے اور نہ کہیں اس کے چندے کا اعلان واشتہار ہوتا ہے، شروع دور میں مدرسے کا چندہ اساتذہ کے ذریعے کیا جاتا تھا؛ مگر بعد میں حضرت نے چندے کا سلسلہ بند کردیا؛ مگر اس کے باوجود توکل کی برکت سے مدرسہ بلا کسی تنگی وپریشانی کے قائم ودائم ہے اور مدرسے کی تمام ضروریات پوری ہورہی ہیں۔ایک مرتبہ حضرت کی وفات کے بعد میری جلال آباد حاضری ہوئی اور حضرت کے صاحبزادے حضرت مولانا صفی اللہ صاحب دامت برکاتہم ، جو بھائی جان کے نام سے معروف ہیں اور میرے استاذ بھی ہیں، ان کی خدمت میں حاضری ہوئی، درمیان گفتگو میں فرمایا کہ مولوی صاحب! الحمدللہ مدرسے میں بڈھے (مراد حضرت مسیح الامت ہیں) کی برکت سے اتنا مال آرہا ہے کہ اگر آج سے ایک پیسہ بھی نہ آئے، تب بھی مدرسہ دس سال تک اسی طرح چل سکتا ہے۔

اس سے توکل کی برکات صاف اور واضح طور پر سمجھ میں آتی ہیں ؛لہٰذا ہمیں بھی بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اصلاً توکل علی اللہ ہی کو مدارس کے لیے اصل سرمایہ سمجھنا چاہیے، باقی تدبیر کے طور پر حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے باوقار طریقے پر چندہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

یہاں ایک بات کی جانب اہل مدارس کو توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب مدارس اسلامیہ کے چندے کا اعلان ہوتا ہے، تو اس طرح اعلان کیا جاتا ہے:

> ''مدرسے میں اتنے غریب ویتیم بچے پڑھتے ہیں اور ان کے لیے کھانے پینے وغیرہ کی ضروریات کو پورا کرنا ہے، جو آپ لوگوں کے چندوں سے پورا کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اس مدرسے کی امداد کریں''

یعنی مدرسے کا اعلان غربت کے حوالے سے کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مدرسے کا اعلان دین وعلم دین کے تحفظ وبقاء کے حوالے سے کیا جاتا اور لوگوں کو یہ بتایا جاتا کہ یہ دینی مدارس دنیا میں علوم اسلامیہ کے سرچشمے، دین وعلم دین کے بقاء کا سامان

،مسلمانوں کی دینی وشرعی ضرورتوں کے مراکز اور سب سے بڑھ کر ملت اسلامیہ کی شان وبان وآن ہیں؛لہٰذا ان کا تحفظ وبقاء اوران کی ترقی وتطویر میں حصہ لینا اہل اسلام کی ایک اجتماعی ذمے داری ہے۔اعلان تو اس طرح ہونا چاہیے؛مگر جو اعلان غربت کے حوالے سے کیا جاتا ہے،غور کیجیے کہ اس طرز کا اعلان کا کیا اثر رونما ہوتا ہے؟واقعہ یہ ہے کہ اعلان کا یہ انداز لوگوں کی نظر میں مدرسے کو ایک غریب خانے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور عوام الناس یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مدارس دراصل غریب خانے ہیں،جس کی حیثیت یتیم خانے کی ہے،جس کو کھانا میسر نہ ہو،جس کو کپڑے میسر نہ ہوں،جس کو دنیا کمانا نہ آتا ہو،اس کے لیے اس کے پاس اسباب نہ ہوں،وہ مدرسے میں آئے گا اور ہمارے دیے ہوئے صدقات وخیرات سے اپنی غربت کا علاج کرے گا،پھر اسی تصور وخیال سے ایک اور ذہنیت پیدا ہوتی ہے،وہ یہ کہ مدارس صرف غریبوں اور محتاجوں،یتیموں کے لیے ہوتے ہیں،یہاں مالداروں اور رئیسوں کے بچوں کے لیے کچھ نہیں؛اسی لیے آج مدارس صرف غربت زدہ لوگوں کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں اور مالداروں ورئیسوں کا طبقہ کبھی اپنے بچوں کے لیے مدارس میں بھیجنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔کیوں؟اس کی بہت سی وجوہات میں ایک یہ بھی ہے کہ علمائے مدارس نے خود لوگوں کے سامنے وہ انداز اختیار کیا ہے،جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھنے لگے کہ مدارس غریبوں کے ٹھکانے اور یتیم خانوں کے ہمدوش ہیں۔

غور کیا جائے کہ اس انداز وطریقے نے صرف یہ نہیں کہ مدارس کی حیثیت عرفی وشرعی کو ٹھیس پہنچایا؛بل کہ درحقیقت خود دین کی حیثیت کو مجروح کردیا؛حالاں کہ یہ انداز ایک بھیک منگنے کا تو ہوسکتا ہے،مگر مدارس اسلامیہ جو دین اسلام کے عظیم قلعے کہلاتے ہیں،اس ن کے لیے کیا یہ انداز مناسب ہے؟کیا اس سے لوگوں کے ذہنوں میں مدارس کی عظمت پیدا ہوگی یا ان کی حقارت؟الغرض مدارس کی عظمت وجلالت،ان کے عظیم ترین کام وخدمت کے پیش نظر حضرات علماء کو مدارس اسلامیہ کے چندے کے سلسلے میں انتہائی استغناء کی شان کے ساتھ لوگوں کو متوجہ کرنا چاہیے۔

دین میں غلو کا فتنہ

امت میں بگاڑ کے اسباب میں سے اہم سبب ''غلو فی الدین'' ہے، جس کی وجہ سے شرعی حدود پامال اور مختلف قسم کے غیر شرعی امور جنم لیتے ہیں اور زیادہ تر بدعات کی پیداوار بھی اسی سے ہوتی ہے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ ''غلو فی الدین'' کی بیماری زیادہ تر ان لوگوں میں ہوتی ہے، جو دیندار کہلاتے ہیں یا دین سے وابستہ ہونے کے مدعی ہوتے ہیں اور ان میں افراد بھی شامل ہیں اور جماعتیں بھی داخل ہیں؛ اس لیے اس راہ سے آنے والا بگاڑ گہرائی و گیرائی دونوں طریقوں سے امت میں پھیل جاتا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں غلو کی سخت ممانعت ہے اور قرآن کریم وحدیث رسول میں اس کے دلائل موجود ہیں۔ یہاں صرف ایک ایک دلیل ذکر کی جاتی ہے:

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

(اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور نہ ان لوگوں کی پیروی کرو، جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کر چکے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔)

اور حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یا ان کے بھائی فضل ابن عباس رض روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« یاأیها الناس! إیاکم و الغلو في الدین، فإنه أهلک من کان

قبلكم الغلو في الدين.»

(ابن ماجہ:۳۰۲۹،احمد:۳۲۴۸،معجم کبیر:۱۵۱۴۰،السنۃ لابن ابی عاصم:۹۸)

(اے لوگو!تم دین میں غلو کرنے سے بچو، کیوں کہ تم سے پہلے لوگوں کو دین میں غلو ہی نے ہلاک کیا تھا۔)

مذکورہ آیت کریمہ اور حدیث نبوی سے یہ معلوم ہوا کہ دین میں غلو کرنا ناجائز ہے اور اس کی سخت ممانعت ہے۔

غلو کے معنی ہیں حد مقررہ سے آگے بڑھ جانا اور تجاوز کرنا۔ یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جس میں ہر چیز کی حد مقرر ہے ،خواہ وہ عقیدہ ہو یا عبادت ہو، یا حقوق وآداب ہوں یا معاشرت وتہذیب ہو یا اخلاق وکردار ہو، تمام ابواب میں اللہ ورسول کی بیان کردہ حدیں مقرر ہیں، جن سے تجاوز کرنا ناجائز ہے۔

چناں چہ قرآن میں ہے:

(یہ اللہ کی مقررہ حدیں ہیں، لہٰذا ان کو نہ پھلانگنا اور جو بھی اللہ کی حدوں کو پھلانگتا ہے،تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں۔)

الغرض دین اسلام میں ہر چیز ایک مقررہ حد ومعیار کے ساتھ ہے اور یہی درحقیقت اس کی خوبی وکمال ہے، یہاں کوئی بات بے ڈھنگی اور غیر مرتب نہیں، ہر چیز اپنے ایک حد واصول کے ساتھ میں ہے؛ لہٰذا ان حدود وقیود کو باقی رکھنا لازم وضروری ہے، ان کو پامال کرنا اوران سے تجاوز کرنا حرام ہے۔اور اسی تجاوز کا نام ’’غلو فی الدین‘‘ ہے۔

پھر یہ غلو مختلف صورتوں وشکلوں سے پیدا ہوتا ہے:

(۱)ان میں سے افراط ہے؛ یعنی یہ کہ دین کی مقررہ حدود سے آگے بڑھا جائے، جیسے مثال کے طور پر اسلام نے حضرات انبیا ورسل علیہِم الصّلاۃُ والسّلامُ کی تعظیم وتوقیر کی حدیں مقرر کی ہیں اور ان کو ایک جانب اللہ کا بندہ قرار دیا اور دوسری جانب ان کو ایک عظیم منصب کا حامل بھی بتایا؛ لہٰذا اگر کوئی ان حدود سے تجاوز کرتا ہے اور ان حضرات کو اس منصب

ومقام سے بڑھا کر خدائی صفات ومقام کا حامل بناتا ہے،تو یہ افراط ہے، جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کواور یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کوخدا کا بیٹا قرار دے کر یہی حرکت کی تھی، اسی طرح اگر کوئی حضرات اولیاء اللہ کوان کے مقام سے بڑھاتا اوران کو بھی حاجت روایا مشکل کشااور عالم الغیب مانتااور قرار دیتا ہے، تو وہ یہی افراط ہے، جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اس افراط سے کس قدر بڑی گمراہی پیدا ہوئی اور ہوتی ہے کہ مخلوق کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا جاتا ہے اوراس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے ،جو اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔

چناں چہ آج مزارات اولیاء اللہ پر جا کر دیکھو، اسی غلووافراط نے لوگوں کواولیاء اللہ کی محبت وعقیدت کے نام پر کس قدر گمراہی میں مبتلا کررکھا ہے؟ وہاں سجدے وطواف بھی ہورہے ہیں ،نذرونیاز بھی جاری ہے ،اولیاء اللہ کے لیے مشکل کشائی وحاجت روائی کے مناصب بھی مانے جارہے ہیں، علم غیب وقدرت کی صفات بھی تسلیم کی جارہی ہیں ۔یہ سب کیا ہے؟اسی غلوفی الدین کا نتیجہ ہے، جس نے پچھلی امتوں کو ہلاکت وتباہی کے غار میں ڈھکیلا تھا۔

(۲) دوسری شکل غلو کی تفریط ہے ،اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ورسول نے جوحدود مقرر کی ہیں ،ان میں کمی کی جائے اور چیزوں وشخصوں کے مقررہ درجے سے ان کوگھٹا دیا جائے ، یہ بھی غلو کی ایک شکل ہے، جوکہ حرام ہے ۔جیسے اسلام نے حضرات انبیاواولیاء کا ایک مقام بتایا ہے، حضرات انبیا علیہم الصّلاۃُ والسَّلامُ کومقام نبوت دیا، تواولیاء کومقام ولایت عطا فرمایا ہے؛ لہذا اس مقام سے ان کو گھٹانا ،ان کی تعظیم وتوقیر نہ کرنا ، یاان سے عداوت رکھنا، ان کی مخالفت کرنا، یہ سب تفریط ممنوع میں داخل ہے۔

جیسے یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی نہ مان کر ان کونعوذ باللہ جھوٹا ومکار قرار دیا اور اسی طرح ان کوحرامی کہہ کر ان کی توہین کی اوراسی طرح بہت سے انبیا علیہم الصّلاۃُ

والسّلام کو قتل کیا، ان کو جھوٹا ٹھہرایا، ان کی ہجو کی، یہ ان کے مقام میں تفریط وکمی کرنا جو کہ حرام ہے۔

اسی طرح کوئی شخص اللہ کے سچے ولیوں و سچے عالموں کی توہین وتذلیل کرتا ہے یا ان کو تکلیف پہنچاتا ہے، ان کی شان میں گستاخی کرتا ہے، تو یہ بھی وہی تفریط حرام ہے۔

(۳) تیسری صورت غلو فی الدین کی یہ ہے کہ دین میں نئی نئی باتیں پیدا کی جائیں اور یہ بھی کئی طرح سے ہوتا ہے:

ایک یہ کہ نئی عبادت پیدا کر لی جائے، جیسے بعض لوگوں نے رجب یا شعبان کی ایک نماز ایجاد کر رکھی ہے۔ یا ربیع الاول میں میلا دو ربیع الثانی میں گیارھویں، رجب میں کونڈے کی رسم وغیرہ مقرر کر رکھا ہے، اسی طرح اذان ونماز کے پہلے و بعد خاص خاص قسم کی نئی نئی باتیں لوگوں نے گھڑ رکھی ہیں۔

دوسری یہ کہ دین وشریعت کی باتوں میں اپنی جانب سے حدود وقیود لگادیے جائیں۔

جیسے ایصال ثواب تو دین میں ثابت ہے؛ مگر اس کے لیے بعض لوگوں نے وقت کی قید وتخصیص کی ہے، جیسے سوم، دسواں، بیسواں، چہلم، برسی وغیرہ کی رسمیں، کہ یہ دراصل اپنی جانب سے وقت کی تخصیص ہے۔

یا جیسے خاص طریقے کی قید وتخصیص، جیسے، ایصال ثواب میں ''الفاتحہ'' اور اس کے ساتھ سامنے مٹھائی رکھنے اور اس کو لوگوں میں تقسیم کرنے کی قیدیں لگائی گئی ہیں، یا خاص قسم کی چیزوں کی قید لگاتے ہیں جیسے صدقے کے لیے کالا بکرا یا کالی مرغی وغیرہ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایصال ثواب اسی صورت وشکل سے ہوگا؛ حالاں کہ شریعت نے یہ قیدیں نہیں بیان کی ہیں؛ لہذا یہ بھی غلو فی الدین ہے۔

اور جیسے بعض لوگوں نے بعض بعض مہینوں میں بعض کاموں کو خاص کر رکھا ہے، جیسے جلسۂ سیرت النبی ﷺ کو ربیع الاول میں، مظاہرۂ قراءت کی مجالس ودعاء کی مجالس کو رمضان المبارک کی طاق راتوں میں، یا خاص قسم کے بیانات کا سلسلہ مخصوص

راتوں میں ، وغیرہ امور بھی اسی لیے قابل نکیر ہیں کہ ان میں اپنی جانب سے تخصیصات وقید بندیاں کی گئی ہیں، جو کہ غلو کی ایک صورت ہے۔

الغرض کسی بھی دینی کام میں اپنی جانب سے قیدیں لگانا اور تخصیصات کرنا اور ان کو دین سمجھ لینا جائز نہیں ہے؛ بل کہ غلو فی الدین کی ممنوع صورت ہے۔

تیسری صورت یہ کہ دین میں جو چیز جس کیفیت کے ساتھ ہے، اسے ہٹا دیا جائے، جیسے کوئی بات فرض ہے،کوئی سنت،کوئی مستحب وجائز ہے،اسی طرح بعض امور اجتماعی کیے جاتے ہیں اور بعض انفرادی کیے جاتے ہیں ۔اگران امورکوان کی اس کیفیت سے ہٹا کرفرض کوواجب یاواجب کوفرض، یاسنت کوواجب یاواجب کوسنت سمجھ لیاجائے یاانفرادی طور پر کیے جانے والے کام کواجتماعی طریقے سے کیا جائے یااجتماعی کام کوانفرادی طور پر کیا جائے ،تو یہ بھی غلو فی الدین کی ایک صورت ہے۔

جیسے بعض لوگ اجتماعی طریقے پر مساجد میں سلام پڑھنے اوراس کے لیے کھڑے ہونے اور خاص قسم کے اشعار پڑھنے کولازم سمجھتے اور قرار دیتے ہیں اور غیر لازم کولازم سمجھتے ہیں اور دوسروں پراس کااصرار کرتے ہیں۔

اسی بعض بعض جائزیا مستحب کاموں پر اس قدر اصرار کرتے ہیں کہ جیسے کوئی لازم واجب چیز ہو، جیسے دعابعدالصلاۃ پرامام پراصرار کیا جاتا ہے۔اوراگرامام دعا زور سے نہ کرے یااپنی دعاانفرادی طور پر کرلے ،تو جھگڑے کھڑے ہوجاتے ہیں ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے ایک مستحب یا جائز کام کوفرض وواجب کے درجے میں سمجھ لیاہے، یایہ کہ انفرادی کام کواجتماعی طورکرنے کولازم قرار دیتے ہیں ۔یہ وہی غلو فی الدین ہےاورفقہاء اس کو’’التزام مالایلزم‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۴) چوتھی شکل غلو کی یہ ہے کہ منصوص وغیرمنصوص میں فرق نہ کیاجائے اوردونوں کو برابر کردیا جائے۔

منصوص وہ چیزیں ہیں، جنھیں اللہ ورسول نے دین وشریعت میں صاف وواضح طریقے

سے بیان کردی ہیں اور غیر منصوص ان باتوں کو کہتے ہیں، جو دین وشریعت میں اس طرح بیان نہ کی گئی ہوں؛ بل کہ کسی عالم نے یا کسی شیخ نے یا کسی اور نے کسی مصلحت وضرورت کی وجہ سے ان کو جاری کیا ہو۔ یہ امور اگر چہ جائز ہوں؛ مگر ان کا درجہ ظاہر ہے کہ منصوص کے برابر نہیں ہوسکتا۔ مگر غلو کرنے والوں نے ہمیشہ یہ کیا ہے کہ دونوں کو ایک جیسا قرار دے دیا اور جو معاملہ منصوص کے ساتھ کیا جانا چاہیے، وہی غیر منصوص کے ساتھ بھی وہی کرتے ہیں۔ یہ بھی غلو اور حد سے تجاوز کرنا نہیں ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ شریعت میں نماز اور نماز کا طریقہ ،اس کے فرائض ، واجبات، سنن ومستحبات، سب مقرر ومنصوص ہیں؛ مگر ذکر کا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں؛ لہٰذا اگر کسی نے کوئی خاص طریقہ کسی حکمت ومصلحت سے ایجاد کیا، مثلاً یکسوئی پیدا کرنے یا دھیان جمانے کے لیے ضربیں لگانے کا طریقہ جیسا کہ حضراتِ صوفیا میں ہے، تو یہ ضرورت وحکمت کے پیش نظر جائز تو ہے؛ مگر اس کو منصوص کی طرح سمجھا جائے اور اس کو اختیار نہ کرنے والوں پر اس طرح نکیر کی جائے جیسے کسی منصوص سنت کے ترک پر کی جاتی ہے، تو یہ بھی حرام وناجائز ہے؛ کیوں کہ ایسا کرنے والے نے منصوص وغیر منصوص دونوں کو ایک ہی درجہ دے دیا۔

اسی سے سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی بھی کام جو منصوص نہ ہو، وہ اس کام کے برابر نہیں ہوسکتا جو منصوص ہے۔ دونوں کو ایک قرار دینا یا سمجھنا تجاوز وغلو کی صورت ہے۔ اسی سے سمجھ لینا چاہیے کہ دین کے کسی بھی کام کے سلسلے میں جو طریقے منصوص اور شریعت میں مقرر نہیں ہیں، ان میں اگر ہم اپنی سہولت وضرورت اور اپنی حیثیت کے پیش نظر دائرۂ شریعت میں رہتے ہوئے کوئی طریقہ جاری کریں، تو یہ بلاشبہ ایک وسیلے وذریعے کی حد تک جائز ضرور ہے؛ لیکن ہمیں یہ اختیار نہیں کہ ہم اس کے ساتھ منصوص چیز کا سا معاملہ کریں اور سب کو اسی طریقے پر چلنے پر اصرار کریں اور جو کوئی اپنی ضرورت ومصلحت کی وجہ سے اسی دینی کام کے لیے کسی اور طریقے کو اختیار کرے، تو اس کو مطعون کریں؛ کیوں کہ اللہ ورسول نے

اسی طریقے کو لازم نہیں قرار دیا ہے؛ لہٰذا ہمارا جاری کردہ طریقہ منصوص کی طرح لازم نہیں ہو جائے گا۔

(۵) پانچویں صورت غلوفی الدین کی یہ ہے کہ دین میں تعمق وتشدد کا مظاہرہ کیا جائے، جیسے شریعت نے جن امور کی اجازت دی اوران کو مباح وحلال قرار دیا، ان میں تشدد کیا جائے اوران سے حرام کی طرح بچنے کی کوشش کی جائے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

« لاتشددوا على أنفسكم، فيشدد عليكم، فإن قوما شددوا على أنفسهم فشدد الله عليهم ، فتلك بقاياهم في الصوامع والديار»

(ابوداؤد: ۴۹۰۶، مسند ابی یعلی: ۳۶۹۴)

(اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم پر سختی نہ کردی جائے؛ کیوں کہ ایک قوم نے اپنی جانوں پر سختی کی، تو اللہ نے اس پر بھی سختی کردی، پس یہ ان ہی کے بقایا ہیں، جو ان گرجاؤں اور کٹیوں میں ہیں۔)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں فرمایا:

''دین میں تحریف کا ایک سبب یہ تشدد بھی ہے اوراس کی حقیقت یہ ہے کہ عبادات شاقہ کو اختیار کیا جائے، جس کا شارع نے حکم نہیں دیا، جیسے ہمیشہ روزہ رکھنا یا ہمیشہ رات بھر نماز میں کھڑے رہنا، یا نکاح نہ کرنا اور آداب وسنن کا واجبات کی طرح التزام کرنا، حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عثمان بن مطعون رضی اللہ عنہما کو اس سے منع کیا اور فرمایا کہ: جو دین پر غالب آتا ہے، اس پر دین غالب ہو جاتا ہے ''اور اگر یہ تشدد وتعمق کرنے والا کوئی استاد و سردار ہوتا ہے، تو لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شرع کا حکم ہی یہ ہے اور یہ تشدد یہود

وعیسائیوں کے رھبان کی بیماری ہے۔''

(حجۃ اللہ البالغۃ :۱/۲۵۴)

جاہل وغالی صوفیوں میں اس قسم کی باتیں رائج ہیں اور لوگ ان کو دیکھ کر اسی کو دین سمجھتے اور اس کے خلاف کو دین سے خارج قرار دیتے ہیں۔

الغرض اس وقت امت کے اندر بگاڑ کا ایک سبب غلو فی الدین کی یہ صورتیں وشکلیں ہیں۔

☆☆☆

ووٹ اسلامی نقطۂ نگاہ سے

انتخابات کے ایام قریب ہوتے جارہے ہیں، تمام ذرائع ابلاغ اس پر تبصرے وآراء شائع کررہے ہیں، پارٹیاں اپنے اپنے مفادات کے پیش نظر عوام سے وعدے ومعاہدے کرتے نظر آرہے ہیں اور یہ صورتِ حال کوئی نئی نہیں؛ بل کہ ہرالیکشن کے موقعے پراس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔انتخابات کے موقعے پر ووٹ کے متعلق جوافراط وتفریط ہوتی ہے،اس میں جودھاندلیاں ہوتی ہیں اور جومجرمانہ ناٹک کھیلا جاتا ہے،جس کے نتیجے میں فاسدومفسدعناصر بھرپورفائدہ اٹھاتے اور مفید ملک وملت عناصر کودھچکا ودھکا پہنچاتے ہیں، نیزاس کی وجہ سے خلق خداکوجن پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ملک وقوم کے مفادات کوجوخطرات پیش آتے ہیں اورزمین میں ظلم وجور، فتنہ وفساداور جنگ جدال کی جوفضاء قائم ہوتی ہے،اس کی وجہ یہ ہے کہ ووٹ اپنے صحیح مصرف میں استعمال نہیں کیاجارہاہے اور یہ کوتاہی دراصل نتیجہ ہے شریعت کونہ جاننے کا اگرلوگ ووٹ کی قانونی حقیقت وحیثیت سے واقف ہوجائیں،توانہیں اپنے ووٹ کی قیمت بھی معلوم ہوگی اور پھروہ اس کوصحیح طور پراستعمال میں لانے کی فکربھی کریں گے۔

زیرنظرمضمون ان ہی خیالات کا مرہونِ منت ہے، یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت پرآج سے تیس برس قبل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک مختصرمگر جامع مضمون لکھا تھا، ''جواہرالفقہ حصہ دوم'' کا جز ہوکرشائع ہوچکاہے۔نیزآپ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں بھی اس موضوع پرعمدہ کلام کیا ہے۔راقم الحروف نے ان دونوں مضامین کواوراسی کے ساتھ دیگرعلماء کی کتابوں کوسامنے رکھ کراس مضمون کومرتب

کیا ہے، گویا یہ مضمون ''جوہرالفقہ'' کے مختصر سے مضمون کی شرح ہے
غیروں سے امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس موضوع کو سمجھیں گے، البتہ اسلام کو ضروری طور پر اسے سمجھنا چاہیے۔

ووٹ کی مختلف حیثیتیں

ایک ووٹر جب کسی شخص کے حق میں ووٹ دیتا ہے، تو اس کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں ، ایک یہ کہ وہ امیدوار کے حق میں اس بات کی گواہی وشہادت دے رہا ہے کہ امیدوار اس کام کی صلاحیت وقابلیت رکھتا ہے، جس کے لیے یہ امیدوار بن کر کھڑا ہے، اس حیثیت سے ووٹ کی حقیقت شہادت وگواہی ہے۔

دوسری حیثیت یہ ہے کہ ووٹر امیدوار کے حق میں سفارش کرتا ہے کہ اس کو نمائندہ مقرر کردیا جائے، اس حیثیت سے ووٹ کی حقیقت شفاعت وسفارش ہے۔

ووٹ کی تیسری شرعی حیثیت یہ ہے کہ ووٹر امیدوار کو قوم وملت کے مشترکہ حقوق میں اپنی اور قوم کی طرف سے وکیل بناتا ہے، اس لحاظ سے ووٹ دراصل وکالت کا نام ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ: ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے: ایک شہادت، دوسرے سفارش، تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت۔
(جواہرالفقہ :۲/۲۹۳، معارف القرآن:۳/۷۲)

پہلی حیثیت: شہادت

ووٹ کی پہلی حیثیت شہادت کی ہے ، کہ ووٹر گواہی اورشہادت دیتا ہے کہ فلاں امیدوار جس کے حق میں میں نے ووٹ دیا ہے، وہ اس کا م کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور امانت دار ہونے کی وجہ سے کام کو صحیح طور پر انجام دینے کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ گواہی کا سچا ہونا ضروری ہے، جھوٹی گواہی بدترین قسم کا جرم ہے، جس پر شدید وعید وارد ہوئی ہے اور مذمت کی گئی ہے۔

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبیرہ گناہوں کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (کبیرہ گناہ یہ ہیں) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا۔

(بخاری:۱/۳۶۲، مسلم:۱/۶۴)

(۲) حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کیا میں تم کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ضرور! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا یا یہ فرمایا کہ جھوٹی بات کہنا۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ: آپ یہ لفظ بار بار فرماتے رہے حتیٰ کہ ہم نے (دل) میں کہا کہ کاش! آپ خاموش ہو جائیں۔

(بخاری:۱/۳۶۲ ترمذی:۲/۵۶، الادب المفرد:۱۰، مسلم:۱/۶۴)

(۳) حضرت حضرت حزیم بن فاتکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خطبہ دیتے ہوئے کہ: جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے۔ دو مرتبہ یہ فرمایا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور﴾ (بتوں سے بچو یعنی شرک سے بچو اور جھوٹ بات سے بچو)

(ابوداؤد:۲/۵۰۶، ترمذی:۲/۵۶)

ان تمام احادیث میں جھوٹی گواہی کو کبیرہ؛ بل کہ اکبر الکبائر گناہوں میں شمار کیا گیا ہے اور شرک کے برابر بتایا گیا ہے۔ ایک اور وعید ملاحظہ کیجیے!

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جھوٹی گواہی دینے والے، قیامت کے دن اس وقت تک ہل نہیں سکتے، جب تک کہ اس کے حق میں جہنم واجب نہ ہو جائے۔

(الکبائر للذہبی:۷۹)

معلوم ہوا کہ جھوٹی گواہی پر جہنم کی سخت وعید آئی ہے۔

اب اس پر نظر کرنا ہے کہ جب ووٹر کسی امیدوار کے حق میں ووٹ دیتا ہے تو جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ اس کے حق میں قابلیت ودیانت کی شہادت دے رہا ہے؛ لہذا اس میں جھوٹ وغلط بیانی سے بچنا لازم ہے؛ لہذا ہم کسی نااہل ونا قابل انسان کو کسی طور پر بھی ووٹ ہرگز نہ دیں، ورنہ سخت مجرم قرار پائیں گے اور دنیا کے وبال کے علاوہ اخروی پھٹکار کے بھی مستحق بن جائیں گے۔

دوسری حیثیت: شفاعت

ووٹ کی دوسری حیثیت سفارش وشفاعت کی ہے کہ ووٹ دینے والا امیدوار کے حق میں سفارش کرتا ہے، کہ اس امیدوار کو نمائندگی دی جائے۔ سفارش کے متعلق اسلامی اصول یہ ہے کہ اچھے کام میں اور اچھے آدمی کے لیے سفارش کی جائے اور کسی برے کام کی اور برے آدمی کی سفارش نہ کی جائے؛ چناں چہ قرآن نے اس اصول کو بیان کیا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت میں ہے:

> ''جو کوئی سفارش کرے حق بات میں اس کو بھی ملے گا، اس میں ایک حصہ اور جو کوئی سفارش کرے بری بات میں، اس پر بھی ہے ایک بوجھ، اس میں سے اور اللہ ہے ہر چیز پر قدرت رکھنے والا۔''

(ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ: نساء: ۸۵)

اس آیت میں شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ کا جوذکر آیا ہے، اس کی متعدد تفسیریں علمائے تفسیر نے بیان فرمائی ہیں؛ مگر جامع تفسیر حضرت حسن بصریؒ نے ارشاد فرمائی ہے، وہ کہتے ہیں کہ شفاعت حسنہ وہ ہے، جو دین میں جائز ہے اور شفاعت سیئہ وہ ہے، جس کی اجازت نہیں۔ (قرطبی: ۵/ ۲۹۵)

مطلب یہ ہے کہ جائز کاموں میں کسی کی شفارش کرنا شفاعت حسنہ ہے اور ناجائز کاموں میں کسی کی سفارش کرنا شفاعت سیئہ ہے۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اسی آیت کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہوگیا کہ جو آدمی کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام میں جائز طریقے پر سفارش کرے، تو اس کو ثواب ملے گا اور اسی طرح جو کسی ناجائز کے لیے یا ناجائز طور پر سفارش کرے گا، تو اس کو اس کا حصہ عذاب ملے گا۔''

(معارف القرآن:۲/۴۹۸)

آیت کریمہ اور اس کی تفسیر سے یہ معلوم ہوا کہ کسی ناجائز کام کے لیے سفارش کرنا ناجائز و حرام ہے اور اچھے کام کے لیے سفارش کرنا جائز و ثواب کا کام ہے؛ لہذا جب کسی امیدوار کو ووٹ دینا چاہے، تو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ ووٹ دینا ثواب کا باعث بنے نہ کہ عذاب کا۔

اگر قابل اعتماد آدمی کو ووٹ دیا جائے گا، تو ثواب ملے گا اور کسی غلط و ناقابل آدمی کو ووٹ دیا جائے گا، تو عذاب ملے گا؛ لہذا پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ یہ شخص جو آدمی امیدوار بنا ہوا ہے کہ ملک وملت کے لیے خطرہ تو نہیں ہوگا اور یہ کہ ملک وملت کی بہبودی کے کام کرنے والا ہے یا نہیں؟ کیریکٹر و مزاج صالح ہے یا فاسد؟ جب تک امیدوار کی صلاحیت و قابلیت و دیانت کو نہ دیکھ لیا جائے، اس وقت تک ووٹ نہ دیا جائے، ورنہ عذاب میں گرفتار ہونا پڑے گا اور عذاب کوئی ضروری نہیں کہ آخرت کا ہی ہو؛ بل کہ یہاں دنیوی عذاب بھی مراد ہوسکتا ہے اور یہ تجربہ بھی ہے کہ ہمارے ووٹ جب غلط آدمی کو جاتے ہیں، تو وہ جیتنے کے بعد اپنی غلط کاریوں اور مجرمانہ کاریوں سے ملک وملت کے لیے خطرہ و عذاب بن جاتا ہے۔ اس طرح ﴿کفل منها﴾ کی ایک تفسیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جو آدمی غلط سفارش کرتا ہے، تو اس کا وبال، اس پر پڑتا ہے؛ چناں چہ مشاہدہ ہے۔

تیسری حیثیت وکالت

ووٹ کی ایک تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹرامیدوار کو پورے حلقے کا نمائندہ اوروکیل بناتا ہے،اس صورت میں ظاہر ہے کہ جس کو وکیل بنایا جاتا ہے، وہ قابل وامانت دار ہونا چاہیے،چناں چہ جب ہم ذاتی معاملات میں کسی کو وکیل بناتے ہیں،توان دونوں باتوں کودیکھ لیتے ہیں،ایک یہ کہ وہ کام کی صلاحیت وقابلیت رکھتا ہے یانہیں؟ دوسرے یہ کہ وہ امانت داربھی ہے یانہیں؟ غالباً ہدایہ میں اس کی جانب اشارہ ان الفاظ سے کیا گیا ہے، وکالت کے باب میں شرائط بتاتے ہوئے صاحب ہدایہ،قدوری کے یہ الفاظ نقل فرماتے ہیں:ویشترط أن یکون الوکیل ممن یعقل العقدویقصده.(شرط ہے کہ وکیل ان لوگوں میں سے ہوں جومعاملے کوسمجھےاوراس کاارادہ کرتے ہوں اس میں وکیل کی دوشرطیں بیاں کی گئی ہیں،ایک یہ کہ وہ معاملہ کوسمجھتاہو،اس میں قابلیت وصلاحیت کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ معاملہ متعلقہ کاارادہ کرتاہو،اس کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ معاملہ اس طرح کرے،جس سے نتیجہ برآمد ہوتاہو،محض کھیل تماشہ کرکے گزارنے والا نہ ہو۔

(بحرالرائق:۷/۱۴۲)(ہدایہ:۳/۱۶۳)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ معاملے کونتیجہ تک پہنچانے کاارادہ رکھتاہو،اس میں میری ناقص سمجھ کے مطابق اشارہ ہے،وکیل کی دیانت وامانت کی طرف۔ویسے بھی یہ دوشرطیں ایسی ہیں،جن کاوکیل میں ہوناعقلاً بھی ضروری ہےاورلوگ عام طورپراسی کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔

جب ذاتی معاملات میں اس کوپیش نظررکھناضروری ہے،توملی وقومی مسائل میں،اس کی طرف توجہ دینا،کس قدرضروری ہوگا؟ جب کہ ذاتی معاملات کی اچھائی وبرائی ذات تک محدودہوتی ہےاورملی وقومی مسائل کی اچھائی وبرائی کااثرپوری قوم وملت پرپڑتاہے؛ لہٰذا ضروری ہے کہ جس امیدوار کے حق میں ووٹ دیناہو،اس کے بارے میں پہلے معلوم

کرلیا جائے کہ وہ سیاسی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کی صلاحیت اور ملی مسائل کے حل کرنے کی قابلیت رکھتا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ نیت وارادہ محض سیاسی کھیل کھیلنے کا ہے یا امانت و دیانت داری کے ساتھ ملی مسائل کو حل کرنے کا بھی ہے؟ تاکہ قوم وملت کے حقوق کی پامالی کے ہم ذمے دار نہ بنیں۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اسی کو ذکر فرمایا ہے:

''اگر یہ وکالت اس (ووٹر) کے کسی شخص کے حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اسی کی ذات کو پہونچتا، تو اس کا یہ خود ذمے دار ہوتا؛ مگر جہاں ایسا نہیں؛ کیوں کہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے، جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لیے ووٹ دے کر کامیاب بنایا، تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس ووٹر کی گردن پر رہا۔''

(جواہر الفقہ: ۲/۲۹۳)

ووٹ کی ایک اور حیثیت

میں کہتا ہوں ووٹ کی ایک اور چوتھی حیثیت بھی ہے اور وہ یہ ہے امداد و تعاون کی حیثیت کہ ووٹر امیدوار کو ووٹ دے کر گویا اپنا تعاون اور سپوٹ پیش کرتا ہے اور تعاون کے سلسلے میں قرآنی اصول یہ ہے:

''نیکی و پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ وظلم میں مدد نہ کیا کرو۔''

(ترجمہ مولانا محمد فتح جالندھریؒ: مائدہ:۲)

معلوم ہوا کہ امیدوار ملک وملت کے حق میں فلاح و بہبودی کے لیے کام کرنے والا ہو، تو اس کو ووٹ دے کر اس کا تعاون کرنا چاہیے؛ لیکن ظلم وفساد کرنے والا اور کرانے

والا ہو، یا لوگوں کے حقوق پامال کرنے والا ہو اور ملک وملت کے لیے خطرہ ہو، تو اس کو ووٹ دینا حرام وناجائز ہے۔ ظالم امراء کے مددگاروں پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عن قریب ایسے امراء ہوں گے کہ بہت سے لوگ ان کی حاشیہ برداری کریں گے، جو ظلم کریں گے اور جھوٹ بولیں گے، پس جو شخص ان کے پاس جائے گا اور ان کی تصدیق کرے گا اور ان کے ظلم پر ان کی مدد کرے گا، وہ مجھ سے نہیں، میں اس سے نہیں۔ (الکبائر للذہبی: ۱۱۱ تا ۱۱۲)

معلوم ہوا کہ ظالموں کی مدد اور ان کا تعاون اور ان کی تصدیق یہ سخت حرام امور ہیں، ان کا مرتکب سخت وعید کا مستحق ہے۔ ظالموں کے سلسلے میں مدد کے یہ اقوال بھی ملاحظہ کیجیے؛ تاکہ اس کی شدت کا پوری طرح احساس ہو: علامہ ذہبیؒ نے نقل کیا ہے حضرت سعید بن المصعب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ظالموں کے مددگاروں کو دیکھ کر تمہاری آنکھیں نہ بھریں؛ مگر تمہارے دلوں کے انکار کے ساتھ؛ تاکہ تمہارے نیک اعمال حبط وباطل نہ ہوجائیں؛ یعنی ان کو دیکھ کر انکار کے جذبات دل میں پیدا نہ ہوئے، تو نیک اعمال کے حبط ہونے کا اندیشہ ہے۔

ذہبی رحمہ اللہ نے ہی حضرت مکحول تابعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

> ’’قیامت کے دن ندا دی جائے گی کہ ظالم اور ان کے مددگار کہاں ہیں؟ پس جس نے بھی ان ظالموں کے لیے سیاہی پیش کی ہوگی یا دوات میں سیاہی ڈالی ہوگی یا قلم چھیل کر دیا ہوگا یا ایسا ہی کوئی کام کیا ہوگا، جس سے ظلم پر اعانت ہوتی ہے، ان سب کو جمع کیا جائے گا اور آگ کے بنائے ہوئے تابوت میں رکھ کر ان کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔‘‘

(الکبائر للذہبی: ۱۱۲)

غرض یہ کہ ظالم امراء کی مدد تعاون سخت حرام ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ ووٹ

دینا بھی ایک قسم کا تعاون ہے، لہٰذا جس کو ووٹ دیا جائے، اس کے متعلق غور کرلیا جائے۔

ووٹ ڈالنے کا شرعی حکم

اب تک کی تفصیلات سے جہاں یہ واضح ہوا کہ ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں، وہیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ووٹ ڈالنے کا کیا حکم ہے؟ اس کی توضیح یہ ہے کہ چوں کہ ووٹ میں ایک حیثیت شہادت کی ہے، تو جس طرح جھوٹی شہادت حرام ہے، اسی طرح سچی شہادت وگواہی دیناواجب ہے۔قرآن میں متعدد جگہ اس کا ذکر آیا ہے اور سچی شہادت دینے کا حکم ہے۔

ایک جگہ ہے:

﴿يَآيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْط﴾

دوسری جگہ ارشادفرمایا گیا:

﴿كُوْنُوْاقَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾

ان دونوں آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے لیے انصاف وحق کے ساتھ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہوجاؤ اور سورۂ طلاق میں حکم ہے:

﴿وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾

(اللہ کے واسطے شہادت قائم کرو۔)

ان سب آیات سے سچی شہادت کے اظہار کا حکم ظاہر ہوتا ہے۔اسی طرح بعض آیات میں سچی گواہی کو چھپانے کی مذمت کی گئی ہے؛ چناں چہ فرمایا:

﴿وَلَاتَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾

(شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو شخص اس کو چھپاتا ہے، اس کا دل گنہگار ہے۔)

معلوم ہوا کہ سچی شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ووٹ اس امیدوار کو دینا جو لائق وقابل ہو اور امانت دار ہو ضروری ہے اور شرعی فریضہ بھی ہے۔اسی طرح ووٹ کی ایک حیثیت تعاون کی بھی ہے؛ لہٰذا اچھے اور امانت دار آدمی کا استعمال کرتے

ہوئے اس کو ووٹ دینا ضروری ہے، کیوں کہ نیکی کے کام پر تعاون کا حکم دیا گیا ہے۔حاصل یہ ہے کہ ووٹ ایسے امیدوار کو دینا جس کو ہم نا قابل سمجھتے ہیں، نا جائز ہے۔اور قابل انسان کو ووٹ دینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے؛ بل کہ فریضۂ شرعیہ ہے۔

چناں چہ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ اوپر پیش کردہ آیات کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا کہ سچی گواہی سے جان نہ چرائیں،ضرور ادا کریں۔''

(جواہر الفقہ :۲/۲۹۴)

اس عبارت سے قبل صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

''جس طرح قرآن وحدیث کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نا اہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو دینا گناہ عظیم ہے، اسی طرح ایک اچھے اور نیک آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے؛ بل کہ ایک فریضہ شرعی ہے۔''

(جواہر الفقہ :۲/۲۹۳)

سب امیدوار نا قابل ہوں تو کیا کریں؟

البتہ یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام امیدوار نا قابل ہوں اور کوئی بھی قابل اعتماد نہ ہو تو کیا کریں؟ یہ سوال ہمارے زمانے کے لحاظ سے نہایت ہی اہم ہے؛ کیوں کہ آج اکثر یہی بات نظر آتی ہے کہ امیدوار کسی جگہ بھی قابل اعتماد و اطمینان نہیں ہوتے حتیٰ کہ مسلم امیدواروں کی حالت بھی دوسروں سے کچھ مختلف نظر نہیں آتی، تو کیا ایسی صورتِ حال کا تقاضہ یہ ہے کہ ووٹ سے دست کش ہو جائیں یا کچھ اور؟ اس سوال کا جواب حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے یہ دیا ہے کہ اگر کسی جگہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنیٰ میں قابل و دیانت دار نہ ہو؛ مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت کار و خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو، تو تقلیل شر و تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دیدینا جائز ہے؛ بل کہ

مستحسن ہے۔ (جواہر الفقہ: ۲/۲۹۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ امیدواروں میں غور وفکر کریں کہ کون ملک وملت کے لیے کم خطرہ ہے۔ اگر ایک بڑا ظالم ہے اور دوسرا اس سے کم ظالم، تو اس کو ووٹ دینا جائز ہے، اس کی تائید علامہ ابن تیمیہؒ کی ایک عبارت سے بھی واضح ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"مع أنه تولية غير الأهل للضرورة إذا كان أصلح الموجود، فيجب مع ذلک العلي في إصلاح الأحوال حتى يكمل في الناس مالابدلهم منه من أمور الولايات والأمارات ونحوها."

(فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۵۹، ۲۵۸)

(باوجودیکہ نااہل کو حاکم وولی بنانا بہ ضرورت جائز ہے، جب کہ وہ موجودہ لوگوں میں سے غنیمت ہو؛ مگر اسی کے ساتھ اصلاح حالات کی کوشش کرنا ضروری ہے؛ تاکہ ولایت وامارت وغیرہ کے معاملات میں جن باتوں کا ہونا ضروری ہے، وہ لوگوں میں مکمل ہوجائیں۔)

علامہ کی اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ نااہل کو بھی حاکم بنانے کی اجازت ہے، جب کہ موجودہ اشخاص میں سے وہی غنیمت ہو، دوسرے یہ کہ نااہل کو حاکم بنانے کے بعد اس بات کی کوشش رکھنا ضروری ہے کہ ولایت وامارت کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے جن صفات وضروریات کی ضرورت ہے، وہ لوگوں میں تکمیل پائیں؛ تاکہ آئندہ قابل انسان اس کام کو سنبھال سکیں۔

ووٹ دینا نقصان دہ ہے

اسی سے معلوم ہوا کہ انتخاب میں کسی ایسے شخص کو جو دوسروں کی نسبت غنیمت ہو ووٹ دینا چاہیے اور ایسا نہ کرنا نقصان دہ ہے، کیوں کہ جب صالح طبقہ ووٹ دینے سے گریز کر

ے گا،تو جولوگ دنیادار ہوتے ہیں، وہ اپنا ووٹ یا تو غلط استعمال کرتے ہیں یا غلط لوگوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں، جس کے نتیجے میں ایسے نمائندے مقرر ہوکر آتے ہیں، جو نہ قابلیت رکھتے ہیں، نہ دیانت وامانت کے قابل ہوتے ہیں؛لہٰذا صالح طبقے کو چاہیے کہ وہ صالح لوگوں کے حق میں ووٹ ضرور دیں۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’آج جو خرابیاں انتخابات میں پیش آرہی ہیں، ان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عموماً نیک صالح حضرات ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے، جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا، جو مشاہدہ میں آرہا ہے کہ ووٹ عموماً ان لوگوں کے آتے ہیں، جو چند ٹکوں میں خرید لیے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے ووٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں ،وہ ظاہر ہے کس قماش وکس کردار کے ہوں گے۔‘‘

(جواہر الفقہ :۲/۲۹۴)

یہاں یہ فقہی مسئلہ بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ ووٹ چوں کہ شفاعت کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور شہادت کی بھی اور دونوں پر کوئی معاوضہ لینا دینا حرام ہے اور داخل رشوت ہے؛اس لیے کہ ووٹ پر بھی معاوضہ لینا و دینا حرام ہے اور رشوت میں داخل ہے۔

حدیث میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’جس نے کسی شخص کی شفارش کی اور اس نے اس پر اس کو ہدیہ دیا اور اس نے وہ قبول بھی کرلیا تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں داخل ہوگیا۔‘‘ (ابوداؤد:۲/ ۴۹۹)

معلوم ہوا کہ سفارش پر ہدیہ سود کے حکم میں ہے؛ بل کہ سود کی انتہائی قبیح صورت ہے، اسی طرح شہادت وگواہی کو بیچنا بھی حرام ہے اور رشوت میں داخل ہے جیسا کہ حضرت

مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ''جواہر الفقہ'' کے اسی مضمون میں نشان دہی فرمائی ہے۔

(جواہر الفقہ: ۲/ ۴۹۵)

اور رشوت کا لین دین شریعت کی نظر میں نہایت ہی قبیح و شنیع فعل ہے، جس پر سخت وعید بھی وارد ہوئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

(ابوداؤد: ۲/ ۵۰۵، ترمذی: ۱/ ۲۴۸)

لہذا کسی بھی مسلمان کو اپنا ووٹ بیچنا نہیں چاہیے، اس سے ہوسکتا ہے کہ کسی کی دنیا بن جائے؛ مگر بیچنے والے کی آخرت تباہ ہو جائے گی، یہ کون سی عقلمندی ہے کہ دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لیے اپنی آخرت برباد کرنے تیار ہو جائے اور وہ بھی چند معمولی وحقیر ٹکوں کے عوض میں، ظاہر ہے کہ یہ عقلمندی نہیں؛ بل کہ بے وقوفی ہے۔

الغرض ووٹ اسلامی نقطہ نظر سے کئی حیثیتیں رکھتا ہے اور ہر حیثیت کے اعتبار سے مسلمان پر ضروری ہے کہ اسے خدا سے ڈر کر استعمال کرے اور صحیح مصرف میں استعمال کرے، ضائع نہ کرے، اس کو محض ہار جیت کا ایک کھیل سمجھ کر غلط وبےجا استعمال نہ کرے، یہ نہ صرف آخرت کی بربادی ہے؛ بل کہ دنیا میں اپنی قوم اور ملک وملت کی بربادی کا باعث بھی ہے۔

ہم کس پارٹی کو ووٹ دیں؟

اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہم کس پارٹی کو ووٹ دیں؟ یہ ایسا سوال ہے کہ موجودہ حالات میں دوٹوک جواب دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ دودھ کا پانی سے الگ کرنا، کیوں کہ آج تک کا پورا ریکارڈ کھلے طور پر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہر پارٹی نے محض اپنے مفادات کی خاطر قوم وملت سے بڑے بڑے وعدے کیے؛ مگر جب ایفائے وعدہ کا نمبر آیا، تو کسی نے بھی اس کا پاس ولحاظ نہ رکھا، پھر بی جے پی شروع ہی دن سے مسلمانوں سے بغض وعناد وعداوت رکھتی چلی آرہی ہے اور اس میں وہ بے باک طور پر

سامنے آتی ہی رہی ہے؛ لہٰذا اس کے حق میں تو ووٹ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہاں مسلمانوں کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ آج کل ووٹ کی خاطر بی جے پی کچھ نرم گوشہ دکھا رہی ہے؛ مگر یہ سب سیاسی چالیں ہیں، بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ بی جے پی نے اپنا نظریہ بدل دیا ہے؛ لہٰذا اب اس کو ووٹ دے کر دیکھ لینا چاہیے، مگر یہ صحیح نہیں؛ کیوں کہ یہ محض ایک سیاسی چال ہے، جس کو سمجھنا مسلمانوں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

اب رہی دوسری پارٹیاں، ان میں سے کانگریس کی نیت بھی صاف نہیں ہے، اس نے ہمیشہ مسلمانوں سے وعدے کر کے ان کو دھوکہ ہی دیا ہے؛ بل کہ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کی کوکھ سے ایسے سپوتوں نے بھی جنم لیا ہے جو مسلم دشمنی میں پیش پیش رہے؛ اس لیے کلیتاً یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے کہ کانگریس کے حق میں ووٹ دیا جائے، اب رہی دیگر جماعتیں اور پارٹیاں ان کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ ہونے کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی خلاف ہے، اس صورتِ حال میں کیسے کہا جائے کہ کانگریس کے حق میں ووٹ دیا جائے، ان کو کوئی مضبوط پوزیشن بھی حاصل نہیں؛ اس لیے ان کو ووٹ دینا دیانت کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی خلاف ہے، بس اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ بی جے پی کو ہرگز ووٹ نہ دیا جائے اور دوسری پارٹیوں کے متعلق اہل رائے حضرات میں سے بعض حضرات نے یہ رائے پیش کی ہے کہ جس علاقہ میں جس امیدوار کی اچھی پوزیشن ہو، اس کو ووٹ دیا جائے اور جس کی پوزیشن اچھی نہ ہو، اس کو ووٹ دے کر اپنا ووٹ ضائع نہ کرے۔

بعض حضرات نے یہ رائے تجویز کی ہے، کہ کانگریس اگرچہ اپنے چہرے پر ہزار داغ رکھتی ہے؛ تاہم اس کا منشور سیکولر ہے اور آئندہ اس کے اندر صلاحیت کے امکانات ہیں؛ لہٰذا کانگریس ہی کو ہر جگہ ووٹ دیا جائے؛ کیوں کہ مختلف پارٹیاں کو ووٹ دینے سے وہی مخلوط حکومت دینے سے وہی حکومت بنے گی جس کی ناکامی کا تجربہ کیا جا چکا ہے اور بحیثیت پارٹی کے کانگریس کے سوا اس کے قابل نہیں۔ اور غالباً یہی رائے مناسب معلوم

ہوتی ہے۔

بہرحال مسلمانوں کو اپنا ووٹ ضائع نہ کرنا چاہیے اور ہر جگہ کے لوگ اپنے اپنے علاقہ کے اہل رائے حضرات سے مشورہ کر کے اس سلسلے میں قدم اٹھائیں اور ہر جگہ کے اہل رائے حضرات بھی دوسروں کی رہنمائی کا کام پوری تندہی ودلچسپی کے ساتھ کریں، تو یہ ووٹ نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

☆☆☆

مدارسِ اسلامیہ ہدف ملامت کیوں؟

مدارس دراصل ایسی فیکٹریاں ہیں، جہاں انسان کوانسان بنانے کی تحریکات وکوششیں ہوتی ہیں ، جہاں شرافت کی قدروں اورانسانیت کے پیمانوں کوتیار کیا جاتا ہے اورانسانوں کواس میں ڈھالا جاتا ہے ،جس سے وہ ایک جانب اپنے مالک حقیقی کی معرفت سے معمور ہوجاتے ہیں اوردوسری طرف اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی وغمخواری،عدل وانصاف، پیارومحبت،اس کی خدمت واداۓ حقوق وغیرہ کی صفات سے ممتاز ہوجاتے ہیں۔

بعض لوگ آۓ دن مدارس اسلامیہ کی شرعی وعرفی حیثیت کوداغدار بنانے اوران کے خلاف کیچڑ اچھالنے،ان کی ضرورت واہمیت اوران کی افادیت ونافعیت پرسوالیہ نشان قائم کرنے اوران کے نظام وکردار کودرہم برہم کرنے کی شرمناک کوشش کرتے رہتے ہیں۔

سب سے پہلے مدارس کونشانۂ ملامت وہدف تنقید بل کہ ہدف تضحیک بنانے کی مہم کا آغاز مغربی لابی اوراسلام دشمن عناصروا خلاق وشرافت سے محروم کچھ بدقسمتوں نے کیا تھا، جن کومدارس کی عظمت وجلالت اورعلماۓ مدارس کے وقاروشان نے اوران کی مساعیٔ جمیلہ کے اسلامی معاشرے میں مؤثر رول وکردار نے حسدوبغض کی نفسیاتی بیماریوں میں اس طرح مبتلا کردیا تھا کہ وہ ان مدارس اور یہاں کے علماء وفضلاء کی کردارکشی کی مہم چلانے ہی میں خودکے لیے سامان تسلی سمجھنے لگے،جس طرح حاسدین کا عموماً مشغلہ یہی ہوتا ہے۔

پھران اسلام دشمن عناصر کی باربار کی رٹ اورجھوٹے پروپیگنڈے سے متأثر ومرعوب ہوکرمسلمانوں میں ایک طبقہ جوبصیرت سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ بصارت سے بھی محروم ہوتا ہے اوراس لیے خودکی آنکھوں اوردل ودماغ کوآزادانہ استعمال کرنے کی صلاحیت

رکھتا ہے نہ ہمت اور ہمیشہ غیروں کی آنکھوں اور عقل ودل سے دیکھنے اور سوچنے کا عادی ہو چکا ہے، وہ بھی اس شرمناک مہم میں ان کے دوش بدوش چلنے لگا اور وہی رٹ لگانے اور اسی پروپیگنڈہ بازی وانگشت نمائی کا کام کرنے لگا جو اسلام دشمنوں کا مشغلہ ومحبوب عمل تھا۔

اس پروپیگنڈہ مہم میں ان مغربی لابیوں وسامراجی طاقتوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے اوران کے پروپیگنڈے کو حقیقت واقعیہ سمجھ کر پھیلانے والے دو قسم کے لوگ ہیں :ایک وہ ہیں جو پہلے ہی سے دین ومذہب سے بیزار اوراس کو ایک فرسودہ نظام قرار دیتے ،ایک فالتو چیز سمجھتے ہیں اوراس کی ہدایت ورہنمائی کو کسی طرح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔دوسرے وہ لوگ ہیں، جو اسلام کو بہ حیثیت ایک دین ومذہب تسلیم کرتے ہیں اوراس کو ایک حد تک اپنی زندگی میں نافذ بھی کرتے ہیں ؛لیکن اسی کے ساتھ مغربی افکار ونظریات نے ان کو اس قدر مرعوب کرر کھا ہے کہ ان کی سوچ وفکر سب ان ہی افکار ونظریات پر مبنی ہوتی ہے، وہ اس کے خلاف سوچ نہیں سکتے اور نہ اس کے خلاف بولنے کی ان کو ہمت ہوتی ہے۔اب یہ لوگ مدارس کے خلاف اس مہم میں اسلام دشمنی ہی کے لیے شامل ہو گئے ہیں یا محض اسلام دشمنوں کی بلا سوچے سمجھے تقلید کرتے ہیں؟ یہ تو میں نہیں جانتا؛ تاہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان حضرات کے بارے میں حسن ظن تو یہی ہے کہ یہ حضرات اسلام دشمن عناصر کی چالاکی ومکاری سے ناواقفیت کی وجہ سے اوران کی اس مہم کے خطرناک نتائج سے بے خبری کی بنا پر اس کو فروغ دینے میں مشغول ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخی وثائق نے ہم تک پوری ذمے داری سے یہ شہادت پہونچاتی ہے کہ اہل اسلام کی بساط الٹنے مسلم سماج کو تباہی کا نشانہ بنانے اورملت کے سرسبز وشاداب درخت کو اجاڑنے کے لیے اسلام دشمن عناصر نے ہمیشہ اس کی کوشش کی ہے کہ علمائے اسلام ومسلم عوام کے آپسی روابط وتعلقات ختم ہوجائیں اورعلماء پر عوام کا اعتماد برقرار نہ رہے اوراس مقصد میں کامیابی کے لیے جو ہتھیار استعمال کیا گیا، وہ یہ تھا کہ علماء وفضلائے مدارس کی اور خود مدارس اسلامیہ کی توہین وتحقیر کی اوران کو بدنام کرنے کے

نت نئے طریقے اختیار کیے اور تشہیری مہم کے ذریعے یہ باور کرانے کی زبردست کوشش کی گئی کہ یہ مدارس دہشت گردی کے اڈے ہیں اور وہاں کے علماء دہشت گرد اور ملک وملت کے غدار ہیں، نیز یہ دقیانوسیت کے علمبردار ہیں ،تاریک خیالی وتنگ نظری کے شکار ہیں، ملک وملت کے کسی کام کے نہیں، تہذیب وتمدن سے عاری اور سماج پر ایک بھاری بوجھ ہیں ؛ لہٰذا مدارس کی امداد وتائید سے دست کش ہو جانا چاہیے۔

مگر ظاہر ہے کہ اس مہم کو وہ اس قدر آسانی سے سر نہیں کر سکتے تھے؛ اس لیے انھوں نے مدارس کی تعلیم اور وہاں کے نظام، وہاں کے نصاب ، وہاں کے طریقۂ کار، سب کو مشکوک بنانے کی سعیٔ لاحاصل شروع کر دی اور یہ کہا جانے لگا کہ مدارس کی تعلیم امت کے لیے ایک بے فائدہ تعلیم ہے ؛ کیوں کہ اس سے نہ کوئی ڈاکٹر وانجینئر تیار ہوتا ہے ، نہ کوئی ماہر اقتصادیات سامنے آتا ہے، نہ کوئی سیاسی سمجھ بوجھ کے افراد پیش ہوتے ہیں، نہ ان لوگوں کو انگریزی زبان آتی ہے ، نہ وہ موجود آرٹ سے واقف ہوتے ہیں؛ لہٰذا صرف قرآن وحدیث پڑھنے سے کیا فائدہ اور اس سے امت کو کیا نفع ؟

یہ وہ خیالات ہیں، جو آئے دن اخبارات کی زینت بن کر اسلامی ماحول کو متعفن وعوام الناس کے دل ودماغ کو پراگندہ ومنتشر کرتے رہتے ہیں۔

مغربی طاقتوں کی مدارس کے خلاف مہم کی وجہ؟

اب رہا سوال کہ مغربی طاقتوں نے مدارس کے خلاف یہ مہم کیوں چلائی ہے، جس میں شعوری وغیر شعوری طور پر یہ مغرب زدہ لوگ شامل ہوگئے ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ برصغیر میں مغربی وسامراجی طاقتوں کو توڑنے اور اس کے اثر ونفاذ کو روکنے میں ان مدارس نے جو انتہائی مؤثر ترین رول انجام دیا ہے، وہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ اس کا کوئی منصف انکار نہیں کر سکتا؛ چناں چہ جہاں جہاں یہ مدارس موجود تھے اور جہاں جہاں علمائے اسلام موجود تھے، وہاں وہاں مغربی سیلاب کی ایسی مزاحمت ہوئی اور اس کی راہ میں وہ

رکاوٹ پیدا ہوئی، جس کا ان مغربی لابیوں کو شاید پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا؛اسی لیے برصغیر ساری دنیا میں وہ واحد خطہ ہے، جہاں مغربی اثر ونفوذ سب سے کم ہوا؛لہذا یہ مدارس ان کی آنکھ کا کانٹا بن گئے اور وہ ان کے خلاف پروپگنڈے کی مہم چلانے ہی میں اپنی کامیابی تصور کرنے لگے؛ کیوں کہ ان کو یہ تو معلوم تھا کہ اس پروپگنڈے کا اثر اتنا تو ہوگا کہ خود مسلمان قوم میں سے کچھ لوگ اس سے متأثر ومرعوب ہوکر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں گے۔اور یہی ہوا بھی جیسا کہ عرض کیا جا چکا۔ یہ ہے وہ اصلی وجہ جس کی وجہ سے مدارس کو بدنام کرنے اور ان کو کبھی دہشت گردی کے اڈے قرار دینے اور کبھی بے مصرف وفضول باور کرانے، کبھی یہاں کے نصاب ونظام کو فرسودہ دور کے یادگار ٹھہرانے اور کبھی یہاں کے علماء فضلاء کو دقیانوسی وتاریکی خیال وتنگ نظر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مدارس کا اصلی رول

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب باتیں محض ناواقفیت کی بنیاد پر کہی جاتی ہیں یا ان کی بنا تعصب وعناد ہے،اگر تعصب کی عینک نکال کر اور حقیقت شناسی کی نیت سے مدارس کا جائزہ لیا جائے ،تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ مدارس کا اصلی کام اور حقیقی مقصد کیا ہے، جس میں الحمدللہ وہ کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہیں؟ ہم مدارس کے اس کام ومقصد کو یہاں چند نمبروں میں بیان کرتے ہیں:

(۱) طالبین علوم کو سرچشمۂ علوم وحکمت یعنی کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے براہ راست واقف کرنا؛ تاکہ وہ علوم الہیہ وحکمت شرعیہ سے پوری طرح باخبر ہوں اور پھر اپنی زندگیوں میں اس کی خود پر بھی اور اپنے سماج میں بھی نافذ کریں۔اور ان علوم میں علم تجوید وقراءت، تفسیر قرآن ،اصول تفسیر، حدیث اور اصول حدیث، علم کلام وعقائد، فقہ واصول فقہ، تاریخ اسلامی وسیرت نبوی داخل ہیں۔

(۲) علوم نبوت سے ملحق ومنسلک دیگر علوم جیسے علوم عربیہ: علم نحو وصرف، علم نحو، علم

اشتقاق،علم بلاغت،علم بیان،علم بدیع،وغیرہ کی تعلیم کے ذریعےعلم میں مہارت اختصاص پیدا کیا جائے؛ تاکہ دینی علوم کوکما حقہ سمجھا وعمل کیا جائے۔

(۳) مذکورہ بالاعلوم اسلامیہ کی حفاظت کرتے ہوئے،ان میں تحقیق وترقی کی جائے اوران کے مختلف شعبوں کوتقاضائے وقت اورضرورت زمانہ کے لحاظ سے پیش کیا جائے؛ تاکہ ایک جانب یہ علوم جوانسانی ہدایت کے لیے نازل ہوئے ہیں،امت میں برابرمحفوظ رہیں اوردوسری جانب مختلف زمانوں وظروف واحوال میں وہ قابل فہم ولائق استفادہ رہیں۔

(۴) قرآن وسنت کی معتبر تفسیر ومستند تشریح جوحضرات صحابہ وتابعین وائمہ اسلاف سے منقول چلی آرہی ہے اوراسی پر انسانی ہدایت کا مدار ہے،اس کا سلسلہ جاری وساری رہےاورقرآن وسنت کےعلوم نااہلوں وناقصوں کی دست بردومن مانی وخودرائی تفسیر وتشریح سے محفوظ رہ سکیں۔

اورکوئی نااہل وناقص ،قرآن وسنت کی من مانی تفسیروتشریح کی جراءت نہ کرے اوراگرکوئی کرے ،توان مدارس کے فضلاء وعلماء جوعلوم اسلامیہ کے چوکیدارو پہرے دار ہیں، وہ اپنافرض انجام دیتے ہوئے ان نااہلوں وناقصوں کی اس سلسلے میں نااہلی کا پردہ چاک کریں اورامت کوحقائق سے آگاہ کریں۔

(۵) سماج ومعاشرے سے جہالت کودورکرتے ہوئے جہالت کی مختلف پیداواروں جیسے لادینیت واباحیت،خدابیزاری ومادہ پرستی ،الحادوزندقہ ،کفروشرک ،خدائی قانون سے بغاوت وسرکشی وغیرہ کاقلع قمع کیاجائے اوران کے بجائے قانون خداوندی واحکام شرعیہ سے سماج ومعاشرے کے لوگوں کوواقف کرایااوران میں علم وعمل، خداپرستی وخداشناسی، توحیدشعاری جذبۂ اطاعت وفرمانبرداری اورحقائق پرایمان ویقین کی صفات پیدا کی جائیں۔

(۶) اصلاحی ودعوتی ذرائع میں سے حسب موقعہ ومحل حکمت وموعظت کے اصول

پر امت کے افراد میں ایک جانب تعلق مع اللہ کو مضبوط کرنے کے لیے اخلاص وللّٰہیت نیکی وخوبی، امانت ودیانت داری، عفت وپاکدامنی، صلاح وتقویٰ شعاری، انصاف وحق پرستی، خوف وخشیت، خشوع وانابت، اعمال صالحہ کی پابندی، حلال وحرام کی تمیز، اچھے وبرے کا فرق وغیرہ اوصاف پیدا کیے جائیں اور دوسری طرف مخلوق خدا کے ساتھ معاملے کو صحیح کرنے کے لیے بڑوں اور چھوٹوں کے حقوق کی معرفت، امن وامان کے قیام کی فکر، ظلم وجور کے خلاف آواز اٹھانے کی جراءت، حق داروں کو حق دلانے اور ظالموں کو ان کے کیفر کردار تک پہونچانے کے لیے جدوجہد، وغیرہ کمالات انسانی کا حامل بنائیں۔

(۷) مذکورہ اصلاحی ودعوتی کاموں اور خدمتوں کے لیے علماء وفضلاء کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے، جو ایک جانب خود کو داعیانہ اوصاف وخصوصیات سے آراستہ وپیراستہ کرے اور دوسری جانب وہ امت کی ذہن سازی واصلاح وتزکیہ کے لیے بھرپور کوشش کرے۔

(۸) اسلام دشمنوں اور حق ناشناس لوگوں اور اہل باطل کی جانب سے اسلام کے خلاف اٹھائے جانے والے شکوک وشبہات کا معقول ومدلل جواب دینے، گمراہ کن تحریکات کی کاٹ کرنے، علمی وعملی بساط پر لوگوں کو بہکانے کے لیے اٹھنے والی باطل آوازوں کا مقابلہ کرنے، بدعات ورسومات کو جاری کر کے کتاب وسنت کی پاکیزہ تعلیمات کا حلیہ بگاڑنے والوں کی ہمت شکنی وجواب دہی کے لیے اور حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کرنے کے لیے ایک ایسے فکرمند وہمت بلند، علم وعمل کے ہتھیار سے لیس طبقے کو تیار کیا جائے، جو ان تمام فتنوں کا بروقت مقابلہ کر کے اسلام کے چہرے کو مسخ ہونے سے بچاتا رہے۔

(۹) ان سب امور میں اس بات کا لحاظ کہ یہاں سے نکلنے والے علماء وفضلاء کی جماعت دین کی بے لوث خادم بنے، اس کی نگاہ مال ودولت پر نہیں؛ بل کہ اللہ پر ہو، وہ دین کا کام محض اللہ کی رضا کے لیے کرے، اس کے پیش نظر آخرت کی فلاح مندیاں ہوں، نہ کہ دنیا کی کامیابیاں۔

ان سب کا خلاصہ اگران الفاظ میں بیان کروں،تو صحیح ہے کہ مدارس دراصل ایسی فیکٹریاں ہیں، جہاں انسان کوانسان بنانے کی تحریکات وکوششیں ہوتی ہیں، جہاں شرافت کی قدروں اورانسانیت کے پیانوں کوتیارکیا جاتا ہے اورانسانوں کواس میں ڈھالا جاتا ہے ،جس سے وہ ایک جانب اپنے مالک حقیقی کی معرفت سے معمور ہوجاتے ہیں اوردوسری طرف اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی وغمخواری،عدل وانصاف، پیارومحبت،اس کی خدمت واداۓحقوق وغیرہ کی صفات سےممتاز ہوجاتے ہیں۔

یہ چنداہم نکات ہیں،جن کےضمن میں مدارس کےکام اوران کےامت ومعاشرے کےدرمیان کلیدی رول کاایک خاکہ اگرکوئی انصاف پسند چاہےتواخذکرسکتاہے۔

حالیہ لوک سبھا انتخابات-ایک جائزہ ایک عبرت

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی انتخابات کے موقعے پر سیاسی کھلاڑی میدان میں اتر کر اپنے اپنے کرتب دکھاتے رہے، لوگوں سے ہمدردی و غمخواری جتاتے رہے، ملک کے حالات وکوائف کو یقینی صورت حال دینے کا جذبہ دکھاتے رہے، گلی گلی کوچہ کوچہ؛ بل کہ گھر گھر و در در گھوم کر اپنے ذاتی کردار یا اپنی پارٹی کے رول کو سراہتے رہے۔ یہی نہیں؛ بل کہ سیاسی پارٹیوں نے ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ مہم چلائی، ہر پارٹی نے اپنے تئیں خوش گمانیوں؛ بل کہ ملک وملت اور انسانیت کے حق میں مفید و کار آمد ہونے کے بلند بانگ دعوؤں کا ایک جال بچھایا اور لوگوں کے مسائل کو چٹکیوں میں حل کر دینے کے سہانے خواب دکھائے۔

اس دورِ انتخابات میں قیاس آرائیوں کا بازار گرم رہا کہ کونسی پارٹی یا کون امیدوار جیتے گا ؟ پھر مختلف پارٹیوں میں سے کون پارٹی حکومت بنانے میں کامیاب ہوگی؟ بی جے پی نے اگر اپنے بارے میں کامیابی کا قیاس کیا تھا، تو کانگریس پارٹی نے بھی اپنے تئیں یہی خواب مسلسل دیکھا اور نہ صرف خود دیکھا؛ بل کہ دوسروں کو بھی دکھایا تھا اور یہی حال دوسری پارٹیوں کا بھی رہا۔

اور اب جب کہ اللہ اللہ کر کے یہ انتخابی مہم کا دور ختم ہوا اور نتائج کا اعلان ہوا تو بعض کی توقع کے عین مطابق تو اکثریت کے بالکل خلاف توقع ''بی جے پی'' نے بھاری اکثریت کے ساتھ میدان جیت لیا اور گجرات کے موجودہ وزیر اعلیٰ نریندر مودی کی لہر پر کامیابی کی مہر ثبت کر دی۔ اب بی جے پی اپنی حکومت تنِ تنہا بنانے کے لیے تیار ہے۔

اس مرتبہ کے انتخابی نتائج نے بڑے عبرت خیز اسباق دیے ہیں، کاش کہ سیکولریت کا دم بھرنے والی پارٹیاں ان پر غور کرتیں! اور کسی نتیجے تک پہنچتیں! اور وہ عبرت خیز اسباق یہ ہیں:

ایک تو یہ کہ سیکولر پارٹیوں نے اشتہار بازی اور پروپگنڈہ مہم تو خوب چلائی؛ مگر اس کے باوجود ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی متعدد وجوہات ہیں:

ایک تو یہ کہ سیکولر ہونے کی دعویدار پارٹیاں زبان وقلم کی حد تک سیکولر ہیں؛ مگر جب عملی میدان میں ان کا تجربہ کیا جائے، تو ان کے دعوے اور عمل میں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی، ان کے یہاں بھی وہی تعصّبات، لوگوں کے مابین تفریق وتقسیم نظر آتی ہے جو ان پارٹیوں میں نظر آتی ہے جو خود کو سیکولر نہیں کہتیں۔

دوسرے یہ کہ ان پارٹیوں نے ہمیشہ ووٹ لینے کے وقت لوگوں سے وعدے کئے؛ مگر افسوس کہ ان وعدوں کو پورا کرنے کا ان کو کبھی خیال نہیں آیا؛ بل کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ ووٹ لینے تک لوگوں سے ملنے اور اپنی خدمات کا ایک طومار پیش کرنے اور اقلیتوں کے مسائل کو اولیت دینے اور ہر ممکن طریقے سے ان کو حل کرنے کے بھرپور دعوؤں اور وعدوں کو محض ووٹ وصول کرنے کا ایک ذریعہ ووسیلے؛ بل کہ کہنا چاہیے کہ ایک حربے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں، جس کا لوگوں کو بار بار تجربہ ہو چکا ہے۔ اس لیے قوم یہ سمجھنے میں مجبور ہے کہ ان پارٹیوں کا کوئی بھروسہ نہیں؛ بل کہ یہ ہمیں الو بنانے کے لیے اور اپنے مفادات کو وصول کرنے کے لیے ووٹ مانگتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ سیاسی پارٹیوں کا بھی اور سیاسی لوگوں کا بھی قوم نے بار بار تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ ان کے پیش نظر ملک کی ترقی وتحفظ ہوتا ہے، نہ قوم کی فلاح و بہبود سامنے ہوتی ہے؛ بل کہ ان کا مطمح نظر ومقصد اعظم صرف اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے، جس کو وصول کرنا اور اس کے لیے ہر اچھا و برا راستہ اختیار کرنا ان کا سب سے بڑا وظیفہ ہوتا ہے۔

ان ساری وجوہات کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اشتہار وتشہیری مہم کے

باوجود سیکولر پارٹیوں کا بری طرح شکست کھا جانا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ قوم اپنے ووٹ کی قوت و طاقت کو ضائع کرنا نہیں چاہتی اور وہ بار بار کے تجربے کے باوجود بار بار گڑھے میں گرنا نہیں چاہتی۔ اس میں تمام سیاسی پارٹیوں اور بالخصوص سیکولر پارٹیوں کے لیے عبرت کا سبق موجود ہے؛ لہذا قوم میں جب تک یہ پارٹیاں اپنا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ بحال نہیں کریں گی، انھیں اسی صورتِ حال سے بار بار دوچار ہونا پڑے گا۔

(۲) سیکولر جماعتوں اور پارٹیوں میں جو آپسی رسہ کشیوں کی فضا، ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیوں کا ماحول اور اختلاف ومخالفت اور انتشار وافتراق کی صورتِ حال پیدا کردی جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ ذہنیتیں اور فاشسٹ طاقتیں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ اس مرتبہ بھی منجملہ اور وجوہات کے سیکولر پارٹیوں کی ناکامی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی بنی ہے۔

اور اس سلسلے میں مسلم قائدین کا کردار بھی نہایت مشکوک رہا، متضاد بیانات اور غیر سنجیدہ وغیر ذمے دارانہ روش نے خود اپنوں سے ان کے اعتماد کو نکال دیا اور ان میں سے بعض نے دوسرے مسلم امیدواروں کو ناکام بنانے کی کوشش وسازش کی اور اپنی ذاتی یا خاندانی یا سیاسی دشمنی نکالنے کا اسی کو موقعہ سمجھا، جس کے نتیجے میں کسی فرقہ واری ذہنیت رکھنے والے امیدوار کا کامیاب ہونا یقینی ہے اور یہی سب ہوا۔

(۳) سیکولر پارٹیوں کے پاس کوئی واضح ومتعین ایجنڈ نہیں ہے، جس کے پیچھے وہ کام کریں اور لوگوں کو دکھا سکیں، اس کے برخلاف آر ایس ایس، اور بی جے پی کے پاس ایک متعینہ وواضح ایجنڈا موجود ہے اور وہ ایجنڈا ومنصوبہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جارہا ہے اور وہ مسلسل اس کے پیچھے کام کرتے چلے آرہے ہیں۔

ان دونوں باتوں کا فرق کیا نتائج برآمد کرے گا، اس کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں؛ بل کہ ہر ذی عقل وہوش اس فرق کے پیش نظر ان کے اچھے برے نتائج کو اخذ کرسکتا ؛ چناں چہ اس کا نتیجہ اب کھلی آنکھوں، مشاہد ہے اور خواہی یا نہ خواہی اس کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔

بہر حال جو ہونا تھا، وہ ہوا اور کوئی بھی ان مقدرات کو ٹال نہیں سکتا؛ لیکن اب غور اس پر کرنا ہے کہ سیکولر پارٹیوں کا اور بالخصوص مسلم قیادت کا اب کیا رول ہونا چاہیے؟ اور وہ موجودہ بی جے پی حکومت اور آر۔ ایس۔ ایس قیادت کو فرقہ واریت سے موڑ کر جمہوری و سیکولر بنیادوں کو قائم کرنے ،قوم و ملک کے مجموعی مفادات کو تحفظ دینے اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو روبہ کار لانے کے سلسلے میں کیا اور کیسی پیش قدمی کر سکتے ہیں؟

☆☆☆

رمضان المبارک کی قدر کیجیے

رمضان المبارک کی تقدس مآبیوں اور عظمتوں وجلالتوں سے ہمکنار ہونے کا دوبارہ موقعہ نصیب ہورہا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا فضل وکرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ورحمتیں اگرچہ کہ بے پایاں وبے شمار ہیں؛ مگر ظاہری نعمتوں کے مقابلے میں روحانی وایمانی نعمتیں جیسے ایمان وتقوی، نیکی وطاعت کی نعمتیں بڑی اور عظیم نعمتیں ہیں اور رمضان کی برکات و فضائل سے متمتع ہونے کا موقعہ دیا جانا بھی ان ہی روحانی نعمتوں ودولتوں میں سے ایک عظیم دولت ونعمت ہے۔

رمضان اپنے ساتھ کیا لاتا ہے؟ اور ہمیں کیا دیتا ہے؟ رحمت خداوندی، مغفرت الٰہی اور جہنم سے آزادی کے پروانے وہ اپنے ساتھ لیتا ہوا آتا ہے اور ہمیں ان سے مالا مال کرنا چاہتا ہے۔

رمضان کے بعد سے رمضان تک اللہ کے بہت سے وہ بندے جو اپنے مالک وخالق کے عارف ہوتے ہیں اور جن کو تعلق مع اللہ نصیب ہوتا ہے، وہ ایک جانب محبت اور عشق لٰہی کی آتش سے گرمی لیتے ہوئے نیکی وطاعت اور ریاضت وعبادت کا سال بھر بھی مزہ لیتے رہتے ہیں، کیا مجال کہ نمازیں ان کی قضا ہوجائیں، نیکی وعبادت میں سستی وغفلت ان کے قریب بھی پھٹکنے پائے، ذکرواذکار اور تلاوت میں سردمہری ولاپروائی کا وہ شکار ہوجائیں؟ اور دوسری جانب وہ خوف وخشیت خداوندی کے کوڑے سے گھبراتے ہوئے گناہوں اور نا فرمانیوں سے، معاصیتوں وجہالتوں سے باز رہنے کا بھی اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ''رحمت کا مژدہ'' لیے رمضان المبارک جلوہ فگن ہوتا ہے۔

اور کچھ لوگ معاشرے میں وہ ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی کا رخ رمضان کے بعد نیکی و طاعت کے بجائے گناہ و معصیت کے طرف ہو جاتا ہے، وہ اپنے رب کو بھول جاتے ہیں، وہ آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں، نیکی و طاعت کی کوئی قدر ان کے پاس نہیں ہوتی، وہ محبت الٰہی کی چنگاری کو غفلتوں و سست گامیوں میں دبا دیتے ہیں، گناہ و معصیت کی راہ کو اپنے لیے اختیار کر لیتے ہیں، ملکوتی طاعات کی جگہ نفسانی لذات کا، ربانی عبادات کے بجائے شیطانی شہوات کا راستہ وہ اپنا لیتے ہیں۔

پھر ان میں سے بعض وہ ہوتے ہیں کہ اپنی اس نادانی و غفلت شعاری پر کبھی کبھی نادم و پشیمان بھی ہو جاتے ہیں اور خود کو اس شیطانی چنگل سے نکالنا بھی چاہتے ہیں اور توبہ کی جانب لپکتے ہیں اور کچھ نیکیاں بھی بجا لاتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں کہ ان کو اپنی ان نادانیوں و غفلت شعاریوں کا احساس بھی نہیں ہوتا اور وہ گناہوں میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ جہنم ان پر واجب ہو جاتی ہیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لیے رمضان مغفرت کا اور دوسری قسم کے لوگوں کے لیے جہنم سے آزادی کا پروانہ لے کر آتا ہے۔

اَللّٰہُ اَکْبَر! کس قدر عظیم نعمتیں و دولتیں ہیں یہ جنھیں رمضان ہمارے لیے لاتا ہے! لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ان نعمتوں کی شکر گزاری کیسے کریں؟ کیا یہ سوچ کر کہ رمضان تو یہ نعتیں ہمارے لیے لایا ہے، وہ خود وقت پر آئے گا اور ہماری جھولیوں میں ڈال جائے گا؟ یہ فیصلہ کر لینا مناسب ہے کہ ہمیں اب کچھ کرنے اور حاصل کرنے کی ضرورت نہیں؟

ظاہر ہے کہ یہ انداز فکر بھی اور یہ فیصلہ بھی کسی ذی عقل و ہوش کا، کسی صاحب فہم و بصیرت کا اور کسی مالک علم و دیانت کا نہیں ہو سکتا؛ بل کہ عقل سے عاری حماقتوں کے کسی پتلے کا تو ہو سکتا ہے، سمجھ بوجھ سے خالی جس کا دماغ ہو وہ، تو ایسا کر سکتا ہے اور ایمانی بصیرت و فراست سے قلب جس کا محروم ہو چکا ہو، وہ تو یہ باور کر سکتا؛ لہذا صحیح سمت اس سلسلے میں یہ ہے کہ ان نعمت ہائے روحانی کا شکر ادا کرنے کے لیے رمضان کے مبارک لمحات و اوقات کو نیکیوں و طاعتوں سے معمور رکھنے، عشق و محبت الٰہی کی آگ سے اپنے دل کو روشن کرنے اور

خوف وخشیتِ خداوندی کے عنصر سے خود کو معاصی و گناہوں سے دور رکھنے کا اہتمام والتزام کیا جائے اور اس سلسلے میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھی جائے، کوئی غفلت قابل درگزر نہ سمجھی جائے، کسی طرح کی غفلت لائق صرف نظر نہ قرار دی جائے۔

دنیا کمانے تو سال بھر کا زمانہ دیا گیا ہے اور خود رمضان میں بھی یہ اگر چہ منع نہیں ہے؛ مگر رمضان کے اس موسم بہار کو صرف دنیا طلبی و مفاد پرستی کی نذر کر دینا اور صبح تا شام اسی کی دھن کا دماغ پر سوار ہو جانا اور عام دنوں ومہینوں کی بہ نسبت اس ماہ میں دنیا کے پیچھے زیادہ سے زیادہ خود کو لگا دینا اور اس کو صرف کمانے کا مہینہ سمجھ کر اپنی ساری توانائیوں وقوتوں کو اسی کے لیے خرچ کر دینا، کیا کوئی جواز اس کا بھی ہوسکتا ہے؟

اللہ غور کرو کہ یہ مہینہ تو تھا نیکیوں وطاعتوں کو کمانے وجمع کرنے کا، رحمت خداوندی کو لوٹنے کا، مغفرت کی تحصیل کا، نجات کی تکمیل کا اور ان سب کے لیے جد و جہد کا، محنت و مجاہدے کا، جسمانی آرام طلبیوں و راحت کوشیوں کو قربان کر دینے کا؛ تاکہ رمضان کے ساتھ بھیجی گئی رحمت حق کا خود کو حق دار بنا سکیں، مغفرت کو پاسکیں، جہنم سے آزادی کا پروانہ حاصل کر سکیں۔

مگر ہائے افسوس کہ اب اس کے خلاف امت مرحومہ کی اکثریت نے روش یہ اختیار کر لی ہے کہ سمجھا جانے لگا کہ یہی ماہ فکر آخرت کے بجائے فکر دنیا کا ہے، اسی میں ہمیں خوب دنیا بٹورنا ہے، اسی میں ہر طرح کی آزادروی اختیار کر کے ہمیں حلال وحرام جو ملے حاصل کر لینا ہے، کتنوں کی اسی روش نے ان کو رمضان میں بھی نماز جیسی عبادت سے محروم کر رکھا ہے، کتنے ہیں، جو اسی بنا پر تراویح سے غافل ہیں، کتنے ایسے ہیں کہ ان کو اس ماہ صیام میں خود صوم یعنی روزہ بھی دشوار بن چکا ہے۔

ایک طرف صورت حال یہ ہے، تو دوسری جانب رمضان کی تیاری وعید کی تیاری کے نام پر امت اسلامیہ نے جو ایک حیرت ناک وتعجب انگیز صورت حال کو جنم دیا ہے، وہ یہ ہے کہ اسی ماہ کا بیشتر حصہ کپڑوں اور دیگر اشیاء کی خریداری کی نذر کر دیا جاتا ہے اور روز روز کوئی

نہ کوئی چیز خرید نے کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور پورے کا پورا گھرانا اور گھرانے کا ہر ہر فرد دکانوں اور بازاروں کے گشت میں اس ماہ مبارک کو ضائع کرتا رہتا ہے؛ یہاں تک کہ لیلۃ القدر جیسی عظیم رات جس کو ﴿ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ ﴾ (ایک ہزار ماہ سے برتر وافضل) قرار دیا گیا ہے، اس کو بھی خاص طور پر اسی خریداری کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔

کسی نے اسی حالت کے پیش نظر کیا خوب کہا ہے:

لَيْسَ الْعِيدُ لِمَنْ لَبِسَ الجَدِيْد　　إِنَّمَا العِيدُ لِمَنْ أَمِنَ مِنَ الوَعِيد
لَيْسَ العِيدُ لِمَنْ تَبَخَّرَ بِالعُوْد　　إِنَّمَا الْعِيدُ لِمَنْ تَابَ وَ لاَ يَعُوْد
لَيْسَ الْعِيدُ لِمَنْ تَزَيَّنَ بِزِيْنَةِ الدُّنْيَا　　إِنَّمَا العِيدُ لِمَنْ تَزَوَّدَ بِزَادِ التَّقْوٰى
لَيْسَ العِيدُ لِمَنْ رَكِبَ المَطَايَا　　إِنَّمَا الْعِيدُ لِمَنْ تَرَكَ الخَطَايَا

(عید اس کی نہیں، جس نے نیا لباس پہن لیا؛ بل کہ عید تو اس کی ہے، جو وعید و عذاب سے بچ گیا، عید اس کی نہیں، جو عود و لوبان کی خوشبو سے معطر ہو گیا؛ بل کہ عید تو اس کی ہوتی ہے، جس نے توبہ کیا اور دوبارہ گناہ کی جانب نہیں لوٹا، عید اس کی نہیں جس نے دنیوی زیب و زینت سے خود کو آراستہ کر لیا ؛ بل کہ عید تو اس کی ہے، جس نے تقوی کا توشہ تیار کیا، عید اس کی نہیں، جو سواریوں پر سوار ہوا؛ بل کہ عید اس کی ہے جس نے گناہ کو ترک کر دیا۔)

اے کاش کہ ہم اس رمضان کو رمضان سمجھ کر اس کا حق ادا کریں اور اس نعمت کی شکر گزاری صحیح طور پر کریں اور اپنے کو رحمتوں اور مغفرتوں کا مستحق بنالیں۔

قربانی-ایک عظیم الشان عبادت

اسلام نے دنیا میں آکر جو سب سے بڑا اور نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے اور اس کی سخت وشدید ترین ضرورت تھی، وہ انسان کا اپنے خالق ومالک سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنا ہے ۔لوگوں نے اپنی جہالت وشیطانی شرارت کے زیر اثر اپنے خالق ومالک کو یکسر فراموش کر دیا تھا اور باطل اور جھوٹے خداؤں سے اپنا رشتہ قائم کر لیا تھا۔اسلام نے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعے لوگوں کو اس گمراہی اور ضلالت سے نکالا اور ان کا رشتہ اپنے مالک حقیقی سے جوڑ دیا اور اس کے لیے جو طریقۂ کار استعمال کیا گیا، وہ اللہ کی عبادت ہے۔کبھی اللہ تعالیٰ کے لیے نماز پڑھنا مشروع ہوا، کبھی زکوٰۃ کی فرضیت کا اعلان ہوا، حج بیت اللہ کی تاکید فرمائی ،روزہ رکھ کر اللہ کو راضی کرنے کا حکم دیا گیا۔یہ سب عبادتیں اللہ تعالیٰ سے انسانوں کے رشتوں کو جوڑنے کے لیے ہی ہیں، اسی سلسلے کی ایک عبادت ''قربانی'' بھی ہے۔

اسلام میں اس عمل کی بڑی فضیلت ہے؛ چناں چہ احادیث میں نبی کریم ﷺ نے اس کی فضیلت پر کلام فرمایا ہے۔چند احادیث ملاحظہ کیجیے:

(۱) ایک حدیث میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ: یہ قربانی کیا ہے یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا:''سنة أبيكم إبراهيم'' (یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ ہمارے لیے ان قربانیوں میں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا کہ ہر بال کے بدلے ایک نیکی ملے گی۔صحابہ نے عرض کیا کہ اس کے اون کا کیا ہوگا یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا کہ اون ہر بال کے عوض بھی ایک نیکی ملے گی۔

(احمد،ابن ماجہ)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قربانی کے جانور کو ذبح کرنے پر اس کے خون کے زمین پر گرنے سے پہلے قربانی کرنے والے کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے ''قربانی کی عبادت'' بڑی ہی فضیلت کی چیز ہے کہ اس سے گناہ بخش دیے جاتے ہیں اور پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر ہر بال پر ایک ایک نیکی ملتی ہے۔سوچیے کہ جانور پر کتنے بال ہوتے ہیں۔ان میں سے ہر ایک بال پر ایک ایک نیکی تو کتنی نیکیاں ملتی ہیں۔پھر نبی کریم ﷺ نے اس عمل کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت بتا کر اس کی مزید اہمیت ظاہر فرمادی کہ یہ عمل اتنے بڑے پیغمبر کا عمل ہے۔

حضرت ابراہیم کی قربانی

چناں چہ قرآن وحدیث اور تاریخ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ کی بارگاہ عالی مقام میں قربانی پیش کرنے کا عظیم واقعہ ثابت ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مرتبہ ۸/ذی الحجہ کی رات کو خواب دیکھا کہ آپ خود اپنے لڑکے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے نام قربانی کرتے ہوئے ذبح کررہے ہیں، چوں کہ حضرات انبیا عَلَیہِمُ الصَّلاۃُ وَالسَّلامُ کا خواب ''وحی'' کے حکم میں ہوتا ہے؛ لہذا آپ نے اس خواب پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔اللہ کے نام پر یہ ضروری سمجھا اور اس کی تعبیر یہ کی کہ اللہ کے نام پر اونٹ ذبح کرنا چاہیے؛ چناں چہ آپ نے اونٹ ذبح کیے ۹/ذی الحجہ کی رات پھر اسی طرح کا خواب دیکھا اور پھر اسی اونٹ کی قربانی دی؛ مگر جب تیسری رات ۱۰/ذی الحجہ کو پھر وہی خواب نظر آیا، تو آپ نے یقین سے جان لیا کہ مراد خداوندی یہ ہے کہ خود اپنے لخت جگر اسماعیل کو قربانی میں پیش کردوں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش سے بہت پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نذر مانی تھی کہ اگر لڑکا ہوگا، تو اس کو اللہ کے نام پر قربان

کردوں گا، پھر امتدادِ زمانہ کی وجہ سے آپ اس نذر کو بھول گئے۔ جب حضرت اسماعیل پیدا ہوئے، تو آپ نے نذر پوری نہ کی ،اس پر آپ کو خواب میں دکھایا گیا کہ آپ اپنی نذر کو پوری کیجیے، اللہ آپ کو اس کا حکم دیتا ہے اور وہ نذر یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنے بچے کو ذبح کیجیے۔ آپ نے یہ خواب سات رات دیکھا اور پھر اس پر عمل کرنے کو تیار ہو گئے۔
(بدائع الزھور علامہ ابن عیاض حنفی: ۹۱)

غرض جب آپ کو یقین ہو گیا کہ اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، تو آپ نے اپنے صاحب زادے سے فرمایا کہ میں نے اس طرح کا خواب دیکھا ہے بتاؤ! اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام نبوت کے گھرانے میں پلے بڑھے تھے ،انھوں نے جواب دیا کہ ابا جی! آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے، وہ کر گزریئے اور آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

چناں چہ باپ بیٹا دونوں اس پر مستعد ہو گئے۔ حضرت ہاجرہ علیہما السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتایا کہ اسماعیل کو تیار کر دو؛ چناں چہ تیار کر کے لے گئے اور منیٰ کے مقام پر قربانی پیش کرنے لیے مستعد ہوئے ۔حضرت اسماعیل نے علیہ السلام فرمایا کہ آپ میرے کپڑے نکال لیں اور بطور نشانی میری والدہ کو دے دیں، مجھے الٹا لٹا دیں اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیں؛ تاکہ ایک دوسرے پر نظر نہ پڑے اور محبت پدری غالب ہو کر تعمیل حکم میں رکاوٹ پیدا نہ ہو جائیں؛ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری لے کر اسماعیل علیہ السلام پر پوری شدت کے ساتھ چلائی؛ مگر عجیب بات یہ ہے کہ چھری نے حضرت اسماعیل علیہ السلام پر کوئی اثر نہ کیا، جب بار بار چھری چلانے پر بھی اس نے نہ کاٹا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری پھینک دی۔ اللہ نے اس بے زبان کو قوت گویائی دیدی، چاقو نے کہا: اے ابراہیم! ایک طرف آپ اللہ کے خلیل ہیں، مجھے کاٹنے کا حکم دیتے ہیں، دوسری طرف اللہ رب جلیل ہے، جو فرماتا ہے

کہ نہ کاٹ۔ میں خلیل کی مانوں یا جلیل کی سنوں۔ اتنے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام جنت سے ایک مینڈھا لے کر آئے اوار حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اٹھا کر ان کی جگہ مینڈھے کو رکھا اور حکم دیا کہ آپ اس کو ذبح کر دیجیے، یہ آپ کے لڑکے کی طرف سے فدیہ ہو گا۔ (بدائع الزھور:۹۲)

یہ واقعہ اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے ورنہ تفصیلات بہت ہیں۔ غرض یہ کہ قربانی کی سنت وعبادت حضرت ابراہیمؑ کے عمل سے جاری ہوئی، اللہ کو یہ عمل اتنا پسند آیا کہ اس کو اسلام کی اہم عبادت قرار دے دیا۔

قربانی کا فلسفہ

اس واقعے سے یہ بات بھی بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ جو قربانی کی جاتی ہے، اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا مظاہرہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبت ہے، یا وہ اللہ کی محبت کے مقابلے میں کسی چیز کو اہمیت دیتے ہیں۔

یہی اللہ کی محبت کا غلبہ (جس کو عام اور عوامی زبان میں عشق کہتے ہیں) قربانی کی روح ہے، اگر کوئی شخص قربانی تو کرتا ہے؛ مگر اس کا یہ اثر ظاہر نہ ہو کہ اللہ کی محبت سب پر غالب ہو جائے، تو روح سے خالی قربانی ہو گی۔

ایک جاہلانہ اعتراض کا جواب

اس تفصیل سے بعض لوگوں کے ایک جاہلانہ اعتراض کا جواب بھی ہو گیا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ دو تین دن میں جو ہزاروں لاکھوں جانور قربانی کیے جاتے ہیں، اس کی بجائے اس کا روپیہ غرباء مساکین کو دے دیا جائے یا غریب لوگوں کی تعلیم وغیرہ میں خرچ کیا جائے، تو یہ روپیہ فائدہ مند ہو گا، ورنہ صرف جانور کاٹ کر کھلانے سے کیا فائدہ؟

یہ اعتراض جاہلانہ ہے کیوں کہ قربانی کا مقصد غربا کی ضروریات پورا کرنا نہیں ہے؛

بل کہ اللہ کی محبت میں ہر چیز کو قربان کرنا، اللہ کی محبت کا مظاہرہ کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد تو اسی وقت حاصل ہوگا، جب کہ اللہ کے حکم کے مطابق قربانی کی جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ ہم اللہ کے حکم کے مقابلے میں کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتے۔

قربانی اور نفس کشی

یوں کہہ لیجیے کہ قربانی نفس کشی کا ذریعہ ہے کہ اللہ کی محبت میں اللہ کے حکم کے مقابلے میں نفس کو مارا جاتا ہے، پھر وہاں من مانی کہاں ہوگی؟ اس لیے قربانی کرنے والے میں اس کا یہ اثر ظاہر ہونا چاہیے کہ وہ اپنے نفس کو کچل دے اور یوں سوچے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے نفس کو کچلا اور بیٹے کی قربانی پیش کی، اسی میں جانور ذبح کر کے دراصل اپنے اندر وہی جذبۂ نفس کشی پیدا کر رہا ہوں۔

یاد رکھو کہ جو آدمی نفس کو نہیں کچلتا، وہ اگرچہ قربانی کرتا ہے؛ مگر حقیقت سے دور ہے۔

قربانی سے عبرت

اسی طرح قربانی سے عبرت لینا چاہیے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنی عقل، اپنے علم، اپنی رشتہ داری، کسی چیز کو بھی اللہ کے حکم کے مقابلے میں ترجیح نہیں دی، اسی طرح ہم کو بھی چاہیے کہ جب خدا کا حکم آ پہنچے، تو وہاں نہ اپنی عقل کو ترجیح دیں، نہ اپنے علم کو، نہ کسی اور کو، بعض لوگ اللہ کے حکم کے مقابلے میں اپنی سمجھ و فہم پر بھروسہ کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، یہ عقل کے خلاف ہے۔ اگر ان لوگوں کو اللہ سے محبت ہوتی، تو ایسی بات ہرگز نہ کہتے اور نہ خدا کے حکم کو ٹھکراتے۔

امت میں موجود بگاڑ کے اسباب

امت اسلامیہ آج جس ایمانی واعتقادی کمزوری وبگاڑ اور عملی بے راہ روی وفساد میں مبتلا ہے وہ تو کسی سے پوشیدہ نہیں؛ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے اسباب و بواعث کیا ہیں، یہ بگاڑ کیوں اور کیسے رونما ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس بگاڑ وکمزوری کے بہت سے اسباب ہیں:

علم دین سے ناواقفیت

ان میں سے ایک بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ اکثر لوگ علم دین سے ناواقف اور دور ہیں اور جب علم دین نہیں ہوتا، تو دین کہاں سے آئے گا؛ لہذا لامحالہ دین سے دور ہو جاتے اور بد عقیدگیوں اور ایمانی کمزوریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے اسلام نے علم دین کی اہمیت وضرورت وفرضیت کا اعلان کیا ہے، ایک حدیث میں حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ »

(علم دین کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔)

(سنن ابن ماجہ: ۲۲۴، مسند ابی یعلی: ۲۸۳۷، معجم اوسط طبرانی: ۹)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی یہی حدیث ان ہی الفاظ کے ساتھ امام طبرانی رحمہ اللہ نے معجم کبیر میں رایت کی ہے۔ (معجم کبیر: ۱۰۲۸۶)

اسی لیے علما وفقہا نے لکھا ہے:

فرائض جیسے اللہ کی معرفت، نماز، روزہ، زکاۃ وحج؛ نیز حلال وحرام امور کا علم فرض عین

ہےاور جو امور فرض کفایہ ہیں، ان کا علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔

علم دین دراصل ایک روشنی ہے، جس سے انسان حق و باطل، اچھے و برے اور صحیح و غلط میں امتیاز کرتا ہے؛ لیکن جب آدمی علم دین کی روشنی سے محروم ہوگا، تو اس کو نہ صحیح عقائد کا علم ہوگا، نہ اچھے عمل کی اس کو پہچان ہوگی، نہ حق و باطل میں تمیز کر سکے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دین ہی سے دور اور ضلالت و گمراہی کی خطرناک وادیوں میں بھٹکتا رہے گا؛ الغرض اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں جہالت و دین سے ناواقفیت کو بڑا دخل ہے۔

اور یہ بات لوگوں کے احوال سے کھلی ہوئی ہے کہ وہ علم دین حاصل ہی نہیں کرتے، بچے پڑھنے کے قابل ہوتے ہی ان کے ماں باپ انھیں اسکول کے حوالے کر دیتے ہیں اور دین کے علم کی کوئی فکر نہیں کی جاتی، بس بہت زیادہ توجہ کی تو یہ کیا کہ کسی مکتب میں ناظرۂ قرآن پڑھا دیا اور کچھ دعائیں اور آداب یاد کرادیے، اس سے آگے دین کا علم کچھ نہیں دیا جاتا۔ اور یہ بھی فارغ اوقات میں بہت غفلت و سستی کے ساتھ حاصل کرایا جاتا ہے۔ تو اس سے اسلامیات کی کیا تعلیم بچے کو حاصل ہوسکتی ہے، اس کا ہر کوئی اندازہ لگا سکتا ہے۔

علمائے ربانیین سے بدظنی و بے تعلقی

امت کے اس بگاڑ و فساد کی ایک وجہ یہ ہے کہ علمائے ربانیین سے امت کا رشتہ کٹا ہوا ہے الا ما شاء اللہ؛ بل کہ امت کے اندر ایک طبقہ باقاعدہ اس کام پر لگا ہوا ہے کہ علمائے حق کو بدنام کیا جائے، امت میں ان سے بدظنی پیدا کی جائے، لوگوں کو ان سے کاٹا جائے اور ان کی بے وقعتی و حقارت دلوں میں پیدا کی جائے۔

اس کا نتیجہ یہی ہے کہ لوگ علمائے حق سے کٹتے اور دور ہوتے جا رہے ہیں، ان سے بے نیازی برتی جا رہی اور اعراض کیا جا رہا ہے اور نتیجتاً دین و علم دین سے بھی کٹتے جا رہے ہیں اور عقائد کے بگاڑ و اعمال کی کمزوری میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

حالاں کہ علما کا طبقہ ہی دراصل وہ طبقہ ہے، جو مآخذ شریعت کتاب و سنت کا علی وجہ الاتم

والا کمل علم ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے سالہا سال کی جد و جہد کرتا اور مصائب و مسائل جھیلتا ہے، بھوک و پیاس، فقر و افلاس، سختی و شدت سب کو برداشت کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں دین و شریعت اور کتاب و سنت کے حقائق و معارف اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور مزید یہ کہ ان کی صداقت و حقانیت، ان کی معقولیت و عالمگیریت پر کامل ایمان یقین رکھتا ہے؛ نیز زندگی بھر لوگوں کی بے التفاتی و ناقدری کے باوجود امت کے اندر دین و شریعت کی حفاظت و اشاعت و ترویج کے لیے خدمات انجام دیتا رہتا ہے۔

مگر افسوس کہ اسی طبقے کو امت کے بعض طبقات ناکارہ و بے ہودہ، غیر ضروری و لایعنی قرار دینے کی کوششوں میں اپنا اوقات صرف کرتے ہیں اور امت کو ان سے کاٹنے و توڑنے کی مساعی کرتے ہیں۔

حالاں کہ ثقہ و جانکار لوگوں نے تحقیق کی اور یہ بتایا ہے کہ اس دور میں علمائے حق کے خلاف فضا بنانے میں یہود و نصاری اور اسلام دشمن طاقتوں کا ہاتھ ہے، جنھوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہے کہ جب تک امت مسلمہ علما سے جڑی رہے گی، اس وقت تک اسلام کو زیر کرنا ممکن نہیں اور جب امت اپنے علما سے کٹ جائے گی اور ان کا کوئی سرپرست و رہبر نہ ہوگا، تو ان کو کفر و ضلالت کی جس وادی میں چاہے لے جا کر گرایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ان لوگوں نے علما کی تحقیر و توہین، ان سے استہزاء و تمسخر، ان سے بدظنی و لاتعلقی پر امت کے افراد کو ابھار دیا ہے؛ تاکہ آہستہ آہستہ لوگ علما سے کٹتے جائیں اور بالآخر ان دشمنوں کے ہاتھ لگ جائیں؛ لہٰذا امت کو اس بدترین فتنے سے واقف ہونا اور دشمنوں کی چالوں سے باخبر رہنا لازم ہے۔

قرآن و حدیث اور دینی علم سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھنے والا کبھی اس بات کو فراموش نہیں کر سکتا کہ علما کے بغیر دین و علم دین کی گاڑی کبھی چل نہیں سکتی؛ بل کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جاہل و اناڑی لوگ دین و علم کی باتیں کر کے اور فتوے دے کر گمراہی کا دروازہ کھول دیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إن الله لا يقبض العلم انتزاعا ينتزعه من العباد ولكن يقبض العلم بقبض العلماء حتى إذا لم يبق عالماً اتخذ الناس رؤوساً جُهّالاً ، فسُئِلوا فأفتوا بغير علم فضلوا و أضلوا»

(بخاری:۹۸، مسلم:۴۸۲۸، ترمذی:۲۶۵۲، ابن ماجہ:۵۲، احمد:۶۵۱۱)

(اللہ تعالیٰ اس طرح علم نہیں چھین لیتے کہ بندوں کے دلوں سے نکالیں؛ لیکن علما کو موت دے کر علم کو چھین لیتے ہیں، یہاں تک کہ جب کسی عالم کو باقی نہ رکھیں گے، تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے اور ان سے مسئلے پوچھیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوی دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔)

یہ حدیث نبوی صاف بتارہی ہے کہ امت کو علما کی کس قدر شدید ضرورت ہے؛ تا کہ ان کا دین وایمان محفوظ رہے اور وہ اپنی ایمانی وروحانی زندگی کا سفر بہ خیر وخوبی پورا کرسکیں۔

کیوں نہ ہو جب کہ حدیث کی شہادت یہ بھی ہے کہ حضرات علمائے کرام کو مقامِ وراثتِ انبیا حاصل ہے؛ چناں چہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«من سلک طريقا يبتغى فيه علما سهل الله له طريقا إلى الجنة، و إن الملائكة لتضع أجنحتها لطالب العلم رضابما يصنع،و إن العالم ليستغفر له من في السماوات ومن في الأرض حتى الحيتان في الماء و فضل العالم على العابد كفضل القمر على سائر الكواكب و إن العلماء ورثة الأنبياء و إن الأنبياء لم يورثوا دينارا و لا درهما و إنما ورثوا العلم فمن أخذه فقد أخذ بحظ وافر»

(ترمذی:۲۶۸۲، ابن ماجہ:۲۲۳، ابن حبان:۲۸۹/۱، مشکل الآثار:۱۰/۳، ابوداود:۳۶۴۳، شرح السنۃ:۲۷۶/۱)

(جو شخص کسی ایسے راستے پر چلے، جس میں وہ علم طلب کرتا ہو، تو اللہ تعالی اس کے لیے جنت کا راستہ آسان بنا دیتے ہیں اور بے شک ملائکہ طالب علم کے لیے اس کے کام سے خوش ہو کر اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور عالم کے لیے وہ ساری مخلوقات، جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں، مغفرت کی دعائیں کرتی ہیں، یہاں تک کہ پانی میں مچھلیاں بھی دعا کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی تمام ستاروں پر چاند کی فضیلت ہے اور بلا شبہ علما انبیا کے وارث ہیں اور انبیا اپنی وراثت میں نہ دینار چھوڑ جاتے ہیں نہ درہم؛ بل کہ وہ تو علم کی وراثت چھوڑتے ہیں، پس جس نے اس علم کو لیا اس نے وافر حصہ لے لیا۔)

اس حدیث میں دیگر فضائل و مناقب کے ساتھ علما کی ایک فضیلت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ انھیں وراثتِ انبیا کا مقام حاصل ہے۔

لہذا علمائے کرام کا وجود امت کے حق میں ایسا ہے جیسا کہ نبی کا وجود، کہ نبی احکام خداوندی سناتا و سمجھاتا اور ان پر چلانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح علما بھی یہی کام کرتے ہیں اور ان کو کرنا چاہیے۔

اور جب تک علمائے کرام سے یہ کام ہوتا رہے گا اور لوگ ان سے استفادہ کرتے رہیں گے، اس وقت تک امت دین اسلام کی شاہراہ پر قائم و دائم رہے گی، ورنہ اس سے ہٹ جائے گی اور جہلائے امت ان کو گمراہ کرنے کی ساری تدبیریں آزماتے رہیں گے، جیسا کہ آج دیکھنے کو ملتا ہے۔

چناں چہ کوئی جاہل تفسیر کر رہا ہے، کوئی محض ڈاکٹر و انجینئر بن کر حدیث و فقہ میں رائے زنی کر رہا ہے اور اسلاف و ائمۂ کرام کی تردید و تغلیط کو شیوہ بنایا ہوا ہے اور لوگ ہیں کہ ان کو مان رہے ہیں اور ان کے بیان پر علما کو ٹھکرا رہے ہیں۔

حالاں کہ یہ بات ایک معمولی دماغ والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ کسی بھی علم کے بارے میں رائے دینے کا حق اسی کو حاصل ہے، جس نے اس علم کے پیچھے اپنی زندگی اور جان و مال لگایا ہو اور اس کے اساتذہ و ماہرین سے ایک معتد بہ زمانے تک اس کو حاصل کیا ہو۔ اور اگر کوئی اس علم سے جاہل و بے بہرہ ہو یا از خود کچھ مطالعہ کیا ہوا ہو اور وہ میڈیکل سائنس یا کسی اور علم کے بارے میں رائے زنی کرنے لگے یا ان علوم وفنون کے ماہرین کو، جنھوں نے اپنی زندگی اس کے پیچھے لگا کر، ماہر اساتذہ سے اس کو حاصل کیا ہے، ان کو جاہل و ناواقف ٹھہرائے اور ان کی بیان کردہ تشریحات وتوضیحات کو غلط قرار دے، تو کیا کوئی عقل منداس کی بات کو قابل توجہ ولائق اعتماد سمجھ سکتا ہے؟

مگر کس قدر حیرت وافسوس کا موقعہ ہے کہ آج امت میں کچھ جاہل واناڑی لوگ، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی پروفیسر، جنھوں نے نہ کسی معتبر اساتذہ سے قرآن وحدیث کے علوم و فنون پڑھے، نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، نہ ایک زمانے تک اس کو معتبر طریقہ سے حاصل کیا؛ بل کہ صرف اپنے ذاتی مطالعے سے یا کسی اپنے ہی جیسے جاہل سے، یا کسی اردو ترجمے کی مدد سے کچھ باتیں سیکھ لیں، وہ لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ قرآن وحدیث کو ہم جتنا سمجھتے ہیں، یہ علماء نہیں سمجھتے اور دین کے بارے میں جس قدر بصیرت ہم کو ہے، علما اس سے خالی ہیں۔ اور مزید حیرت یہ ہے کہ اس قسم کی ہانک اور مجنونوں کی بڑ کو ماننے وتسلیم کرنے والے بھی موجود ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی اناڑی اس قسم کا دعوی میڈیکل سائنس کے بارے میں کرے اور آپ کو دعوت دے کہ ڈاکٹر کچھ نہیں جانتے، میں نے کسی سے پڑھا تو نہیں ہے؛ لیکن میں نے اپنے طور سے میڈیکل سائنس کا بہ غور مطالعہ کیا ہے، میرے پاس سند و سرٹیفکیٹ تو نہیں ہے؛ لیکن میں سرٹیفکیٹ والے ڈاکٹروں سے زیادہ صلاحیت وتجربہ رکھتا ہوں؛ لہذا اپنا علاج میرے سے کراؤ، تو کیا آپ اس کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

اناڑی تو ایک طرف ذرا گریبان میں منہ ڈال کر سوچیے اور بتائیے کہ کیا اگر یہ دعوی کوئی گراجویٹ، کوئی پروفیسر، کوئی انجینئر کرے، تو آپ اس کو روا و درست سمجھتے ہیں؟

نہیں، کیوں؟ ایک تو اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دعوے کرنے والا اس علم کا جانکار نہیں ہے، جو ڈاکٹروں کو حاصل ہے؛ لہذا ڈاکٹر جس نے اپنی زندگی اس علم کی تحصیل کے پیچھے لگائی اور اس کو حاصل کیا اور اس کے لیے محنت و مجاہدہ کیا، اس کے مقابلے میں ایک اناڑی کی بات یا اس علم سے ناواقف شخص کی بات کا کوئی اعتبار نہیں؛ لہذا اس کے دعوے کو ہم یا تو کسی غلط فہمی یا جہالت و حماقت یا تعصب پر محمول کرتے ہیں اور اس سے اپنا علاج کرانے کی حماقت کبھی نہیں کرتے۔ اور دوسرے اس لیے کہ ہمارے نزدیک جان کی بڑی اہمیت ہے؛ لہذا ہم کسی اناڑی کے دعوے کو جو ڈاکٹروں کے خلاف ہے، مان کر اپنی جان ہلاکت میں ڈالنا نہیں چاہتے۔

اور یہ فیصلہ آپ کا بالکل برحق اور سو فی صد صحیح ہے، ایک غیر عالم خواہ وہ اپنی کسی بھی فیلڈ کا ماہر کیوں نہ ہو، قرآن و حدیث کے علوم کا ماہر نہیں کہلا سکتا اور جب تک ایک معتد بہ زمانہ اہل علم، ماہرین قرآن و حدیث کی صحبت و معیت میں رہ کر تحصیل نہیں کرتا، وہ عالم کا مقام نہیں حاصل کر سکتا۔ تو پھر قابل غور یہ ہے کہ دین کے بارے میں یہ اصول و سمجھ و بصیرت لوگوں سے کہاں غائب ہوگئی کہ وہ علما کے مقابلے میں جاہل کو ترجیح دیتے اور اس کی بات کو وقعت دے کر خود کے ایمان کو ہلاکت کے حوالے کر دیتے ہیں؟

لہذا امت کو اپنے علمائے حق و مشائخ ربانیین پر اعتماد ہونا چاہیے اور ان کے مقابلے میں جاہلوں اناڑیوں، ناواقفوں سے دین حاصل نہیں کرنا چاہیے کہ خود ہی جو جانتا نہیں، تو کسی کو کیا وہ رہبری کر سکتا ہے؟

علمائے سوء کی رخنہ اندازیاں

ایک اور بڑا سبب جس کی وجہ سے لوگوں میں ایمان کی کمزوری، عقائد کا بگاڑ اور اعمال کا

فساد جنم لیتے ہیں، وہ ہے علمائے سوء کی حق کے خلاف ریشہ دوانیاں اور رخنہ اندازیاں؛ چوں کہ ان کو دین کے بجائے دنیا مقصود ہوتی ہے، اس لیے وہ دنیا کی خاطر دین کو بیچ دیتے اور حق کو چھپاتے اور تاویل کے پردے میں باطل کی ترویج کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ لوگوں کو حق و باطل میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے اور لوگ حق کے بجائے باطل کو صحیح کی جگہ غلط کو اور سنت کے بدل بدعت کو اپنانے لگتے ہیں۔

اسی بات کو حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''زمانۂ ماضی میں جو بلا و آفت بھی اسلام کے سر پر ٹوٹی، وہ انہیں علمائے سوء کی شومی کی بدولت تھی، بادشاہوں کو یہی علمائے سوء راہ راست سے بھٹکاتے ہیں۔ بہتر فرقے جو گمراہی کی راہ اختیار کر چکے ہیں، ان کے مقتدا یہی علمائے سوء ہیں۔ علما کے ماسوا گمراہیوں کی گمراہی دوسروں تک کم ہی تجاوز کرتی ہے۔''

(مکتوبات دفتر اول حصہ دوم، ص ۱۸۰، مکتوب نمبر: ۴۷)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ''آپ کو معلوم ہے کہ زمانۂ سابق میں جو فساد پیدا ہوتا، وہ علما کی ہی کمبختی سے ظہور میں آیا تھا، اس بارے میں امید ہے کہ پورا پورا تتبع مد نظر رکھ کر علمائے دیندار کے انتخاب کرنے میں پیش دستی کریں گے، علمائے بد دین کے چور ہیں، ان کا مقصود ہمہ تن یہ ہے کہ خلق کے نزدیک مرتبہ و ریاست و بزرگی حاصل ہو جائے۔ العیاذ باللہ من فتنتھم ''اللہ تعالیٰ ان کے فتنے سے بچائے''۔

(مکتوبات دفتر اول حصہ سوم، ص: ۱۲۰، مکتوب نمبر: ۱۹۴)

الغرض علمائے سوء کا فتنہ امت کے حق میں ایک نہایت ہی خطرناک اور بڑا فتنہ ہوتا ہے۔

اسکول وکالج ایمان کے لیے قتل گاہیں

اس صورت حال کے پیدا کرنے میں جہاں اور بہت سے عوامل واسباب کام کررہے ہیں، وہیں ایک بڑا عامل وسبب موجودہ عصری تعلیم گاہیں بھی ہیں، جہاں کا نصاب ونظام اسی قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں۔اسی وجہ سے اس نظام کے تحت پرورش پانے والے لوگ عام طور پر بے دینی اورالحادودہریت یا کم ازکم دین ومذہب کے بارے میں تشکک وتذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسلام اور اس کی تعلیمات پر حملے کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے اپنے خطبات میں فرمایا ہے:

”جدید تعلیم میں مذہبی اثر نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں تعلیم یافتہ مذہبی مسائل کو تقویم پارینہ سمجھتے ہیں، اخباروں میں آرٹیکل نکلتے ہیں کہ اسلام کا قانون وراثت خاندان کو تباہ کردینے والا ہے؛ اس لیے اس میں ترمیم ہونی چاہیے، ایک صاحب نے مضمون لکھا کہ رسول اللہ ﷺ جب مکے میں تھے ،پیغمبر تھے ، مدینہ جاکر بادشاہ ہو گئے اور اس لیے قرآن مجید میں جو مدنی سورتیں ہیں۔ وہ خدائی احکام نہیں؛ بل کہ شاہانہ قوانین ہیں، ایک موقعے پر مجھ سے لوگوں نے لکچر دینے کی درخواست کی ، میں نے پوچھا کس مضمون پر لکچر دوں؟ ایک گریجویٹ مسلمان نے فرمایا کہ اور چاہے جس مضمون پر تقریر کیجیے؛ لیکن مذہب پر نہ کیجیے، ہم لوگوں کو مذہب نام سے گھن آتی ہے (نقل کفر کفر نہ باشد) یہ صرف دوچار شخص کے خیالات نہیں، مذہبی بے پروائی کی عام وبا چل رہی ہے،فرق یہ ہے کہ اکثر لوگ دل کے خیالات دل ہی میں رکھتے ہیں اور بعض دلیر طبع لوگ ان کو ظاہر بھی کردیتے ہیں۔“

(خطبات شبلی:۵۸-۵۹)

علامہ اقبال رحمہ اللہ جوان ہی کالجوں کے پروردہ اور یورپی دنیا اور وہاں کے لوگوں کی عیاریوں و مکاریوں سے خوب واقف تھے، انھوں نے ان ہی حالات کے مطالعے و مشاہدے کے بعد کہا تھا:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے شارحِ اقبالیات: پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے:

"تعلیم حاصل کر کے نوجوانوں کو سرکاری ملازمت تو بیشک مل جاتی ہے؛ لیکن اس مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کے اندر الحاد کا رنگ بھی تو پیدا ہو جاتا ہے، مسلمان کے گھر میں دولت آرہی ہے؛ لیکن کفر کی لعنت بھی اس کے ساتھ ساتھ داخل ہو رہی ہے، تو ایسی دولت کس کام کی؟ واضح ہو کہ مغربی تعلیم کے مضر ہونے پر اقبال نے فیصلہ ۱۹۱۳ء میں صادر کیا تھا، اور قوم اس وقت سے لے کر تا ایندم اسی سمِ قاتل کو نوشِ جانِ ناتواں فرما رہی ہے، تو ناظرین خود اندازہ کرلیں کہ مریض اب کس منزل میں ہوگا؟۔"

(بانگ درا مع شرح ص/۵۵۷ تا ۵۵۸)

غرض یہ کہ مغربی تعلیم کی ساخت و پرداخت ہی کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس سے کفر وشرک اور بغاوت وطغیانی اور الحاد ودہریت کے جذبات وخیالات جنم لیتے اور پرورش پاتے ہیں؛ کیوں کہ ان تعلیم گاہوں میں علوم فنون کی تعلیم کا جو منہج ہے، وہ مغربی ثقافت و تہذیب کے مزاج وخصوصیات سے تشکیل پایا ہوا ہے اور ان فکری وفلسفیانہ رجحانات کا آئینہ دار ہے، جن سے مغربی ثقافت وتہذیب پروان چڑھی ہے۔

عقائد ونظریات کے علاوہ اس مغربی تہذیب وثقافت کے اثر سے مسلم سماج کو بے حجابی ،عریانیت، فحاشی وننگے پن کا ایک سیلاب بلاخیز بھی اپنی رو میں بہالے جارہا ہے اور فیشن

کے نام پر انسانیت سوز مراسم و انداز اختیار کیے جا رہے ہیں۔

بہت سارے لوگ اس حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی سامراج نے جو مغربی تعلیم نظام رائج کیا، اس کا مقصد انگریزی تعلیم سے زیادہ انگریزیت کی تعلیم تھی، وہ اس نظام کے ذریعے ہندوستانی لوگوں میں انگریزی ذہنیت کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس کی تصدیق ''لارڈ میکالے'' کی رپورٹ سے ہوتی ہے، جو اس نے ۱۸۵۳ء میں مقبوضہ ہندوستان کے گورنر جنرل کو پیش کی تھی؛ چناں چہ وہ کہتا ہے:

> ''ہمیں اس وقت بس ایک طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے، جو ہمارے اور ان کروڑں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے، جن پر ہم اس وقت (ہندوستان میں) حکمران ہیں، ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو؛ مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم وفراست کے نقطۂ نظر سے انگریز ہو۔''

(میکالے کا نظریۂ تعلیم ص/ ۶۹' بہ حوالہ ہمارا نظامِ تعلیم ص/ ۵۰)

الغرض جدت پسندی کے اس طوفان نے اس طبقے کے ایمان کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور وہ بے ایمانی وارتداد کی طوفانی لہروں میں غوطے کھاتا دکھائی دے رہا ہے۔

ڈش، ٹی وی، انٹرنیٹ، موبائیل

بے دینی یا دین سے دوری کی موجودہ فضا کے پروان چڑھانے میں ایک بڑا زبردست عامل و باعث فحش و بے حیائی کے وہ عوامل و اسباب ہیں، جو آج ہر ہر گھر کی زینت بنے ہوئے ہیں، جیسے اخبارات، میگزین، ریڈیو، ٹی وی، ڈش، موبائیل فون اور انٹرنیٹ وغیرہ، جن سے انتہائی منظّم طریقے پر انسانی وروحانی اقدار واخلاقی رجحانات کو پامال کرنے اور ان کی جگہ دینی بے حسی، اخلاقی گراوٹ، فکری بے راہ روی، جنسی آوارگی، نفس پرستی وعیش کوشی، مادیت پسندی ودنیا طلبی کو اجاگر کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

نتیجہ واضح ہے کہ امت کے نوجوان لڑکوں ولڑکیوں میں آزادیٔ افکار و عملی بگاڑ، اخلاقی گراوٹ، جنسی انارکی، فحش و بے حیائی، دین و اہل دین سے بے زاری، علم دین کی حقارت و بے وقعتی جیسے انتہائی خطرناک رجحانات اور مفسد جراثیم منتقل ہو رہے ہیں؛ بالخصوص انٹرنیٹ کی دنیا سے وابستہ لوگوں کا حال اس سلسلے میں سب سے زیادہ ناقابل بیان ہے۔

ایک دور ایسا تھا کہ کوئی فحش و بے حیائی کی باتوں کو دیکھنا چاہتا یا کسی غیر غلط تعلق کو قائم کرنا چاہتا، یا کسی بے ہودہ عناصر سے وابستہ ہونا چاہتا، تو اس کو دوسروں کے سامنے ظاہر ہونا پڑتا تھا، جس کی وجہ سے اس کی برائی دو چار لوگوں کے سامنے آجاتی تھی اور پھر اس کی اصلاح کی بھی تدبیریں سوچی جاسکتی تھیں اور اصلاح کی امیدیں بھی رکھی جاسکتی تھیں؛ مگر اب حال یہ ہے کہ موبائیل میں چپ لگا کر، یا انٹرنیٹ سے کیا کیا دیکھ، یا سن رہا ہے اور کس سے کیا تعلقات وابستہ کر رہا ہے، اس کا کسی کو پتہ تک نہیں چلتا، نہ ماں باپ کو، نہ کسی استاذ یا سر پرست کو، تو اصلاح کی کیا تدبیر کیا جائے گی؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ برائیاں وخبائث اندر اندر جڑ پکڑتے جاتے ہیں اور جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے، تو کوئی اصلاح کی امید بھی نہیں رہتی۔

اس طرح کتنے لڑکے ولڑکیاں برباد ہو چکے ہیں، کتنوں نے اپنی زندگیاں خراب کر لی ہیں، اس کا حساب و اندازہ مشکل ہے۔

یہ چند عناصر و اسباب ہیں، جو اس زمانے میں امت کے اندر لادینی والحاد کی فضا قائم کر رہے ہیں۔

اسلامی قانون کی بالادستی

قرآنی تشریع وقانون کا ایک اعجاز یہ ہے کہ اس میں معقولیت وعقلیت پسندی پائی جاتی ہے؛ چناں چہ حضرات علما وائمہ نے قانون شریعت کی معقولیت کو اپنی تصنیفات وتالیفات میں پوری شرح وبسط کے ساتھ واضح کیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن القیم، امام غزالی، امام رازی، اور پھر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس پہلو پر سیر حاصل بحثیں فرمائی ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا:

”لا یوجد نصٌّ یخالف قیاساً صحیحاً کما لا یُوجَد معقولٌ صریحٌ یخالف المنقول الصحیح“

(الفتاوی الکبری:۱/۱۵۸، اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل:۴/۱۸۶)

(کوئی نص ایسی نہیں ملتی، جو قیاس صحیح کے خلاف ہو، جس طرح کوئی صریح معقول ایسا نہیں ملتا، جو منقول صحیح کے خلاف ہو۔)

ز ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

”ما عُلِمَ بصریح العقل لا یُتَصَوَّرُ أن یُعارِضَه الشرعُ البتةَ، بل المنقول الصحیح لا یعارضه معقول صریح قط“

(درءتعارض العقل والنقل:۱/۸۳)

(جو بات عقل صریح سے معلوم ہو اس میں یہ بات متصور ہی نہیں ہوسکتی کہ

شرع اس کے معارض ہو؛ بلکہ معقول صریح کے خلاف منقول صحیح کبھی نہیں ہوسکتا۔)

اور علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

”وقد تدبرت ما أمكنني من أدلة الشرع فما رأيت قياسا صحيحا يخالف حديثا صحيحا كما أن المعقول الصحيح لا يخالف المنقول الصحيح“

(مجموع الفتاوی: ۲۰/ ۵۶۷)

(میں نے دلائل شرع میں جس قدر ممکن تھا غور کیا، پس میں نے کوئی قیاس صحیح ایسا نہیں پایا، جو حدیث صحیح کے خلاف جاتا ہو، جیسے کہ بلا شبہ معقول صریح منقول صحیح کے خلاف نہیں ہوتا۔)

اور علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”**إعلام الموقعين**“ میں ایک فصل مستقل اس عنوان پر قائم فرمائی ہے:

” فصل في بيان أنه ليس في الشريعة شيء على خلاف القياس “ (اعلام الموقعین: ۲/ ۳)

(یہ فصل اس بیان میں ہے کہ شریعت میں کوئی بات خلاف عقل نہیں)

اسی فصل میں بہت طویل کلام کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

«فهذه بنذة يسيرة تطلعک على ما وراء ها من أنه ليس في الشريعة شيء يخالف القياس ولا في المنقول عن الصحابة الذي لا يعلم لهم فيه مخالف و أن القياس الصحيح دائر مع أوامرها و نواهيها وجودا و عدما كما أن المعقول الصحيح دائر مع أخبارها وجودا و عدما ، فلم يخبر الله رسوله بما يناقض صريح العقل و لم يشرع ما يناقض الميزان والعدل »

(یہ چند چیزیں ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ شریعت میں کوئی شی خلاف عقل نہیں ہے اور یہ کہ قیاس صحیح اس کے اور اوامر ونواھی کے ساتھ وجوداًوعدماًدائر ہے، جس طرح معقول صحیح اس کے اخبار کے ساتھ وجوداًوعدماًدائر ہے؛ لہذا اللہ نے اپنے رسول کو ایسی بات کی خبر نہیں دی، جو عقل صریح کے خلاف ہو اور نہ ایسی چیز کو مشروع کیا، جو عدل وانصاف کے مناقض ہو)

(اعلام الموقعین:۲/۷۱)

اس کے بالمقابل دنیا کے وضعی قوانین کا حال یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی معقولیت پائی جاتی ہے، کہ انصاف پسندی، اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیجیے، جس کو حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی نے کینڈا کے مشہور ہفت روزہ اخبار: NATIONAL ENQUIRER کے حوالے سے یہ خبر مع اپنے تبصرے کے نقل کیا ہے:

”کینڈا کے علاقے ”برٹش کولمبیا“ میں ایک وحشت ناک مجرم ”CLIFFORD OLSON“ کو قتل، زنا بالجبر اور غیر فطری عمل کے الزام میں گرفتار کیا گیا، یہ شخص نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو روزگار دلانے کے بہانے اپنے ساتھ لیجاتا، ان کو نشہ آور گولیاں کھلاتا، ان کے ساتھ زبردستی جنسی عمل کرتا اور بالآخر قتل کر کے ان کی لاشیں دور دراز کے مقامات پر دفن کر دیتا تھا، گرفتاری کے بعد اس شخص نے یہ اعتراف کیا کہ اس نے گیارہ نوعمر بچوں اور بچیوں کے ساتھ زیادتی کر کے انہیں قتل کیا ہے، ان کی لاشیں مختلف مقامات پر چھپادی ہیں۔اور قتل بھی اس بربریت کے ساتھ کہ جب ایک بچے کی لاش برآمد ہوئی، تو اس کے سر میں لوہے کی ایک میخ ٹھوکی ہوئی پائی گئی، جب یہ اقبالی مجرم گرفتار ہوا تو پولیس نے اس سے مطالبہ کیا کہ جب گیارہ

بچوں کو اس نے بربریت کا نشانہ بنایا ہے، ان کی لاشوں کی نشاندہی کرے۔ اس ستم ظرف نے اس مطالبے کا جو جواب دیا، شاید اس سے پہلے وہ کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ آیا ہو۔ اس نے کہا کہ مجھے وہ سات مقامات یاد ہیں ، جہاں میں نے ان بچوں کی لاشیں دفن کی ہیں؛ لیکن میں ان مقامات کا پتہ مفت نہیں بتا سکتا، میری شرط یہ ہے کہ آپ مجھے فی لاش دس ہزار ڈالر معاوضہ ادا کریں۔ ایک مجرم کی طرف سے یہ ریکارڈ مطالبہ تو جیسا کچھ بھی تھا، دلچسپ بات یہ ہے کہ پولیس نے بھی اس کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا، اخبار کا کہنا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہیں تھا، جس کی بنا پر اسے لاشیں برآمد کرنے پر مجبور کیا جا سکے، اس لیے پولیس کو اس کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ البتہ پولیس نے ملزم کی خوشامد درآمد کے بعد زیادہ سے زیادہ جو رعایت اس مجرم کو حاصل تھی، وہ یہ کہ اگر دس لاشوں کی برآمدی کا معاوضہ یعنی ایک لاکھ ڈالر پولیس مجھے ادا کرے؛ تو گیارہویں بچے کی لاش میں مفت برآمد کردوں گا، پولیس نے اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اولسن کو ایک لاکھ ڈالر کا معاوضہ ادا کیا، اس کے بعد اس نے کینڈا کے مختلف شہروں سے گیارہ بچوں کی لاشیں پولیس کے حوالے کیں، گیارہ بچوں کی تصویریں بھی اخبار نے شائع کی تھیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بچے بارہ سے اٹھارہ سال تک کی عمر کے ہوں گے، اس تفتیش، اعتراف اور ایک لاکھ ڈالر کے نفع بخش سودے کے بعد مجرم پر مقدمہ چلایا گیا۔ چوں کہ کینڈا میں سزائے موت (وحشیانہ) قرار دے کر ختم کر دی گئی ہے، اس لیے عدالت کلفر ڈولسن کو جو زیادہ سے زیادہ سزا دے سکی وہ عمر قید کی سزا تھی۔ البتہ عدالت نے جرم کی سنگینی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ سفارش ضرور کردی کہ اس مجرم کو کبھی پیرول پر رہا نہیں کیا جا سکے گا۔ اخبار نے سفارش

کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید عدالت کو ایسا حکم دینے کا اختیار نہیں تھا، وہ صرف سفارش ہی کر سکتی تھی۔

ان گیارہ بچوں کے ستم رسیدہ ماں باپ کو جب یہ پتہ چلا کہ جس درندے نے ان کے کمسن بچوں کی عزت لوٹ کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا، اسے ایک لاکھ ڈالر کا معاوضہ ادا کیا گیا ہے، تو قدرتی طور پر ان میں اضطراب اور اشتعال کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے اولسن پر ایک ہرجانے کا مقدمہ دائر کیا، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ کینیڈا کے ٹیکس کے دھندگان جو ایک لاکھ ڈالر اس درندہ صفت مجرم کی جیب میں گئے ہیں، کم سے کم وہ اس سے واپس لے کر مرنے والے بچوں کو ورثاء میں دلوئے جائیں؛ لیکن ان کو اس مقدمے میں شکست ہوگئی، اپیل کورٹ نے بھی ان کا مقدمہ خارج کر دیا اور سپریم کورٹ نے مقدمہ سننے سے بھی انکار کر دیا۔

دوسری طرف مجرم اولسن نے ہائی کورٹ میں ایک درخواست دی ہے کہ جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اسے جیل میں بہتری رہائش سہولیات {Better Prison Accommodation} فراہم کی جائے، ہائی کورٹ نے یہ سماعت کے لیے منظور کر لی ہے۔ جن لوگوں کے بچے اس بر بریت کا نشانہ بنے، انھوں نے اس صورت حال کے نتیجے میں ایک انجمن بنا ئی، جس کا نام ''نشانہ ہائے تشدد'' {Victims of Violence} ہے ،اس انجمن نے پارلمنٹ کے ارکان سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ کینیڈا میں سزائے مو ت کا قانون واپس لایا جائے۔ اس انجمن کے ایک ترجمان نے اخبار کے نما ئندے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ

''ہم نے ہار نہیں مانی ہے، ہم نے ایک گروپ بنایا ہے اور ہم نے کینیڈا کی

پارلمنٹ کے ارکان سے مطالبہ کیا ہے کہ کینڈا میں سزائے موت کو واپس لایا جائے ،اولسن جیسے درندوں کو سیدھے جہنم میں بھیجنا چاہیے، جہاں کے وہ واقعتاً مستحق ہیں۔

(ذکر وفکر:۳۶-۳۹)

کیا اس سے کسی ذی عقل و ہوش کو اس بات کے اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش آتی ہے کہ موجودہ وضعی قوانین ایک جانب جرائم کی سزاؤں کا ایک نامکمل خاکہ ہی پیش کرتے ہیں،تو دوسری جانب جرائم کو ختم یا کم کرنے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں ہے؛ بل کہ اور جرائم کا بازار گرم کرنے میں معین بنتے ہیں۔

☆☆☆

رسم پرستی یا دین پرستی؟

آج امت جن کمزوریوں اور کوتاہیوں میں ملوث ہے، ان کی تو ایک طویل وعریض فہرست ہے، ان میں سے ایک کمزوری وکوتاہی ''حقیقت پسندی کے بجائے رسم پرستی کا رجحان'' ہے اور اس کمزوری کے بڑے چھوٹے مختلف افراد ہیں یا کہیے کہ مختلف درجات ہیں ،جن میں سے بعض بھیانک وخطرناک قسم کے بھی ہیں۔اور حیرت انگیز یہ ہے کہ اس کمزوری کے شکار صرف وہ لوگ نہیں ہیں، جو عوام کہلاتے ہیں؛ بل کہ خواص امت بھی اس میں مبتلا پائے گئے ہیں اور صرف افراد ہی نہیں جماعتوں اور تحریکات کو بھی اس میں ملوث دیکھا گیا ہے،جس کی وجہ سے لوگ محض رسمیت وسطحیت پر چلنے کو دین سمجھنے لگے اور حقیقت پسندی سے کوسوں دور ہو گئے۔

اور اس بیماری وکمزوری نے اسلامی شیرازے کی اوپر سے نیچے تک پورے طور پر چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں، کیا عقائد وایمانیات، کیا اعمال وعبادات، کیا اخلاق وکردار، کیا معاملات ومعاشرت؛ سب ہی امور میں ضعف وکمزوری پیدا کر دی ہے۔

رسم پرستی کے رجحان کی بہت سے مثالیں دی جا سکتی ہیں، جو اس وقت امت میں رائج ہو چکی ہیں اور یہاں سے وہاں تک اس طرح ان کا چلن ہو چکا ہے کہ لوگ اس کمزوری وعیب کو اب کمزوری وعیب بھی خیال کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ یہاں چند صورتوں کا تذکرہ کر دینا مناسب ہے،جن میں ابتلائے عام ہے۔

(۱) رسم پرستی کی ایک صورت یہ ہے کہ لوگ اسلامی عقائد ونظریات کو ماننے کے

باوجود ان عقائد کی حقیقت سے غافل، ان کی کیفیات سے دور اور نتیجتاً ان کے اثرات سے محروم رہتے ہیں؛ چناں چہ بیشتر لوگ اسلامی عقائد کو محض رسمی طور پر مان کر چل رہے ہیں، ان کو پوچھیے، تو کہیں گے کہ ہم مسلمان ہیں؛ لیکن بجائے خود مسلمانی کس چیز کا نام ہے اور ان اسلامی عقائد کی حقیقت کیا ہے؟ اس سے بے خبر ہیں۔ بہت سے لوگ یہ تک نہیں جانتے کہ اللہ ورسول پر ایمان کا کیا مطلب ہے؟ جب اللہ کو رب و مالک و خالق مان لیا، تو اس کا کیا تقاضا ہے؟ اللہ کے کلام قرآن کو اور اس کے احکامات کو مان لینے کا کیا خلاصہ ہے؟ کیا صرف یہ کہ ہم مسلمان کہلائیں اور کبھی خود اللہ ورسول اور ان کے احکامات کو ٹھکراتے جائیں؟

ایسا لگتا ہے کہ بہت سے لوگ محض اس لیے مسلمان ہیں کہ ان کا خاندان اور ان کے والدین وغیرہ مسلمان ہیں اور ان کا نام مسلمانوں جیسا رکھ دیا گیا ہے۔ گویا یہ اصلی مسلمان کے بجائے نسلی مسلمان کہلانے کے مستحق ہیں۔

(۲) رسم پرستی کی دوسری صورت یہ ہے کہ لوگ اعمال وعبادات وغیرہ کو ان کی حقیقی روح اور ان کے اصلی منشأ ومقصد سے غافل ہو کر انجام دیتے ہیں اور کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان عبادتوں اور اعمال کا مقصد ومنشا کیا ہے؟ یہ صورت پہلی صورت سے زیادہ بری وقابل اعتراض ہے؛ کیوں کہ اس سے اعمال وعبادات بے جان رہ جاتے ہیں اور انسان ان کی اصلیت وحقیقت سے محروم رہ جاتا ہے۔

جیسے بعض لوگ نماز تو پڑھتے ہیں؛ مگر ایک رسم کے طور پر، کہ وضو کیا اور جلدی جلدی سے ارکان وافعال نماز کو ظاہری طور پر ادا کر کے چل دیے؛ مگر یہ سوال کہ نماز کیا حقیقت و اصلیت رکھتی ہے، اس کی مشروعیت کی وجہ کیا ہے؟ نماز سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ اس کا میری زندگی سے کیا تعلق ہے؟ اور یہ کہ اس کو مجھے کس طرح انجام دینا چاہیے؟ ہائے افسوس کہ ان امور پر غور کرنے وتوجہ دینے کی کسی کو فرصت نہیں ہے!

ظاہر ہے کہ جب نماز محض چند ظاہری افعال و ارکان تک محدود ہوگی اور اس کی اصلیت وحقیقت تک نہیں پہنچے گی، تو اس کی حقیقی برکات سے بھی ضرور محرومی رہے گی اور آج

یہی ہو رہا ہے کہ نماز پڑھنے والے نماز پڑھ تو رہے ہیں؛ لیکن ان کی نمازیں روح وحقیقت سے خالی ہیں، ان میں نہ خشوع وخضوع ہے، نہ اللہ سے پیار وتعلق کا کوئی عنصر ہے، نہ اللہ کی بڑائی کا تصور ہے، نہ خود کی بے بسی ولاچارگی کا مظاہرہ، نہ انابت الی اللہ وتوجہ الی اللہ۔

یہی حال دیگر عبادات واعمال کا بھی ہے، کہ محض رسم رہ گئی اور حقیقت نگاہوں سے پوشیدہ ہوگئی اور علامہ اقبال کی بات صادق آئی:

رہ گئی رسمِ اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

(۳) رسم پرستی کی ایک بہت ہی خطرناک وبھیانک شکل یہ ہے کہ کسی دینی حقیقت کو اپنی جانب سے کسی رسم ورواج کا لباس پہنا دیا جائے اور حقیقت سے غفلت وروگردانی برتی جائے اور اسی رسم ورواج کو حقیقت کا درجہ دے دیا جائے۔ یہ صورت سب سے زیادہ گھناؤنی وخطرناک ہے، جس میں دین کو بے دینی بنا دیا جائے، اللہ ورسول کے نام پر دینی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ "عشق نبی" ایک دینی حقیقت ہے اور اتنی بڑی حقیقت کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لا یؤمن أحدکم حتی أکون أحب إلیه من والده و ولده والناس اجمعین»

(کوئی شخص اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ مجھ سے اپنے والدین اور اولاد اور انسانوں سے زیادہ محبت نہ رکھے۔)

اور جیسے ایمان کی ایک حقیقت ہے، اسی طرح عشق نبی کی بھی ایک حقیقت ہے اور وہ کیا؟ وہ یہ کہ اس کی وجہ سے انسان آپ کا نہایت مطیع وفرماں بردار ہو جائے اور جو آپ حکم

دیں، اس کو بہ سروچشم قبول کرے اور جس سے منع کریں، اس سے رک جائے اور اپنی جان و مال کو آپ کے دین کی حفاظت واشاعت میں قربان کرے اور ایک ایک سنت پر عمل کے لیے بے چین ہو جائے۔

ایک حدیث میں اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے سب امتی جنت میں داخل ہوں گے، سوائے ان کے جو میرا انکار کریں، صحابہ نے پوچھا کہ انکار کرنے والے کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«من أطاعني دخل الجنة و من عصاني فقد أبى» (بخاری:۷۲۸۰)

(جس نے میری اطاعت کی، وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو میری نافرمانی کرتا ہے، وہی میرا انکار کرنے والا ہے۔)

غور کیجیے کہ اللہ نے نبی ﷺ نے اولاً تو یہ فرمایا کہ میرا ہر امتی جنت میں جائے گا، سوائے اس کے جو میرا انکار کرے اور جب یہ پوچھا گیا کہ انکار کون کرتا ہے؟ تو انکار کرنے والوں کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ''جو میری نافرمانی کرتا ہے، وہی میرا انکار کرتا ہے''، معلوم ہوا کہ امتی اصل میں وہی ہے اور وہی آپ کا سچا عاشق ہے، جو آپ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے؛ لہذا جو لوگ عشق کی بات کرتے ہیں؛ مگر اطاعت والا معاملہ نہیں کرتے؛ بل کہ آپ کے دین کا حلیہ بگاڑتے اور دین وسنت کے نام پر دین میں من مانی رسم ورواج داخل کرتے ہیں اور جو عشق محمدی کے نام سے آپ کی مرضیات کے خلاف وہ کام کرتے ہیں، جن کو آپ نے ممنوع قرار دیا، وہ کسی طور پر بھی عشق والے نہیں ہو سکتے اور ان کا یہ دعوی سچا نہیں ہوسکتا۔

مگر ہائے افسوس کہ آج ''عشق نبی'' کی یہ دینی حقیقت بہت ساری خرافاتی چیزوں، من گھڑت بدعتوں، خلاف دین وشریعت کاموں کا عنوان بن گئی ہے اور لوگ ربیع الاول کے مقدس ومحترم مہینے میں ''اللہ کے نبی کی محبت'' کے نام پر وہ سب کچھ کرنے لگے ہیں، جو

خداورسول کے احکامات سے کھلی بغاوت، دین وشریعت کا مذاق وکھلواڑ اور دینی حقائق میں تحریف اور ادل بدل کہلائے جانے کے لائق ہیں۔

اب میلاد النبی و عشق نبی کی مجالس وجلوسوں کا حال یہ ہے کہ ان میں عشق نبی و میلاد النبی کے نام سے ظلم و جہالت کے ایسے ایسے شرمناک مظاہرے کیے جاتے ہیں کہ ان کے انجام سے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ان میں گانا بجانا، ناچنا، شور و ہنگامہ، مختلف قسم کے کھیل کود و تماشے، یہ سب کر کے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے عشق نبی کا حق ادا کر دیا۔مزید برآں یہ کہ ان لوگوں میں نہ نماز ہے، نہ تلاوت، نہ ذکر واذکار، نہ درود وسلام کا اہتمام،، نہ سنتوں سے تعلق ومحبت، نہ ان کا التزام، کیا کوئی معمولی سمجھ رکھنے والا بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ امور عشق نبی کا تقاضا ہیں یا میلاد النبی منانے کا انداز ہے؟

یہاں ایک بات عرض کرتا چلوں کہ دیوبندی و بریلی مکاتب فکر میں جو یہ اختلاف چلا آرہا ہے کہ میلاد النبی منانا جائز ہے یا نہیں؟ یہ اختلاف اس صورت میں ہے، جب کہ اس میں کوئی ایسی کھلی ہوئی باغیانہ وخلاف شریعت بات نہ ہو، اس صورت میں علمائے دیوبند یہ کہتے ہیں کہ، چوں کہ صحابہ واسلاف کرام سے خاص میلاد کے دن میلاد النبی منانے کا ثبوت نہیں ہے، جب کہ وہ حضرات ہم سے زیادہ اللہ کے رسول سے عشق ومحبت رکھتے تھے؛ لہذا ہماری جانب سے اس کو ایک رسم کے طور پر منانا صحیح نہیں؛ نیز وہ یہ کہتے ہیں کہ دراصل یہ عیسائیوں کی دیکھا دیکھی ''کرسمس'' کی نقل وتقلید ہے کہ وہ لوگ حضرت عیسی علیہ السلام کا یوم پیدائش مناتے ہیں؛ لہذا کچھ یار لوگوں نے ان کی تقلید کرتے ہوئے میلاد النبی کو جاری کیا، اس لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم صحابہ واسلاف کی تقلید کے بجائے عیسائی لوگوں کی تقلید کریں۔

اس کے برخلاف بریلوی علماء کا خیال یہ ہے کہ میلاد النبی کے دن اگر اللہ کے رسول ﷺ کی آمد و پیدائش کی خوشی منائی جائے، تو اگر چہ صحابہ واسلاف سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے؛ مگر ہر شی اپنی اصل کے لحاظ سے جائز ہوتی ہے، جب تک کہ ہمیں اس سے منع نہ کیا جائے؛ لہذا

یہ جائز ہے۔

یہ علمائے دیوبند و علمائے بریلی کا اختلاف اسی وقت ہے؛ جب کہ اس میں خرافات و ناجائز امور شامل نہ ہوں اور آج جس انداز سے میلاد النبی کے جلسے و جلوس منائے جارہے ہیں، اس کے بارے میں نہ بریلوی علماء ''جائز'' کہتے ہیں، نہ کوئی اور؛ کیوں کہ یہ امور سب کے نزدیک حرام و ناجائز ہیں اور ان کو عشق کا نام دینا اور دین کا لبادہ اڑھا دینا اور بھی زیادہ خطرناک و بھیانک صورتِ حال ہے، جو کسی کے پاس بھی جائز نہیں۔

☆☆☆

برادران وطن میں تعارف اسلام کی ضرورت

اس ملک میں مسلمان سیکڑوں برس سے بود و باش رکھتے ہیں اور یہاں ان کی حکومتیں بھی طویل زمانے تک قائم رہیں اور مختلف جہات میں اور متعدد مقاصد کے تحت ان کی تحریکات و جماعتیں ادارے و انجمنیں بھی کام کرتی رہی ہیں؛ مگر اس کے باوجود یہاں کے بسنے والے برادران وطن کے مختلف طبقات میں اسلام اور اہل اسلام کے متعلق مختلف قسم کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ اسلام و اہل اسلام سے دور ہیں یا دور رکھے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی کوئی بہتر و خوشنما شبیہ ان کے خیال میں نہیں بنتی؛ بل کہ ایک بدنما و نہایت مکروہ و خوفناک و وحشت ناک تصویر ان کے ذہنوں میں ابھرتی ہے، یا کم از کم یہ بات تو ضرور ہے کہ وہ اہل اسلام کے بارے میں کوئی اچھا خیال و تصور نہیں رکھتے۔

سوال یہ ہے کہ اس کی کیا وجوہات ہیں کہ خود ہمارے اطراف و جوانب میں بسنے والے ہم سے دور یا نفور ہیں اور نہ صرف ہم سے؛ بل کہ ہمارے مذہب سے بھی دور و نفور ہیں؟ یہ سوال موجودہ دور میں بالخصوص نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اس کا جواب تلاش کرنا اور اس کی روشنی میں اس صورتِ حال کا تدارک کرنا ہم سب کا فریضہ ہے۔

اس سوال کا ایک عام جواب جو سمجھا اور دیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں اور متعصب عناصر نے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ذرائع و وسائل کو کام میں لاتے ہوئے، اسلام و مسلمانوں کی شبیہ کو بگاڑ کر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں وہ لوگ ایک حد تک کامیاب ہو گئے، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ لوگ اس سے متأثر ہوں اور میڈیا کی بات پر یقین کر کے اسلام و اہل اسلام کو تضحیک و تحقیر کی نگاہوں سے

دیکھیں، ان پر شک وشبہ کریں اوران کی کوئی حقیقت وحیثیت ان کے پاس نہ رہے۔ اوریہی ان اسلام دشمن لوگوں کا مقصد بھی تھا۔

یہ جواب بالکل اورسوفی صد صحیح ہے؛ لیکن اس پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام ومسلم دشمن طاقتوں نے یہ سازش وکوشش کی کہ اسلام واہل اسلام کا حلیہ بگاڑ کر پیش کیا جائے اوران کولوگوں میں بدنام کیا جائے ،تواس وقت ہم نے اس کا کیا تدارک کیا اورصحیح صورتِ حال کوواضح کرنے اورحقائق کوپیش کرنے کی کہاں تک کوشش کی ؟ اوراسلام دشمن عناصر کی ان سازشوں کا ناکام بنانے اوران سے پردہ ہٹانے کی کس قدرکوشش کی؟

ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ ہماری جانب سے کما حقہ اس سلسلے میں کوئی کام نہیں ہوا؛ لہذا معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں ہماری ایک بہت بڑی کوتاہی کودخل ہے اوروہ یہ ہے کہ یہاں کے بسنے والوں کواسلام واہل اسلام سے متعارف کرانے کی کوئی معقول و مناسب کوشش نہیں کی گئی ،اس کے ساتھ ایک دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام کے ایک بہت بڑے طبقے کی طرف سے عملی واخلاقی اعتبار سے کچھ ایسی کمزوریوں اورغلطیوں کا مظاہرہ مسلسل اور کھلے طور پر ہوا کہ میڈیا سے پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کولوگ ایک صداقت سمجھنے پر مجبور ہوگئے اوراس طرح عوام الناس کے ایک بڑے طبقے نے اسلام ومسلمانوں کو قابل نفرت سمجھ لیا۔ اس طرح میرے نزدیک اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں میڈیا کے کردار کے علاوہ دو بنیادی وجوہات ہیں: پہلی وجہ: برادران وطن کواسلام سے متعارف کرانے میں کوتاہی ہے اوردوسری وجہ مسلمانوں کے ایک کثیر طبقے میں اخلاقی گراوٹ اورعملی کمزوری کا مسلسل مظاہرہ۔

جہاں تک تعارف اسلام واہل اسلام کا سوال ہے،اس میں ہماری کوتاہی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے اپنے پڑوس میں رہنے والوں کوبھی کبھی اس جانب توجہ نہیں دلائی کہ ہمارا مذہب کیا ہے اورکیا سکھاتا ہے، اس کے اصول کیا ہیں ،اس میں کیا تعلیمات دی گئی ہیں اوران تعلیمات میں کیا خوبیاں وکمالات ہیں، کیا خصوصیات ہیں ،دیگر مذاہب کے مقابلے میں

اس کا کیا امتیاز ہے اور ہم اس مذہب کو مانتے ہیں تو کیوں مانتے ہیں؟

ہماری ذمے داری اور اہم فریضہ تھا کہ ہم لوگوں کے سامنے عقائد اسلام جیسے خدا کی وحدانیت، رسول کی رسالت، عقیدۂ آخرت، ثواب وعذاب، اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کا مقصد تخلیق، اس کا انجام وعاقبت وغیرہ امور کی مناسب ومعقول تشریح وتوضیح کرتے، نیز ہم لوگوں کو اسلام سے متعارف کراتے، اس کی آفاقیت وہمہ گیری اور لسانی، جغرافیائی، مکانی و زمانی حدود سے اس کی بالاتری کو بیان کرتے، اس کی سچائیاں ان کے سامنے واضح کرتے، اس کی تعلیمات کو آشکارا کرتے اور اس کی معقولیت اور زمانے کے ساتھ چلنے کی صلاحیت کو سامنے لاتے۔

مگر ایسا نہیں ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے برادران وطن اور ہمارے ساتھ اٹھنے و بیٹھنے والے بھی ہمارے مذہب کے بارے میں کوئی صحیح معلومات نہیں ہیں اور وہ اسلام کے بارے میں بہت ہی بڑی بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔

اس کا کچھ اندازہ اس سے کیجیے کہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''میں ہردوئی سے لکھنؤ آرہا تھا، تبلیغی جماعت کے کچھ احباب ساتھ تھے، نماز کا وقت ہوا، تو ہم ریل میں نماز کے لیے کھڑے ہوئے، رکوع میں سجدے میں جاتے ہوئے اللہ اکبر کہنا ہوتا ہے، ایک صاحب جو ہمارے قریب بیٹھے تھے اور جنھوں نے اپنا تعارف کرایا تھا، وہ ایک ضلع کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین ہیں، انھوں نے بڑے بھولے پن سے پوچھا کہ'' مولانا صاحب! یہ بار بار آپ اللہ اکبر، اللہ اکبر کہتے تھے، یہ اللہ بادشاہی کا نام لیتے تھے؟

یہ واقعہ سنا کر حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''ہم ابھی تک انھیں اذان کا مطلب تک نہیں سمجھا سکے، جو پانچوں وقت (اور اکثر جگہ لاؤڈ اسپیکر سے) ہوتی۔ ہمارے ایک بزرگ تھے، انھوں نے کہا کہ بھائی! کچھ نہیں تو کم از کم اذان میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اسی کا ترجمہ کر دیں

۔ہندو بھائی سمجھتے ہیں کہ اذان میں ہمارے بتوں کو برا بھلا کہا جاتا ہے یا ہمیں برا بھلا کہا جاتا ہے، یا یہ جہاد کا نعرہ ہے، ان کو نہیں معلوم کہ ’’ **حي علی الصلاۃ** ‘‘، ’’ **حي علی الفلاح** ‘‘ اور **الصلاۃ خیر من النوم** ‘‘ کے کیا معنی ہیں؟ (فسادات اور ہندوستانی مسلمان۔

واقعی اذان جو کہ ایک عظیم دعوت ہے، ہم نے اس سے بھی کسی کو روشناس نہیں کرایا، حالاں کہ اس کا مضمون ایسا ہے کہ سننے والوں کو معلوم ہو جائے، تو ان کے دل اس کی جانب میلان کرنے لگیں۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک صاحب جو پہلے عیسائی مذہب کے پیروکار تھے اور بعد میں اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور میرے پاس ان کا آنا جانا تھا، ان سے احقر نے ایک بار پوچھا کہ آپ کے اسلام میں داخل ہونے کی کوئی خاص وجہ بنی تھی؟ تو کہا کہ ہاں! پھر اپنا واقعہ سنایا کہ ہم جہاں رہتے تھے، اس کے قریب ایک مسجد تھی، جہاں سے پانچ وقت اذان کی آواز لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے کانوں سے ٹکراتی تھی اور ہم اس سے کوفت واذیت محسوس کرتے تھے اور آپس میں کہا کرتے کہ ان مسلمانوں کو کیا ہوا کہ وہ ہمیں تکلیف دیتے ہیں، کبھی ہم سوئے ہوئے ہوتے ہیں، کبھی کسی کام میں مصروف ہوتے ہیں، کبھی بیماری میں ہوتے ہیں، کبھی بچوں کی تعلیم وتربیت میں کبھی مہمانوں کی خاطر مدارات میں ہوتے ہیں اور اس آواز سے سارے معاملات میں خلل پڑتا ہے۔ وہ کہتے جا رہے تھے اور میں سنتا جا رہا تھا، پھر وہ کہنے لگے کہ ایک دن جب اذان ہوئی، تو اچانک میرے ذہن میں ایک سوال آیا کہ یہ مسلمان اتنی زور سے اپنی بات کہہ کر ہم سب کو سناتے ہیں، تو آخر اس میں کیا پیغام ہوتا ہے؟ کیا وہ واقعی ہم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ اس سوال کے ذہن میں آتے ہی میں اپنے ایک مسلمان پڑوسی کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ آپ کی مسجد سے یہ آواز کئی دفعہ ہمارے کانوں میں آتی ہے، آپ لوگ جب اتنی زور سے ہمیں یہ سناتے ہیں، تو اس میں کیا پیغام ہوتا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ میرے اس سوال پر وہ مسلمان پڑوسی کہنے لگے کہ مجھے بھی اس کا معنی

ومطلب نہیں معلوم، کسی اور سے پوچھ لیں، وہ کہنے لگے کہ میرے دل میں ایک جستجو پیدا ہوگئی تھی؛ اس لیے میں اپنے ایک اور پڑوسی کے پاس یہی سوال لے کر گیا، تو وہ بھی یہی کہنے لگے کہ مجھے اس کا معنی نہیں معلوم؛ لہذا میں آپ کو ایک عالم کے پاس لے جاتا ہوں ۔ پھر وہ ایک مسجد میں ایک عالم کے پاس مجھے لے گئے، میں نے ان سے بھی یہی سوال کیا، انھوں نے مجھے بڑے اچھے انداز سے سمجھایا کہ اذان کے کلمات کا کیا معنی ہے اور اس میں کیا پیغام ہے اور یہ کہ اسلام میں اذان اس طرح کیوں زور سے دی جاتی ہے؟ جب میں نے یہ سب سنا، تو میرا دل نرم ہو گیا اور اسی وقت میں نے اسلام قبول کر لیا۔

اس واقعے سے انداز کیجیے کہ دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہوں گے، جن کو اسلام کا پیغام متأثر کر سکتا ہے، اگر ان کے سامنے اسلام کا پیغام رکھا جائے اور اسلام کا ان کو تعارف کرایا جائے اور اس کے حقائق کو واضح کیا جائے؛ لیکن افسوس کہ ہم اس جانب کوئی توجہ نہیں دیتے۔

اسی طرح خود کے بارے میں ہم نے نہیں بتایا کہ ہم کون ہیں اور ہمارا مقصد حیات کیا ہے اور یہ کہ ہم ساری دنیا کو کیا دینا چاہتے ہیں اور کیوں دینا چاہتے ہیں؟ ہمارا انسانیت سے کیا تعلق ہے اور کیوں ہے؟ کیا ہم اس دنیا میں یا اس ہندوستان کی سرزمین پر صرف کھانے کمانے کے لیے آئے ہیں، کیا ہمیں یہاں صرف اپنی روزی روٹی کا مسئلہ حل کر لینا ہے یا یہ کہ ہم دنیا والوں کو کچھ دینے کے لیے آئے ہیں اور کسی نعمت خداوندی سے روشناس کرانے کے لیے آئے ہیں؟

حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب رستم کے پاس گفتگو کرنے کے لیے بھیجا، تو رستم نے ان سے پوچھا تھا کہ "ما جاء بكم؟ (کس وجہ سے تم یہاں آئے ہو؟ تمہارا مقصد کیا ہے؟) تو ایک عجیب و حیرت انگیز جواب دیا جس نے اہل اسلام کی حیثیت و پوزیشن کو واضح کر دیا اور بتا دیا کہ اہل اسلام کا مقصد وجود کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں کہا:

"اللّٰه ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ مَن شَاءَ مِنْ عِبادَةِ العِبادِ الى عِبادَةِ اللّٰه ،

و مِنْ ضِيُقِ الدُّنيَا الى سَعَتِها ، و مِن جَوْرِ الأَدْيانِ الى عَدلِ الإسلام ، فأرْسَلَنَا بِدِينهٖ إلى خَلقِه لِنَدْعُوهُم إليْهِ “

(البدایۃ والنہایۃ:۷/۴۷،تاریخ الکامل لابن الاثیر:۱/۳۱۴،تاریخ ابن خلدون:۲/۵۹،تاریخ طبری:۲/۴۰۱)

(اللہ نے ہمارے اس لیے بھیجا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں میں سے جس کو اللہ چاہے، بندوں کی عبادت و بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی و غلامی میں داخل کریں اور دنیا کی تنگیوں سے اس کی وسعتوں میں لے جائیں اور مختلف ادیان کے جور وظلم سے نکال کر اسلام کے عدل کے سائے میں لے جائیں؛ لہذا اللہ نے ہمیں اپنا دین دے کر اپنی مخلوق کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ ہم ان کو اس کی جانب بلائیں۔)

آج اسی بات کو لوگوں کے سامنے واضح کرنے کی ضرورت ہے؛ لیکن چوں کہ یہ واضح نہیں ہوا؛ اس لیے لوگ ہم کو جانتے نہیں اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم بھی یہاں صرف روزی وروٹی کے مسئلے کو حل کرنے کی فکر کرنے آئے ہیں، جس کا لازمی ولابدی نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی حیثیت ہی لوگوں کے سامنے کھودی اور دینے والے کے بجائے ہمارے بارے میں لینے والے کا تصور ہونے لگا ہے۔

ایک جانب تو تعارف اسلام کے سلسلے میں ہماری کوتاہیوں کا یہ حال ہے اور دوسری طرف ہمارے اندر ایک بڑے طبقے میں اخلاقی و عملی بگاڑ کے ایسے ایسے مظاہر ونمونے دیکھنے کو ملتے ہیں ؛ جو ہماری شبیہ کو انتہائی بدنما و داغ دار بناتے جارہے ہیں۔ آپسی نزاعات و اختلافات، معاشرتی وگھریلو جھگڑے، بدتہذیبی وبداخلاقی، دھوکہ بازی وفریب دہی، جھوٹ وبددیانتی، سختی و بے رحمی، پاکی وصفائی سے بعدودوری، اذیت دہی وقانون شکنی وغیرہ لاتعداد امور ہیں، جنھوں نے ہماری شبیہ لوگوں کے روبرو اس انداز سے پیش کی ہے، جس کو ہر کوئی برا ہی سمجھ سکتا ہے۔

لہذا ہمارا اولین کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم اولا خود کو بدلیں اور اخلاق وتہذیب سے آراستہ وپیراستہ ہوں اور پھر لوگوں کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کریں، نیز خود کی حیثیت کو بھی واضح کریں۔

اللہ کرے کہ ہم اس کے لیے تیار ہوں اور حالات کو بدلنے اور ہندوستان میں بالخصوص دوری اقوام کے سامنے سرخروئی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے لائحۂ عمل تیار کریں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں
ملتِ اسلامیۂ ہند کے نام دلِ دردمند کا پیغام

الحمدللہ ہندوستان میں بسنے والی ملت اسلامیہ جہاں اولاً اپنے اسلام وایمان پر اللہ کا شکرادا کرتے ہوئے اپنے کو مسلمان کہلانے پر فخرمحسوس کرتی ہے، وہیں اس کو اپنے وطن عزیز سے ایک فطری وطبعی لگاؤ، تعلق ومحبت کی وجہ سے اس پر بھی فخر ہے کہ وہ ہندوستانی قوم ہے۔

یہ بات ہرکوئی جانتا ہے کہ مذہب کا تعلق دل وعقیدے سے ہے، جب کہ وطن وملک کا تعلق اپنی پیدائش ورہائش سے ہے؛ لہذا ایک شخص وطنی وملکی لحاظ سے ہندوستانی یا امریکی یا عربی یا کچھ اور ہونے کے ساتھ اپنے عقیدے ومذہب کے لحاظ سے مسلمان یا ہندو یا پارسی وغیرہ ہوسکتا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ امریکی آدمی عیسائی ہی ہو، وہ ہندو بھی ہوسکتا ہے، اسی طرح کوئی ضروری نہیں کہ ہندوستانی شخص ہندو مذہب سے تعلق رکھے؛ بل کہ وہ عیسائی یا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی مذہب کا ماننے والا کسی بھی ملک میں قانونی ضابطے کے موافق رہائش اختیار سکتا ہے، کسی ملک میں رہنے کے لیے یہ پابندی نہیں کہ وہ وہاں کا مذہب بھی اختیار کرے، دیکھیے عیسائی ملکوں میں مسلمان، ہندو وغیرہ بھی رہتے ہیں، اسی طرح متعدد مسلمان ملکوں میں ہندو وعیسائی لوگ رہائش پذیر ہیں، ان کو تبدیلی مذہب پر کوئی اصرار نہیں کرتا۔

نیز ایک بات یہ بھی بہت واضح ہے کہ انسان اپنے مذہب کے سلسلے میں تو بااختیار ہوتا ہے کہ جس مذہب کو پسند کرتا ہے، اسے اختیار کرے؛ مگر اپنے وطن کے بارے میں مختار نہیں کہ اس کی پیدائش یا رہائش تو ہو کہیں اور وہاں کا نہ کہلائے اور کسی دوسرے مقام کو اپنا وطن بتائے۔

مگر کس قدر حیرت ہے اور حیرت سے زیادہ افسوس کہ ایک طویل زمانے سے ہندواحیا پرست اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ہر ہندوستانی کو ’ہندو‘ ہونا چاہیے؛ لہذا یہاں کے مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ کو ہندوازم کو قبول کرنا چاہیے۔ ان لوگوں کی جانب سے اسے اپنا ایک اہم ایجنڈا بنا کر کام کیا جا رہا ہے اور اب جب کہ مودی جی کی حکومت قائم ہوگئی ہے، یہ نعرے بڑی شد و مد کے ساتھ لگائے جا رہے ہیں کہ ”اپنے گھر واپس لوٹو“، اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو اپنے مذہب کی طرف لوٹنا چاہیے اور ”اپنے مذہب“ سے مراد ”ہندو مذہب“ ہے۔ پھر اس کے لیے مختلف سطحوں پر کام کرنا شروع کر دیا گیا ہے، حتیٰ کہ لالچ و دھوکہ دہی سے بھی کام لیا جا رہا ہے؛ تا کہ کسی کی غربت کا فائدہ اٹھا کر ان کے مذہب کا استحصال کیا جائے۔

جس کی مثال ابھی قریب میں آگرہ میں پیش آنے والا واقعہ ہے، جس کو کہنا چاہیے کہ تبدیلی مذہب کی تاریخ کا بدترین واقعہ ہے، جس میں غربت زدہ لوگوں کو لالچ دیا گیا اور دھوکہ کے ساتھ ان کے مذہب کی تبدیلی کا اعلان کر دیا گیا؛ حالاں کہ بعد میں صورتِ حال جو سامنے آئی، تو پتہ چلا کہ کسی نے اپنے مذہب یعنی اسلام کو ترک نہیں کیا اور نہ ہندو مذہب قبول کیا؛ بل کہ یہ پوری کارروائی ہی محض ایک دھوکے پر مبنی تھی، جو برہمنی مفادات کی خاطر اپنائی گئی تھی۔

ان لوگوں نے اپنے ایجنڈے کو بروئے کار لانے میں جن راستوں کو اختیار کیا ہے، ان میں سے ایک بڑا اہم راستہ یہ ہے کہ تعلیمی لائن سے ”ہندوتو“ کو عام کیا جائے؛ چنانچہ بہت پہلے سے آر ایس ایس اور اس کی دیگر تنظیموں کی جانب سے مسلسل یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ اسکولوں کے ”نصاب تعلیم“ میں ممکنہ حد تک ہندو دیو مالائی عقائد، برہمنی نظریات اور ہندو تہذیب و کلچر کا عنصر شامل کیا جائے؛ تا کہ ایک طالب علم اور اسٹوڈنٹ جب اس کو پڑھے، تو اس کو ہندو عقیدے و کلچر سے مناسبت ہو جائے اور ہندو مذہب کے اثرات سے کسی نہ کسی حد تک متأثر ہو سکے۔ اور ان کے اس ایجنڈے کو پورا کرنے کے لیے کانگریس کے

نمائندوں اور ان کی حکومتوں نے جس طرح کام کیا اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوششیں کیں، وہ شاید ہی کسی باخبر سے پوشیدہ ہوں! نیز ایک وقت یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ ''وندے ماترم'' کو قومی ترانہ تسلیم کیا جائے اور اس کو اسکولوں میں نافذ کیا جائے۔ اب یہ آواز اٹھائی جا رہی ہے کہ گیتا کو ''قومی کتاب'' کا درجہ دیا جائے اور اس کی تعلیم کو اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے اور اس کے لیے ذہن سازی کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے اور ذہن سازی کے لیے مختلف طریقے و سبیلیں اختیار کی جا رہی ہیں۔

ان کی اس قسم کی کوششوں اور زیادہ صحیح الفاظ میں ''سازشوں'' کا نتیجہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مسلمان قوم کے بچوں میں ہندو دیو مالائی عقائد اور کفریہ وشرکیہ تہذیب سے کوئی بعد نہیں رہا اور وہ ہولی و دیوالی وغیرہ خالص ہندوانہ تہواروں کو منانے اور ان میں شرکت کو اپنی تہذیب سمجھنے لگے ہیں۔

اس صورتِ حال میں مسلمانانِ ہند کو پوری بصیرت و سنجیدگی کے ساتھ اپنی نسلوں کے مستقبل پر غور کرنا چاہیے اور ان کے ایمان و اسلامی تشخص کے بقاء وتحفظ کے حوالے سے فکر مند بھی ہونا چاہیے اور اس کے لیے سامان بھی پیدا کرنا چاہیے۔ اور مسلمانانِ ہند کے لیے یہ کوئی اول موقعہ نہیں ہے؛ بل کہ اس طرح کے سنگین حالات اس سے پہلے بھی ان کو پیش آئے ہیں اور انھوں نے اپنی ثابت قدمی و پامردی کا زبردست ثبوت دیا۔

چناں چہ انیسویں صدی عیسوی میں یہاں انگریزی تسلط کے بعد ایک جانب اس متسلط حکومت کی جانب سے اور دوسری طرف عیسائی مشنریوں کی جانب سے ''مغربی تہذیب و تعلیم'' کی زبردست یلغار نے جو صورتِ حال پیدا کر دی تھی، وہ انتہائی تشویک ناک اور اسلامی تہذیب وتمدن کے لیے زبردست چیلنج کا حکم رکھتی تھی۔ اس نے یہاں کی اور بالخصوص مسلمانوں کی تہذیب و تعلیم اور ان کے اسلامی ورثے پر یلغار کرتے ہوئے ان سب کو اپنی لپیٹ میں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے لیے تمام دانش گاہوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں؛ نیز ہسپتالوں اور تمام سرکاری و نیم سرکاری اداروں کو اس کا مرکز بنا دیا تھا۔

انگریزی حکومت اوراس کے زیر سائے وزیر سرپرستی کام کرنے والی عیسائی مشنریوں نے پورے ملک میں عیسائیت کی دعوت وتبلیغ کا مشن جاری کردیا اور پورے ملک ہی کو عیسائی بنا دینے کی جد و جہد شروع کردی اور اپنے اس ناپاک مشن کے لیے یہاں کے لوگوں کا استحصال کرتے ہوئے ''تعلیم کے نام'' پر ''اپنی تہذیب وتمدن''؛ بل کہ ''اپنے نظریات و عقائد'' کی تعلیم کا سلسلہ جاری کردیا اوراسی کے ساتھ ساتھ ایک کام یہ بھی کیا کہ اسلام سے تعلق رکھنے والی ہر ہر چیز کو مسلمانوں کی جدید نسل کے ذہنوں میں مشکوک ومشتبہ بنا دیا جائے ؛قرآن وحدیث،سیرت وسنت، نیز ان کے مختلف احکام حرمتِ سود، پردے کی اہمیت، وغیرہ کے بارے میں شکوک وشبہات کی ایک لہر پیدا کردی؛ تاکہ جدید نسل پہلے اپنے نظریات و عقائداوراپنی تہذیب وتشخص سے دست بردار ہوجائے یا کم ازکم دور ہوجائے،تو عیسائیت کا بیج ان کے دلوں میں بونا آسان ہوجائے۔

ظاہر ہے کہ یہ یلغار کوئی معمولی یلغاراور یہ چیلنج کوئی معمولی چیلنج نہیں تھا،اس کے پیچھے انگریزی حکومت نے اپنی پوری طاقت وقوت جھونک دی تھی اورمشنری تحریکات نے اپنے تن من کی بازی لگادی تھی ؛مگر سلام ہوان پاکیزہ روحوں پر، جنھوں نے اس نازک ترین دور میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ان تحریکات کا بھرپور مقابلہ کیااوراپنی علمی وعملی صلاحیتوں کو بروکار لاتے ہوئے اسلام کی سچائیوں کو واضح کرنے کا بیڑا اٹھایااورقرآن وسنت کے اسباق کے ہر زمانے میں نافذ العمل ہونے اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی بھرپور صلاحیت رکھنے اور ان کے احکامات کی معنویت ومعقولیت کو پوری قوت کے ساتھ علمی و معقول دلائل کے ساتھ واضح کیااورلوگوں کے دلوں سے شکوک وشبہات کے کیڑے نکالنے میں کامیابی حاصل کی اوراس کے نتیجے میں ایک جانب اہل اسلام کی ایمانی حرارت وحمیت کو برقرار رکھا جاسکااورجدید تعلیم سے مرعوب ومتأثر طبقے میں پیدا ہوجانے والے احساس کمتری سے ان کے سینوں کو دھویااوراس کی جگہ اسلام کی حقیت وابدیت پر ان کے دلوں میں اعتماد بحال کیا جاسکا،تو دوسری جانب عیسائیت کی تبلیغی تحریکات کے سیلاب کی لہریں یک بہ یک

رک گئیں اوران کی یہ سازش وکوشش پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوئی۔

تاریخ کی یہ حقیقت ہمارے لیے ہمارے اسلاف کی زندگیوں سے ایک بہت بڑا سبق دے رہی ہے، اے کاش! کہ ہم لوگ اس سے سبق لیں اور اپنے لیے اور اپنی نسلوں کے لیے کوئی لائحۂ عمل تیار کرسکیں۔

راقم الحروف یہاں نہایت دل سوزی کے ساتھ اس ضمن میں چند گزارشات پیش کرنے کی کوشش کررہا ہے، امید ہے کہ ان پر غور کیا جائے گا:

(۱) ایک تو یہ کہ تاریخ سے سبق لیتے ہوئے ہمیں اہل حکومت کو بھی اور غیر سرکاری مختلف مذہبی تنظیموں کو بھی یہ بتانے کی جدوجہد شروع کردینا چاہیے کہ اہل اسلام اپنی ہر چیز کو قربان کرسکتے ہیں اور اپنے ہر حق سے دست بردار ہوسکتے ہیں، خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی، تعلیمی ہو یا معاشی؛ مگر وہ اس کے لیے ایک لمحے کے واسطے بھی تیار نہیں کہ اپنے ایمان و اسلام کا سودا کرے اور وہ اپنے مذہبی وملی تشخصات وامتیازات کو ترک کردے، جس طرح وہ اس کے لیے بھی ایک لمحے کے لیے تیار نہیں کہ وہ اپنے وطن عزیز کو خیر باد کہے اور اس سے منہ موڑے۔ ہمیں یہ ثابت کرنا اور واضح کردینا چاہیے کہ ہم وطنی لحاظ سے سو فی صد ہندوستانی ہیں اور مذہبی اعتبار سے سو فی صد مسلمان۔ جس طرح ہماری ہندوستانیت سے ہم کسی قیمت پر دست بردار ہونا نہیں چاہتے، اسی طرح کسی بھی قیمت پر یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے ایمان واسلام سے دست بردار ہوجائیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہمیں اپنی موجودہ وآئندہ نسلوں میں دین وایمان اور توحید وسنت سے مخلصانہ لگاؤ وتعلق، اللہ ورسول کی والہانہ عقیدت ومحبت، اسلامی تہذیب وثقافت سے سچا رشتہ وانسیت، دین سے گہری وابستگی ومناسبت کے بقاء وتحفظ کے لیے ہر سطح پر کوشش کرنا چاہیے۔

اوران کوششوں میں سے موجودہ دور کے احوال وظروف کے مطابق ایک اہم صورت یہ ہے کہ مسلمان خود اپنے اسکول وکالج قائم کریں اوران میں عصری علوم کی معیاری تعلیم کے

ساتھ دینیات کا ایک مکمل نصاب بھی داخل کیا جائے، جو ہمارے بچوں میں مذکورہ بالا امور پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو؛ نیز ان میں ایک ایسا نظام تربیت بھی قائم کیا جائے، جو اسلامی اصول کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہو، جس سے طلبہ کی ذہنی ساخت و پرداخت اسلامی طرز پر ہو سکے اور ان میں دینی حمیت و ایمانی حرارت، اسلامی شعائر کی عظمت پیدا ہو جائے اور وہ ان اسکولوں سے پڑھ کر اسلام کے داعی و مبلغ و نمائندے بنیں۔

اس میں شک نہیں کہ آج مسلمانوں کے بہت سے اسکول موجود ہیں؛ لیکن ان کی حالت و نوعیت ان اسکولوں سے کچھ بھی مختلف نہیں، جو غیروں نے قائم کئے ہیں، جہاں بے دینی و الحاد کی فضا، فسق و فجور کا ماحول، فحش و بے حیائی کا رنگ جما ہوا ہوتا ہے، جہاں وہی آرٹ کے نام پر بے حیائی کو فروغ دیا جاتا ہے، جہاں آزادی کے نام سے انسانیت سوز جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے؛ بل کہ اس سے آگے جہاں اسلام کو داخل ہونے اور اسلامی پاکیزہ اصول و ضوابط کو در آنے کا کوئی موقعہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اسکول و کالج اسلام و مسلمانوں کی کوئی نمائندگی نہیں کرتے اور نہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے؛ لہذا ہماری مراد ایسے اسکولوں اور کالجوں کا قیام ہے، جن کا مقصد ایک ایسی نسل تیار کرنا ہو، جو ہندوستان میں رہتے بستے اور اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہوئے ''اسلام'' سے والہانہ تعلق رکھتی اور اسلام کی سچی نمائندگی کرنے والی ہو۔

(۳) تیسرے یہ کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے برادران وطن سے اپنا تعارف اپنے عمل و کردار کے ذریعے کرانے کی کوشش بھی ہونی چاہیے۔ ایک تعارف زبانی ہوتا ہے، یہ تو شاید کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے اور اگر نہ ہو، تو بھی کوئی مضائقہ نہیں؛ لیکن اپنے عمل و کردار سے اپنا تعارف پیش کرنا ضروری ہے اور یہ کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا کردار و عمل اسلام کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو اور وہ اسلام کے بارے میں صحیح واقفیت کے ساتھ اس پر عمل میں بھی پورے اترتے ہوں۔

آج ہمارا حال یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات سے ہم میں کا ایک بہت بڑا طبقہ واقف ہی

نہیں اور عمل و کردار کے لحاظ سے ہم نے جو تصویر خود کی لوگوں کے سامنے پیش کی ہے، وہ اس قدر گھناؤنی ہے کہ کوئی بھی انصاف پسند و سچا انسان اس کو گوارا نہیں کرسکتا۔ ہر غلط و بری بات ، جھوٹ ، فریب ، دھوکہ ، چوری ، لڑائی و جھگڑا ، گالی گلوچ ، دوسروں کو اذیت و تکلیف دہی ، شور شرابا ، وغیرہ ایک بڑے طبقے میں اس قدر عام ہے کہ ہر کوئی اس کو محسوس کرتا ہے اور اسی سے وہ مسلمانوں اور اسلام کی تصویر بناتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس سے اسلام و اہل اسلام کے بارے میں غلط تصورات کا قائم ہو جانا ایک طبعی سی بات ہے، آج ہمیں اس کو صاف کرنا بھی لازمی ہے؛ تاکہ اپنے اہل وطن کے سامنے ہماری صحیح تصویر آئے اور ان میں سے اہل انصاف کو سوچنے و سمجھنے کا موقعہ مل سکے اور وہ حقیقت کو معلوم کرسکیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کا طریقہ کیا ہو؟ اس کا طریقہ اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ ہم نوجوان نسل کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے واقف کرانے اور اسی پر ان کو تربیت دینے کی کوشش کریں اور اس کام کو ایک بہت بڑے پیمانے پر انجام دینا ہوگا؛ تاکہ یہ نسل اسلام کے مطابق خود کو آراستہ کرکے اپنے عمل و کرادار سے مسلمانوں کی صحیح تصویر پیش کرسکیں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں

ملتِ اسلامیۂ ہند کے نام دلِ دردمند کا پیغام

(دوسری وآخری قسط)

گزشتہ ماہ کے شذرات میں بہ عنوان ''ملت اسلامیۂ ہند کے نام دلِ دردمند کا پیغام'' احقر نے ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں چند گزارشات پیش کئے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ

''ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے برادران وطن سے اپنا تعارف اپنے عمل وکردار کے ذریعے کرانے کی کوشش بھی ہونی چاہیے۔ایک تعارف زبانی ہوتا ہے، یہ تو شاید کچھ نہ کچھ ہورہا ہے اوراگر نہ ہو، تو بھی کوئی مضائقہ نہیں؛ لیکن اپنے عمل وکردار سے اپنا تعارف پیش کرنا ضروری ہے اور یہ کام صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں، جن کا کردار وعمل اسلام کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہواور وہ اسلام کے بارے میں صحیح واقفیت کے ساتھ اس پر عمل میں بھی پورے اترتے ہوں۔آج ہمارا حال یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات سے ہم میں کا ایک بہت بڑا طبقہ واقف ہی نہیں اور عمل وکردار کے لحاظ سے ہم نے جو تصویر خود کی لوگوں کے سامنے پیش کی ہے، وہ اس قدر گھناؤنی ہے کہ کوئی بھی انصاف پسند وسچا انسان اس کو گوارا نہیں کرسکتا۔ ہر غلط وبری بات: جھوٹ، فریب، دھوکہ، چوری، لڑائی وجھگڑا، گالی گلوچ، دوسروں کو اذیت وتکلیف دہی، شور شرابا، وغیرہ ایک بڑے طبقے میں اس قدر عام ہے کہ ہر کوئی اس کو محسوس کرتا ہے اوراسی سے وہ مسلمانوں اوراسلام کی تصویر بناتا ہے۔ظاہر ہے کہ اس سے اسلام واہل اسلام کے بارے میں غلط تصورات کا قائم ہوجانا ایک طبعی سی بات ہے، آج ہمیں اس کو صاف کرنا بھی لازم ہے؛ تاکہ اپنے اہل وطن کے سامنے ہماری صحیح تصویر آئے اوران میں

سے اہل انصاف کو سوچنے وسمجھنے کا موقعہ مل سکے اور وہ حقیقت کو معلوم کر سکیں۔‘‘

یہاں ہماری صورتِ حال کا جو اجمال پیش کیا گیا ہے، اسی کی کچھ تفصیل آج کی صحبت میں پیش کرنے جا رہا ہوں؛ تاکہ بات مکمل ہو جائے اور ہم راہ کشا اور نتیجہ خیز غور وفکر کے لیے تیار ہوں۔

(۱) یہ کون نہیں جانتا کہ اخلاقی اقدار وانسانی معیار ہی کی بہ دولت انسان کی قدر و قیمت اور مقام ومنزلت ہے، اگر یہ نہ ہو، تو انسان بے قدر بن جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اخلاقی اقدار کو انسانوں میں پیدا کرنے، اس سلسلے کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کو بیان کر کے تکمیل کا سامان کرنے اور ان امور پر لوگوں کو تربیت دینے کا سب سے بڑھ کر جس مذہب نے اہتمام کیا، وہ اسلام ہی ہے؛ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے، تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم نے اسلام کا نام لے کر سب سے زیادہ ان ہی اقدار انسانی ومعیارات اخلاقی کو پامال کیا ہے، حتی کہ آج ہمارے یہاں اخلاقی گراوٹ اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ نہ کوئی اخلاقی معیار باقی ہے، نہ اس کی اقدار کا پتہ؛ بل کہ ہمارے اخلاق کو دیکھ کر لوگ ہم سے دور اور اسلام سے نفور ہوتے جا رہے ہیں۔

کسی عربی شاعر نے خوب کہا ہے:

وَ اِنَّمَا الْأُمَمُ الأَخْلاقُ مَا بَقِيَتْ فَإِنْ هُمُ ذَهَبَتْ أَخْلاقُهُمْ ذَهَبُوْا

امتیں تو اخلاق سے باقی رہتی ہیں، پس اگر ان کے اخلاق گئے، تو سمجھو کہ خود امتیں ہی ختم ہو گئیں۔

اس شعر کے بہ مصداق آج ہماری حالت یہی ہے کہ گویا یہ امت باقی نہیں رہی؛ یعنی اس کا وہ مقام باقی نہیں رہا، اس کی عظمت باقی نہیں رہی، اس کی شوکت باقی نہیں رہی۔

(۲) اسی اخلاقی گراوٹ کا ایک اثر یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ معاشرتی زندگی انتہائی تباہ کن صورتِ حال سے دوچار ہو رہی ہے، جس نے لوگوں کا سکون وچین ہی چھین لیا ہے، روز روز خاندانوں اور برادریوں میں جھگڑے ونزاعات چلتے ہیں، پڑوسیوں کے مابین

تنازعات واختلافات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، بھائیوں، بہنوں میں، رشتہ داریوں میں اور میاں بیوی میں آپسی نااتفاقیوں کا ایک طویل اور غیر مختتم سلسلہ نظر آتا ہے۔ان میں سے بعض نزاعات میراث وجائیداد کی تقسیم کے مسئلے کو لے کر ہوتے ہیں، بعض تنازعات گھریلو مسائل پر قائم ہوتے ہیں، بعض اختلافات محض حسد وکینے کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں، بعض جھگڑے میں غلط فہمیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ نیز ان اختلافات ونزاعات میں کبھی تو زبانی جھگڑے ہوتے ہیں اور کبھی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ مار پیٹ، لوٹ کھسوٹ؛ بل کہ قتل وغارت گری بھی ہونے لگتی ہے۔

ان اختلافات ونزاعات کا سب سے بھیانک وافسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ آپسی جھگڑے وتنازعات کورٹ کچہریوں، پولیس اسٹیشنوں، اور بعض غیر اقوام کی قائم کردہ تنظیموں میں زیر بحث وسماعت رہتے ہیں اور وہ لوگ ہمارے ان تنازعات واختلافات کا جائزہ لیتے اور اس پر فیصلے کرتے ہیں۔ یہ اندازِ زندگی معاشرت کو جن خطرات وتباہ کن حالات سے دوچار کرتا ہے، وہ تو ایک بدیہی بات ہے، مزید یہ کہ اس سے غیروں میں اہل اسلام کی جگ ہنسائی ہوتی ہے؛ بل کہ بعض اوقات خود اسلام کی توہین وتحقیر کا یہ ذریعہ بن جاتی ہے۔

(۳) کون نہیں جانتا کہ معاملات کی صفائی وخوبصورتی، خرید وفروخت کے سلسلے میں سچائی ودیانت داری، کاروباری دنیا میں کامیابی کی شاہ کلید ہونے کے ساتھ ساتھ معاملہ کرنے والوں کے بارے میں لوگوں کے حسن وظن وقدر ومنزلت کا ایک بہترین وسیلہ اور عمدہ ذریعہ ہے؛ مگر اس سلسلے میں بھی ہمارا رول ایک منفی پہلو کی جانب ہم کو لے جارہا ہے، یہاں امانت ودیانت، سچائی وصفائی کے بجائے خیانت ودھوکہ دہی وفریب سازی، جھوٹ وبدسلوکی جیسے رذائلِ اخلاق امت کے بہت سے لوگوں میں پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض نماز وروزے کے پابند بھی اس میں ملوث نظر آتے ہیں؛ بل کہ نماز وروزے، حج وغیرہ کی پابندی کے ساتھ ساتھ وہ اس معاملے میں اسلام کی تعلیمات کو پس پشت ڈالے ہوئے

ہیں۔ نہ وعدوں کی پابندی، نہ وقت پر قرضوں کی ادائیگی، نہ انصاف وحق پسندی، نہ بیوپار میں لوگوں کے ساتھ حسن معاملگی؛ بل کہ ایک طبقہ تو ایسا پیدا ہوگیا ہے کہ وہ لوگوں کو دھوکہ دینے ہی کا کام انجام دیتا رہتا ہے، لوگوں سے قرض کے نام سے یا کسی تجارت کے نام سے یا حج وعمرہ لے جانے کے نام سے روپیہ وصول کرتا اور راہِ فرار اختیار کر جاتا ہے۔

ہمارے ایک تاجر دوست نے ایک بار مجھ سے بتایا کہ میں پہلے اپنا کاروبار صرف مسلمانوں سے کرتا تھا؛ مگر مجھے ان سے اس قدر پریشانی پیش آئی کہ میں نے ان سے کاروبار کرنا ہی چھوڑ دیا؛ کیوں کہ یہ اپنے وعدے کی پابندی نہیں کرتے تھے، ادائیگی کا ایک وقت دیتے؛ مگر اس وقت میں چھپ جاتے یا کوئی بہانہ بناتے؛ بل کہ بعض لوگ لڑنے جھگڑنے لگ جاتے؛ لہٰذا میں نے ان سے کاروبار چھوڑ کر غیر مسلم لوگوں سے کاروبار کرنے لگا، ان کے الفاظ تھے کہ جب سے میں نے ان سے کاروبار جاری کیا ہے، کبھی بھی مجھے کوئی ایسی پریشانی نہیں پیش آئی؛ کیوں کہ وہ لوگ وقت پر ادائیگی کرتے ہیں اور وعدے کا لحاظ رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب اخلاقی گراوٹ کا یہ حال ہو اور خود ایک مسلمان کو دوسرے مسلمانوں کے اس رویے سے شکایت ہو، تو غیروں کے نزدیک مسلمان کی کیا اور کیسی تصویر بنتی ہوگی اور وہ اس تصویر سے کیوں کر متأثر ہو سکتے ہیں؟

(۴) اسلام نے ہمیں جو اسباقِ انسانیت سکھائے ہیں، ان میں ایک بہت ہی اہم سبق پاکی وصفائی، تہذیب وشائستگی کا بھی ہے اور اس کی جانب بہت ہی اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی گئی ہے؛ مگر اس سلسلے میں ہماری جو صورتِ حال ہے، وہ انتہائی افسوس ناک ہے، یہاں تک کہ اب لوگوں (نہ صرف غیروں کا؛ بل کہ خود اپنے لوگوں) کا خیال یہ ہوگیا ہے کہ جہاں صفائی وشائستگی ہو، وہ علاقہ مسلمانوں کا نہیں ہوسکتا اور جہاں گندگی ونجاست کا ڈھیر ہو، پاکی و صفائی کا نام نہ ہو اور بدتہذیبی کا مظاہرہ ہو، وہ علاقہ مسلمانوں کا ہوگا۔

چناں چہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سے مسلم محلوں اور علاقوں کی یہی صورتِ حال ہے کہ وہاں عموماً ان امور کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا، حتیٰ کہ ان علاقوں میں وہاں کی مساجد کے

اطراف و اکناف بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے؛ بل کہ ایک طبقہ ایسا بھی ہم میں ہے، جو صفائی وشائستگی، تہذیب وترتیب کے اہتمام کو انگریزوں کا خاصہ سمجھتا ہے اور اس کا اہتمام کرنے والوں کو انگریزیت کا طعنہ بھی دیتا ہے۔ کسی سے یہ لطیفہ جو حقیقت میں واقعہ ہے سنا تھا کہ کسی جگہ ایک انگریز اسلام میں داخل ہوا اور وہ نماز کے لیے مسجد آیا کرتا تھا، ایک دن دیکھا کہ مسجد کے حوض کے اطراف کی نالیاں گندی ہو رہی ہیں، تو اس نے وہاں کے مؤذن صاحب سے کہا کہ بھائی! ان نالیوں کو صاف کرنا چاہیے، یہ دیکھو کس قدر گندگی و ناپاکی جمع ہو رہی ہے، اس پر وہ مؤذن صاحب کہنے لگے کہ یہ صاحب انگریز سے مسلمان تو ہو گئے؛ مگر ان میں سے ابھی تک انگریزیت نہیں گئی۔ گویا پاکی صفائی انگریزوں کی صفت ہے، مسلمانوں کی نہیں۔ یہ حال ہے اس وقت ہم لوگوں کا۔

اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ غیر لوگ مسلم معاشرے اور خود مسلمانوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کر پاتے؛ بل کہ وہ اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کو گندہ و ناپاک تصور کریں اور ان سے نفرت کریں؛ بل کہ مزید یہ کہ جب ہماری جانب سے غیروں کے سامنے ہماری یہ تصویر جائے گی، تو وہ ہمارے طرز عمل کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دے کر اسلام سے بھی بدظنی کا شکار ہوں گے اور یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔

یہ چند امور نہایت قابل غور سمجھ کر پیش کیے گئے ہیں؛ تا کہ ہم ان پر غور کریں اور اپنے اندر وہ اخلاقی اقدار زندہ کریں، جن کی بنیاد پر انسانی آبادی میں مقام ملتا ہے، نیز اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ ہمارے محلے وعلاقے پاکی وصفائی کا مظہر بنیں اور وہاں کے رہنے والوں میں پاکی وصفائی اور تہذیب وشائستگی کا ذوق پیدا ہو جائے اور دیکھنے والوں پر اچھا تأثر قائم ہو۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، زبانی تعارف سے زیادہ ہمیں اپنا ''عملی تعارف'' پیش کرنے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ یہی چیز مؤثر بھی ہوتی ہے اور نتیجہ خیز بھی، ورنہ صرف زبانی طور پر ہم اپنے فضائل ومناقب بیان کریں اور عملی زندگی میں وہ چیزیں پائی نہ جائیں، تو یہ مؤثر ونتیجہ خیز ہونے کے بجائے الٹا مضر ونقصان دہ ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ معروف محدث وفقیہ امام ابن المبارک کے پڑوس میں ایک یہودی کا مکان تھا، اس نے اپنا یہ مکان کسی ضرورت کی وجہ سے بیچ دینا چاہا اوراس کی قیمت مقرر کی دو ہزار دینار، لوگ اس مکان کوخریدنے کے لیے آتے اور مکان دیک کر پسند کر لیتے؛ مگراس کی یہ غیر معمولی قیمت سن کر واپس ہو جاتے ۔ایک شخص کو یہ مکان بہت پسند آ گیا، تواس کی قیمت کے بارے میں اس یہودی سے بات چیت کی اور کہا کہ یہ اور ایسا مکان ایک ہزار دینار کی قیمت رکھتا ہے؛لہذا دو ہزاراس کی قیمت نا قابل تصور ہے؛لہذا اس کی قیمت میں کچھ کم کر دیا جائے ۔اس کے جواب میں اس یہودی نے کہا کہ یہ بات تمہاری صحیح ہے کہ ایسا مکان دو ہزار کا نہیں ؛ بل کہ ایک ہزار کا ہونا چاہیے؛ لیکن یہ بات عام مکانوں کی حد تک تو درست ہے، میرے مکان کے بارے میں یہ درست نہیں ؛ بل کہ اس کی قیمت دو ہزار نہایت مناسب ہے ۔خریدار نے پوچھا کہ آپ کے مکان میں کیا خاص بات ہے، جس کی وجہ سے اس کی قیمت عام مکانوں سے دوگنی زیادہ ہوگئی ؟ تو اس یہودی کا جواب یہ تھا کہ میرے مکان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مکان حضرت عبداللہ بن المبارک کے پڑوس میں ہے اور ایسا بہترین پڑوس کس کو نصیب ہے؟لہذا مکان کی قیمت ایک ہزار ہے، تو اس کے اس بہترین پڑوس میں ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت ایک ہزار اور بڑھ گئی اور یہ مکان دو ہزار کا ہو گیا۔

ہمارے اسلاف کا کردار و عمل ایسا تھا کہ ایک یہودی بھی ان کے مدح سرائی پر مجبور تھا اور یہ سمجھتا ہے کہ ان کے پڑوس میں ہونے کی وجہ سے ان کے مکانات کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں ؛ مگر ہائے افسوس کہ آج ہمارا طرز زندگی ایسا ہے کہ لوگ ہمارے پڑوس میں ہونے سے اپنی اور اپنے مکانات کی قیمت کو گھٹتے دیکھتے ہیں۔

یہ ہے عملی تعارف جس کو پیش کرنے ہی سے حقیقت میں ہمارا تعارف ہوتا ہے اور یہی تعارف فی الواقع لوگوں کو متأثر کر سکتا ہے؛ لہذا موجودہ حالات کے تناظر میں جب تک ہم اپنا یہ تعارف نہیں پیش کریں گے، حالات میں تبدیلی کا امکان نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔

گھر واپسی کا نعرہ - ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ایک زمانے سے مختلف المذاہب لوگ بود و ماند رکھتے چلے آرہے ہیں، ان میں ہندو بھی ہیں اور بدھ مت والے بھی، جینی بھی ہیں اور یہودی بھی، پارسی بھی ہیں اور سکھ بھی، مسلمان بھی ہیں اور عیسائی بھی؛ مگر اب ہندو انتہاء پسند تنظیموں کی جانب سے "اپنے گھر واپسی" کا "ایک نعرہ" لگایا جارہا ہے، جس کے پیچھے لگتا ہے کہ ایک شکست خوردہ مریض ذہنیت کارفرما ہے، جس نے نہایت سطحیت کا ثبوت دیتے ہوئے یہ نعرہ لگایا ہے۔

اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں؛ بل کہ ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ جب بھی حضرات انبیاء علیہم السلام نے دین اسلام کو پیش کیا اور اس کی سچائیوں وصداقتوں کے پیش نظر لوگوں نے اس کو قبول کیا، تو اسی شکست خوردہ ذہنیت نے وہاں یہی نعرہ لگایا تھا کہ اپنے پرانے مذہب کی جانب لوٹ جاؤ اور اپنے آباء واجداد کے دین پر قائم ہوجاؤ۔

چناں چہ قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت شعیب علیہ السلام نے لوگوں کو دین حق کی دعوت دی اور ان کی دعوت کو نیک روحوں نے قبول کرلیا، تو ان کی قوم کے لوگوں نے یہ کہہ کر ان کو دھمکی دی:

﴿لنخرجنک یا شعیب والذین اٰمنوا معک من قریتنا أو لتعودن في ملتنا﴾ (اعراف:۸۸)

(اے شعیب! ہم ضرور تمھیں اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں، ہمارے گاؤں سے باہر نکال دیں گے یا نہیں تو تم لوگ ہمارے

دین وملت میں واپس لوٹ جاؤ۔)

ایک اور موقع پر بہت سے اللہ کے پیغمبروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی قوموں کے بارے میں بھی اللہ تعالی نے یہی خبر دی ہے، کہ وہ بھی ان حضرات انبیاء اوران کے اوپر ایمان لانے والے حضرات سے یہی کہتے تھے؛ چناں چہ فرماتے ہیں:

”لنخرجنكم من أرضنا أو لتعودن في ملتنا.“ (ابراہیم:۱۳)

(ہم تم سب کو ہمارے زمین سے نکال دیں گے یا نہیں تو تم ہمارے دین میں واپس ہو جاؤ۔)

جب ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کے اصحاب نے دین اسلام قبول کیا، تو اہل مکہ نے بھی یہی نعرہ لگایا تھا کہ ان لوگوں نے دین کو چھوڑ کر بے دینی کو اختیار کرلیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا، تو خود انھوں نے اپنے ماموں سے جا کر کہا کہ میں تو صابی یعنی بے دین ہو گیا ہوں یعنی اسلام میں داخل ہو گیا ہوں، یہ اس لیے انھوں نے کہا کہ لوگ اس وقت اسلام لانے والے کو یہی کہتے تھے کہ بے دین ہو گیا ہے، ان کے ماموں نے دروازہ بند کرلیا، حضرت عمر نے پھر دیگر لوگوں سے یہی کہا؛ حتی کہ ایک ایسے شخص سے بھی کہا، جو کوئی بات راز میں نہیں رکھتا تھا، اس نے اعلان کر دیا کہ عمر بن الخطاب بے دین ہو گیا، تو لوگ ان کو مارنے کے لیے ٹوٹ پڑے اور خوب ان کی پٹائی کی۔

(امتاع الاسماع:۹/۱۰۴)

ایک روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا کہ عمر تو بے دین ہو گیا، تو حضرت عمر فرماتے جا رہے تھے کہ یہ جھوٹ ہے، میں تو اسلام لایا ہوں۔

(الانوار فی سیرۃ النبی المختار:۲۵)

اسی طرح جب صحابہ اسلام کے اولین دور میں قریش واہل مکہ کی زیادتیوں سے تنگ آ کر نجاشی کے ملک حبشہ ہجرت کر گئے، تو وہاں اہل مکہ نے ان کا تعاقب کیا اور نجاشی سے

جا کر جو شکایت کی، اس میں یہی کہا کہ ہمارے یہاں کے کچھ بے وقوف لوگ بے دین ہو کر آپ کے ملک میں پناہ گزیں ہوئے ہیں، ان کو آپ ہمارے حوالے کر دیں۔
(ذخائر العقبی محبّ طبری:۲۰۹)

الغرض جب بھی دین حق کو قبول کرنے والوں نے اس کو قبول کیا، تو لوگ یہی کہتے تھے کہ یہ لوگ بے دین ہو گئے اور یہ کہ ان کو ان کے اصل دین و ملت کی جانب لوٹنا چاہیے، یا نہیں تو ان کو ہمارا ملک چھوڑ جانا چاہیے۔

آج بھی یہی پرانا نعرہ یہاں لگایا جا رہا ہے؛ مگر اس سلسلے میں قابل غور بات یہ ہے کہ نعرہ لگانے والوں نے سب سے پہلے یہ طے کر لیا یا فرض کر لیا ہے کہ ہندو مذہب ہی اصل ہے اور یہاں کی ساری قومیں اسی سے دیگر مذاہب میں تبدیل ہوئی ہیں؛ مگر یہ دعوی کہاں تک اپنے اندر صداقت رکھتا ہے؟

تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ ہندوستان میں پہلے سے مذہب اسلام ہی چلا آ رہا تھا، جو اللہ کی جانب سے نازل کیا گیا آسمانی مذہب ہے اور اللہ تعالی نے یہی ایک دین انسانوں کی دنیوی صلاح و فلاح کے لیے اور اخروی فوز و نجاح کے لیے نازل کیا ہے۔ پھر بعد میں کسی وقت یہاں بت پرستی کا رواج ہوا اور لوگ اس دین سے ہٹ کر کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے۔

چناں چہ ''تاریخ فرشتہ'' جو کہ ہندوستان کی ایک اہم و عظیم و مستند تاریخ ہے، اس کے مصنف: قاسم فرشتہ نے لکھا ہے:

> ''حضرت نوح علیہ السلام کا تیسرا بیٹا حام اپنے عالی قدر والد کے حکم سے دنیا کے جنوبی حصے کی طرف گیا اور اس کو آباد و خوشحال کیا، حام کے چھ بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں: (۱) ہند (۲) سندھ (۳) حبش (۴) افرنج (۵) ہر مز (۶) بویہ۔ ان سب بیٹوں کے نام پر ایک ایک شہر آباد ہوا۔ حام کے سب کے زیادہ مشہور بیٹے ہند نے ملک ہندوستان کو اپنایا اور اسے خوب آباد و سرسبز و شاداب کیا۔''

پھر آگے چل کر ہند کے بیٹوں اور ان کے مقامات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

’’ہند کے چار بیٹے ہوئے، جن کے نام یہ ہیں: پورب، بنگ دکن اور نہروال۔ ہند کے بیٹے دکن کے گھر تین بیٹے ہوئے، ایک کا نام مرہٹ، دوسرے کا کنہڑا اور تیسرے کا نام تلنگ تھا دکن نے اپنے ملک کو تین بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ آجکل دکن میں جو ان ناموں کی تین مشہور قومیں ہیں، وہ ان ہی تینوں کی نسل سے ہیں۔‘‘

(تاریخ فرشتہ: ۱/۶۰)

اس تفصیل سے یہ بات تقریباً واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کا علاقہ دراصل حضرت نوح کے پوتے ہند بن حام کے نام پر بنا ہے اور ان ہی کی جانب منسوب ہے۔ نیز یہ بھی اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ ہند کے بیٹوں میں سے ایک کا نام دکن تھا جس کے نام سے دکن کا علاقہ بنا اور ان کی اولاد میں سے تین کے نام پر اس کے تین حصے ہوئے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ سب لوگ کس دین کے ماننے والے تھے؟ ظاہر و اغلب یہی ہے کہ یہ سب حضرت نوح کے دین یعنی اسلام کے پیروکار تھے اور سب کے سب مسلمان تھے؛ کیوں کہ حضرت نوح کے زمانے میں کفر و شرک کے بیماروں پر جو سیلاب و طوفان کا عذاب آیا تھا، اس کو دیکھنے یا اپنے آباء سے سننے کی ضرور ان کو نوبت آئی ہوگی، اس لیے وہ سب کے سب اسی دین اسلام کی پیروکار رہوں گے۔

تاریخ فرشتہ میں ہے:

’’چوں کہ ہند بن حام نے خدا کی عبادت اور اس کی اطاعت گزاری کرتے ہوئے اسلاف کو دیکھا اور سنا تھا، اس لیے اس کی اولاد بھی نسلاً بعد نسل اسی طریقۂ عبادت کی پیروی کرتی رہی۔‘‘

(تاریخ فرشتہ: ۱/۲۹)

یہی دراصل ہندوستان کے باشندوں کا اصلی مذہب ہے، جس میں ایک اللہ کی عبادت

واطاعت پر زور دیا جاتا ہے اور اسی کو معبود برحق تسلیم کیا جاتا ہے؛ مگر بعد چندے کچھ خارجی اثرات واشخاص کی وجہ سے یہاں کے باشندوں میں کچھ تبدیلی آئی اور وہ بت پرستی کی جانب میلان کرنے لگے، جیسا کہ حضرت نوح کے قبل بھی لوگوں میں یہی حالات رونما ہوئے اور لوگ یکے بعد دیگرے کفر وشرک میں مبتلا ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ طوفان نوح نے ان کو غرق کر دیا؛ چناں چہ یہاں بھی ایک ایرانی النسل شخص نے آفتاب پرستی کی لوگوں میں بیج بودی اور یہاں بت پرستی کا ایک سلسلہ چل پڑا۔

''تاریخ فرشتہ'' کی روایت ہے:

''راجہ سورج کے زمانے میں ایک شخص ایران سے ہندوستان آیا، جس نے ہندیوں کو آفتاب پرستی کی تعلیم دی، اس کی تعلیم سے آفتاب پرستی کا اس قدر رواج ہوا کہ بعضے ستارہ پرست لوگ بھی آگ پوجنے لگے؛ لیکن اس کے بعد جب بت پرستی کا آغاز ہوا، تو یہ رسم سب سے زیادہ رائج ہوگئی۔ بت پرستی کی رسم کے زیادہ رواج پکڑنے کا سبب یہ ہوا کہ برہمن مذکور نے راجہ سورج کو اس بات کا یقین دلایا کہ جو شخص اپنے بزرگوں کی تصویر سونے، چاندی یا پتھر کی بنا کر اس کی پرستش کرتا ہے وہ راہ راست پر ہے۔ اس عقیدے میں لوگ اس قدر پختہ ہوگئے کہ ہر چھوٹے اور بڑے نے اپنے اپنے مردہ اسلاف کی تصویریں بنائیں اور ان کی پرستش شروع کی اور خود راجہ بھی بلدہ قنوج کو بسا کر گنگا کے کنارے بت پرستی میں مشغول ہوا۔''

(تاریخ فرشتہ: ۱/۲۹)

اس تفصیل نے ہمارے سامنے ہندوستان کی جو مذہبی صورت حال پیش کی ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ ہندوستان اسلام کا گہوارہ تھا، حضرت نوح کے پوتے ہند اور اس کی اولاد نے اس کو آباد کیا اور یہاں اسلام کو رواج دیا؛ مگر خارجی اثرات سے یہاں کے بعض لوگوں نے بت پرستی کو قبول کر کے دوسرا مذہب بنالیا اور وہم پرستانہ ذہنیت سے بہت سے دیومالائی

عقائد گھڑ لیے اور اپنے اصلی گھر سے دور ہوتے چلے گئے؛ بل کہ اپنا گھر ہی بھول گئے اور راہ سے بھٹک گئے۔

لہذا گھر واپسی کا نعرہ اگر واقعیت وحقیقت کے لحاظ سے ہے، تو کہنا چاہیے کہ ''اسلام کی جانب واپس لوٹ جاؤ''، کیوں کہ یہی دراصل ہندوستان کے باشندوں کا مذہب و دین تھا؛ بل کہ ساری انسانیت کا بھی یہی دین و مذہب تھا۔

قرآن کریم میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ تمام انسان جیسے ایک ماں باپ کی اولاد تھے، اسی طرح سب کے سب ایک ہی ملت و دین پر قائم تھے۔

(بقرہ:۲۱۳)

بلکہ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہر بچہ فطرت اسلام ہی پر پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

لہذا جن لوگوں نے بعد کی صدیوں میں یہاں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے موقعے پر اسلام کو قبول کیا ہے، وہی لوگ درحقیقت ''گھر واپس'' لوٹنے والے ہیں؛ لہذا ان اسلام لانے والوں سے یہ مطالبہ کہ ''ہندو ہو جاؤ'' گھر واپسی کا مطالبہ نہیں؛ بل کہ گھر سے باہر جانے کا مطالبہ ہے، جس کا ظاہر ہے کہ کسی کو حق نہیں کہ کسی کو اس کے گھر سے دور کرنے کی کوشش یا اس کا مطالبہ کرے۔ اس لیے ان حقائق کی رو سے اسلام کی جانب لوٹنا ہی دراصل اپنے گھر واپسی کی حقیقی و واقعی صورت ہے، اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔

اسلام میں انسانیت کا مقام

آج کل بعض ہندو تنظیموں کے نمائندوں اور پرچارکوں نے اسلام کے خلاف متعصّبانہ خیالات ونظریات کا پرچار کرنا شروع کردیا ہے اور اسلام واہل اسلام کی جانب تعصب وعناد اور غیر مسلمین کے ساتھ ناانصافی وظلم کی نسبت کھلے طور پر کرتے جارہے ہیں اور خاص طور پر اپنے لوگوں کے درمیان اسلام ومسلمانوں کی نفرت پیدا کرنے کی ایک زبردست مہم چلائی جا رہی ہے اور اسلام واہل اسلام کے خلاف یہ باتیں بار بار دہرائی جارہی ہیں اور اس کے لیے ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگوں کو باقاعدہ تربیت دے کر تیار کیا گیا ہے؛ تاکہ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف لوگوں کا ذہن بنایا جائے اور اسلام کے خلاف کہے جانے والے اس جھوٹ کو بار بار دہرا کر اور مختلف ذرائع سے پیش کر کے سچ باور کرایا جائے؛ کیوں کہ بسا اوقات جھوٹ کو بار بار دہرانے کا اثر لوگوں پر یہ پڑتا ہے کہ وہ اس جھوٹ کو سچ سمجھنے لگتے ہیں۔

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق میں ایک بڑی تعداد حق پسندوں اور انصاف بینوں کی بھی ہے، جو ایک جانب عقل وخرد سے کام لیتی اور اچھے و برے میں فرق وتمیز کرتی ہے اور دوسری جانب تعصب وتنگ نگاہی سے دور ہو کر انصاف کے تقاضوں کو بہ دل و جان قبول کرتی ہے اور ایسے لوگوں پر نفرت کے بیج بونے والی اور ملک کی سالمیت میں خلل ڈالنے والی ان تحریکات کا کوئی اچھا اثر مرتب نہیں ہوسکتا؛ بل کہ وہ خود یہ فیصلہ بہ آسانی کرسکتے ہیں کہ حق وسچ کیا ہے اور کیا نہیں؟

اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام حضرت محمد عربی ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور صحابہ وبعد کے ادوار کے مسلم بادشاہوں کی تاریخ کا جو شخص بھی سنجیدگی وحقیقت پسندی کے

ساتھ مطالعہ کرے گا، وہ ضرور اس نتیجے تک پہنچے گا کہ مذہب اسلام ایک جانب احترام ِانسانیت، حقوقِ انسانیت، مساواتِ انسانیت، عدل وانصاف، عفو درگزر، آپسی امداد وتناصر کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور دوسری طرف انسانیت کی تحقیر وتذلیل، تعصب وتنگ نگاہی، قتل وغارت گری، ظلم وعدوان جیسے جرائم کا سخت ترین مخالف بھی ہے۔

اسلام نے سب سے پہلے انسانوں کو جو سبق دیا ہے، وہ دو باتوں پر مشتمل ہے: ایک وحدتِ رب، دوسرے وحدتِ اب۔ وحدتِ رب کا حاصل یہ ہے کہ تمام انسانوں؛ بل کہ تمام مخلوقات کا پروردگار و خدا اور خالق و مالک ایک ہی ایک ہے اور وہ اللہ ہے۔ اس وحدت خداوندی کے سبق سے دو اہم فائدے مقصود ہیں: ایک تو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ سب کے سب انسان اللہ کے بندے اور اس کی عیال ہیں؛ لہذا ہر انسان دوسرے کے لیے نفع بخش و فائدہ مند بنا رہے۔ کوئی انسان کسی کو اذیت و تکلیف نہ دے، نہ کسی کا مال لے، نہ جان لے، نہ کسی کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچائے۔

اس حقیقت کو اللہ کے نبی حضرت محمد ﷺ نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے، چناں چہ فرمایا:

"الخلق عيال الله وأحسنهم إلى الله أنفعهم لعياله"

(مسند بزار: ۶۹۴۷، مسند ابویعلی: ۳۳۱۵، معجم کبیر: ۹۸۹۱، شعب الایمان: ۷۰۴۶)

(مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے بڑھ کر محبوب وہ ہے،
جو ان کے کنبے کے لیے سب سے بڑھ کر نفع بخش ہو۔)

معلوم ہوا کہ اسلام میں سب سے پہلے یہ سبق پڑھایا گیا ہے کہ ساری مخلوق کو اللہ کا بندہ اور اس کا کنبہ سمجھو اور اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو؛ کیوں کہ سب سے زیادہ اللہ کو محبوب وہ بندہ ہے، جو اس کے کنبے کو یعنی اللہ کی مخلوق کو نفع پہنچانے والا ہو۔

دوسرا مقصود اس سبق سے یہ واضح کرنا ہے کہ جب تمام انسان اللہ کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں، تو تمام لوگوں کو اسی ایک اللہ کی عبادت کرنا چاہیے، اسی کی پوجا کرنا چاہیے، اسی

کے لیے قربانیاں کرنا چاہیے، اسی کے سامنے جھکنا چاہیے، اسی سے اپنی حاجات وضروریات میں رجوع کرنا چاہیے؛ کیوں کہ وہی ایک خدا تم سب کا خدا ہے۔

اس تعلیم کو اسلام میں توحید کی تعلیم کہا جاتا ہے، جس نے سارے انسانوں کو اللہ کا کنبہ قرار دیا اور اسی ایک مستحق عبادت ہونا بھی سمجھا دیا۔

اور وحدتِ اب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے تمام انسانوں کو ایک ہی نفس یعنی آدم کے ذریعے پیدا کیا؛ لہذا آدم ہی تمام انسانوں کے باپ ہیں؛ لہذا دنیا کے تمام انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے سب بھائی بھائی اور ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔

دیکھیے اس حقیقت کو قرآن نے کس طرح بیان کیا ہے، ایک جگہ قرآن کہتا ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآئَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴾

(النساء:۱)

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے ان کی بیوی کو پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورتوں کو پھیلا دیا اور اللہ سے ڈرو، جس کے نام سے تم مانگتے ہو اور رشتہ داری کا لحاظ رکھو، بلاشبہ اللہ تعالی تمہارا نگران ہے۔)

اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں ان دونوں امور پر توجہ دلائی ہے، آپ نے حجۃ الوداع کے موقعے پر فرمایا ہے:

« يا ايها الناس! ألا إن ربكم واحد، و إن أباكم واحد ، ألا لا فضل لعربى على عجمى ولا لعجمى على عربى ولا لأحمر على الاسود ولا لاسود على أحمر إلا بالتقوى»

(احمد:۲۳۵۳۶،شعب الایمان:۴۷۷۴،مسند ابن المبارک:۲۳۹،معجم الشیوخ ابن عساکر:۱۰۴۵،معجم اوسط:۴۷۴۹)

(اے لوگو! خبر دار رہو کہ تمہارا خدا ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، خبر دار رہو کہ کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر اور نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر؛ مگر تقوی کی وجہ سے۔)

ایک اور حدیث میں یوں فرمایا:

''اللہ تعالے نے تم سے جاہلی تعصب اور اپنے باپ دادوں پر فخر کا بے ہودہ طرز عمل دور کر دیا، اب یا تو کوئی مؤمن متقی ہوگا یا فاجر شقی، تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔''

(ابوداود: ۵۱۱۸، ترمذی: ۳۲۷۰، مسند احمد: ۸۷۲۱، شعب الایمان: ۴۷۶۷، ابن حبان: ۳۸۲۸، مسند بزار: ۸۵۲۶، بیہقی: ۲۱۵۹۳)

اسلام سے پہلے دنیا میں نسل انسانی کی تفریق اور ان میں طبقاتی اونچ نیچ کا سلسلہ اس حد تک پیدا ہو گیا تھا کہ اگر کوئی انسان خدائی مقام پر پہنچا دیا گیا ہے، تو دوسرا انسان ذلت کی کھائیوں میں ڈھکیل دیا گیا ہے۔ یہود و نصاری نے خود کو اللہ کے بیٹے اور رشتے دار قرار دیا ہوا تھا، مصر کے فرمان روا جن کو فراعنہ کہا جاتا تھا، خود کو ''سورج دیوتا'' کا مظہر و مجسمہ کہتے تھے ، ہندوستان میں ایک خاندان خود کو ''سورج بنسی'' (سورج زادے) اور ایک دوسرا خاندان خود کو ''چندر بنسی'' (ماہتاب زادے) قرار دیتا تھا، شاہانِ فارس کا دعوی تھا کہ ان کی رگوں میں الٰہی خون گردش کر رہا ہے، شاہان روم خود کو خدا سمجھتے و سمجھاتے تھے اور شاہان چین کو ان کی رعایا آسمان زادہ کہتے تھے، عربوں کا اپنی افضلیت کا دعوی تھا اور اپنے مقابلے میں ساری دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے، پھر ان میں قبیلۂ قریش کو سب قبائل عرب پر فوقیت کا دعوی تھا اور ہندو قوم میں طبقاتی تفریق سب سے زیادہ تھی اور آج بھی ہے، جس کے نتیجے میں انھوں نے خود ہندووں کو بھی الگ الگ طبقات میں بانٹ کر ان کے چار طبقے بنا دیے ہیں: ایک برہمن ذات جو ان کے عقیدے کے مطابق برہما جی کے منہ سے پیدا ہوئی ہے؛ لہذا وہ سب سے اونچے درجے کے ہیں اور یہ سیاسی و مذہبی عہدوں کے لیے پیدا ہوئے ہیں ، دوسرے

شاستری جو خدا کے سینے سے بنے ہیں، ان کو ملک کے تحفظ ونگرانی کے لیے وجود دیا گیا ہے، تیسرویش جو خدا کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی ذمے داری تجارت وزراعت ہے اور چوتھے شودر جو خدا کے پیروں سے پیدا ہوئے، یہ سب سے نچلے طبقے کے ہیں اوران کا کام صرف اوپر کے تین طبقوں کی خدمت گاری ہے۔

جب اسلام آیا، تو سب سے پہلے انسانوں کو انسان کے مقام سے واقف کرایا اور تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیا اوران کے مساویانہ حقوق بتائے۔

معروف مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کے تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وحدت نوع انسانی کا یہ سبق اپنے عملی اور دوررس نتائج کے لحاظ سے کتنا اہم ہے!، آخری جداعلی ہر ہر گورے اور ہر کالے کے، ہر وحشی اور ہر مہذب کے، ہر ہندی اور ہر چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے ایک ہی ہیں اور وہ آدم ہیں، یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورث اعلی کوئی اور تھے اور فلاں نسل کے کوئی اور اور نہ یہ کہ برہمن ذات والے برہما جی کے منہ سے پیدا ہوئے اور کھشتری نسل والے ان کے سینے سے اور ویش جاتی والے ان کے پیٹ سے اور شدر ذات والے ان کی ٹانگوں سے، اصلاً انسان انسان سب ایک ہیں۔''

(تفسیر ماجدی)

حضرت جلال الدین رومی رحمہ اللہ نے اپنے ایک شعر میں اسی وحدت نوع انسانی کا اس طرح بیان کیا ہے، کہتے ہیں:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند　　　　در آفرینش زیک جوہر اند

(سارے انسان ایک دوسرے کے اعضا ہیں؛ کیوں کہ اپنی پیدائش میں ایک ہی جوہر سے ہیں)

اسلام کی یہ آواز جس میں تمام انسانوں کو خدائے واحد کا بندہ وکنبہ اور ایک باپ کی نسل واولاد قرار دیا گیا، اگرچہ دنیا والوں کے نزدیک ان کے بنائے ہوئے قوانین وضوابط کے

لحاظ سے بہ ظاہر نہایت اجنبی و غیر مانوس آواز تھی؛ مگر فی الواقع یہ آواز عین فطرت انسانی کے دل کی آواز تھی؛ اس لیے یک لخت مقبول ہوئی اور ہونا چاہیے تھا۔

اس کے ساتھ اسلام نے اخلاقی تعلیمات کا علمی و عملی دونوں طریقوں سے ایک ایسا بے مثال درس دیا، جس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی اور ان اخلاق کو برتنے میں اپنے اور پرائے، مسلم و غیر مسلم، بڑے اور چھوٹے، امیر و غریب اور شاہ و گدا کا کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔

عدل و انصاف کے ساتھ پیش آنے کا حکم ان لوگوں کے حق میں بھی پیش کیا گیا جو دشمنی کرتے ہوں، یہاں تک کہ قرآن نے یہ اعلان کیا:

> ''کسی قوم سے تمہاری اس بنا پر بیزاری کہ انھوں نے تم کو مسجد حرام میں جانے سے روک دیا، یہ بیزاری تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے زیادتی کرو''۔ (مائدہ:۲)

یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقعے کی ہے؛ جب کہ اہل اسلام کو مکے کے غیر مسلمین نے مکے میں داخلے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا، اس موقعے پر اہل اسلام کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ اگر چہ ان لوگوں نے تم کو مسجد میں جانے سے روک کر ایک جرم کیا ہے؛ مگر اس کے باوجود تم کو اس کی اجازت نہیں کہ ان کے ساتھ کوئی زیادتی کرو۔

مسلمانوں کو خود ان کی مسجد یعنی حرم مکے میں داخل ہونے سے روکنے والوں کے ساتھ بھی زیادتی کرنے سے اس آیت کریمہ نے منع کر دیا اور عدل و انصاف کا ایک ایسا سبق دیا کہ ساری دنیا کو اس نے غرق حیرت کر دیا۔

نیز اسلام نے ظلم و ظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور مظلوم کی ہمیشہ نصرت و مدد کا درس دیا، یہاں تک کہ ایک حدیث میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **''أنصر أخاک ظالما أو مظلوماً''** (اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ نے پوچھا کہ مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے، یہ ظالم کی مدد کیا معنی؟ آپ نے فرمایا کہ ظالم کو ظلم

سے روکو، یہی اس کی مدد ہے۔

(بخاری:۲۴۴۴،ترمذی:۲۲۵۵،احمد:۱۱۰۱۳)

اس میں آپ نے مسلم و غیر مسلم یا اپنے و پرائے کا کوئی امتیاز نہیں کیا؛ بل کہ ہر ظالم و مظلوم کا ایک حکم بیان کیا، اگر ظالم مسلمان ہو، تو اس کو بھی روکنا چاہیے، اس کی تائید و مدد کرنا اسلام کی مزاج کے خلاف ہے۔

اب اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے جایئے کہ پیغمبر اسلام کا اسوہ و طریقہ غیر مسلمین کے ساتھ کیا تھا؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک جوان یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا، پس وہ بیمار ہو گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تیمارداری فرمائی۔

(ابن ابی شیبہ:۱۲۰۵۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت ابو طالب بیمار ہوئے، تو آپ نے اس کی بھی عیادت و مزاج پرسی فرمائی۔

(ابن ابی شیبہ:۱۲۰۵۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ آپ مشرکین پر (جو کہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بے انتہاء تکالیف پہنچا رہے ہیں) بددعا کردیں۔ آپ نے فرمایا: ''**إني لم أبعث لعانا و إنما بعثت رحمة**'' (میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔)

(مسلم:۲۵۹۹)

قبیلۂ دوس جو کہ غیر مسلم قبیلہ تھا، جب بعض اصحاب نے ان کے حق میں بددعاء کی گزارش کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رخ ہو کر بیٹھ گئے، لوگ سمجھے کہ اب آپ ان پر بددعاء کرنے جا رہے ہیں، اس لیے آپس میں کہنے لگے کہ اب تو یہ قبیلہ ہلاک ہوگا؛ مگر آپ نے بددعاء کے بجائے یہ دعاء کی کہ: ''**اللهم اهد دوسا و ائت بهم**'' (اے اللہ! دوس

کو ہدایت عطا فرما اور ان کو تو لے آ)　　　　(بخاری)

اب ہم خرد و عقل کے مالک اور انصاف و عدل کے حامل لوگوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا کوئی شخص جس نے اسلام کی تعلیمات میں سے صرف اس ایک ہی تعلیم کا کم از کم مطالعہ کیا ہو اور تاریخی شواہدات کی روشنی میں اس کو جانچا ہو، وہ اسلام کی جانب تعصب و تنگ نظری، ظلم و زیادتی، بدسلوکی و بے انصافی جیسے جرائم و قبائح کا انتساب کرنے کی غلطی کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی خرد و عقل کا مالک اور انصاف و عدل کا حامل اس کی جرأت نہیں کر سکتا؛ بل کہ وہ اس طرح کی حرکت کو ایک گھناؤنا عمل سمجھتا ہے، اس کی نیک نفسی و دیانت اس کو اس بات سے روکتی ہے؛ بل کہ وہ ان حقائق کا مطالعہ کرنے کے بعد بہ بانگ دہل اعلان حق کا فریضہ انجام دیتا اور یہ کہتا ہے کہ اسلام ہی در حقیقت سب سے بڑا انسانیت نواز مذہب ہے، جس نے انسانیت کا ادب و احترام سکھایا، انسانی برادری میں پیدا کی جانے والے مصنوعی تفریق مٹائی، تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ اور ایک باپ کی اولاد قرار دیا۔

چناں چہ انصاف پسند غیر مسلمین نے اسلام کی ان خوبیوں کا کھلے دل سے اقرار دیا اور اس کی گواہی دی ہے، یہاں ہم اہل انصاف کی خدمات میں چند اہم حوالے نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں، جن سے ہماری بات کی تائید ہوتی ہے۔

سابق وزیر اعظم ہند جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی تاریخ میں شمال مغربی ہند کے فاتحین اور اسلام کی آمد کی بڑی اہمیت ہے، اس نے ہندو معاشرے کے فساد کو ظاہر کر دیا اس نے طبقاتی تقسیم چھوت چھات اور ہندوستان کی دنیا سے علاحدگی کو بھی ظاہر کر دیا، اسلامی بھائی چارگی اور مساوات نے جس پر مسلمانوں کا ایمان و عمل ہے، ہندوؤں کے ذہنوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور اس سے خاص طور پر وہ محروم لوگ زیادہ متأثر ہوئے، جن پر ہندوستانی معاشرے نے برابری اور انسانی حقوق سے استفادے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔''　　(ڈسکوری آف انڈیا: ۲۲۵)

مشہور مستشرق پروفیسر گب [GIBB] نے اپنی کتاب: [WHITHER ISLAM] اسلام کی ان خوبیوں کو عالمی تہذیب کے تناظر میں ایک اہم ضرورت قرار دیتا ہے، اس کے الفاظ ہیں:

''اسلام کو ابھی ایک خدمت انسانیت کی انجام دینا ہے، لوگوں کے مراتب، مواقع عمل کے لحاظ سے مختلف نسلوں کے درمیان مساوات قائم کرنے میں کسی سوسائیٹی نے اس کی جیسی کامیابی حاصل نہیں کی ہے، افریقہ، ہندوستان اور انڈونیشیا کے عظیم اور جاپان کے محدود مسلم معاشرے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کس طرح اسلام مختلف نسلوں اور روایات نہ مٹنے والے اختلافات کو تحلیل کر دیتا ہے، اگر مشرق و مغرب کی عظیم سوسائٹیوں میں مخالفت کے بجائے باہمی تعاون پیدا ہونا ہے، تو اس کے لیے اسلام کی خدمات حاصل کرنا لازمی ہوگا۔''

(بحوالہ تہذیب وتمدن پر اسلام کی احسانات، از مولانا ابوالحسن علی ندوی: ۴۷)

برطانوی نژاد معروف فلسفی ٹائب بی ' A . J. TOYNBEE ' نے اسلامی تعلیمات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''مسلمانوں کے درمیان نسلی امتیاز کا خاتمہ اسلام کے عظیم کارناموں میں سے ایک ہے اور موجودہ دور میں تو اسلام کی یہ سعادت وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔۔۔۔حالاں کہ کچھ دوسری حیثیتوں سے انگریزی بولنے والی اقوام کی کامیابیاں عالم انسانیت کے لیے باعث رحمت ثابت ہوئی ہیں؛ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نسلی جذبات کے خطرناک معاملے میں یہ بدقسمت رہا ہے۔''

(بحوالہ تہذیب وتمدن پر اسلام کی احسانات، از مولانا ابوالحسن علی ندوی: ۴۸)

ہندوستان کی معروف شاعرہ سروجنی نائڈو نے بیان کیا:

’’یہ پہلا مذہب تھا،جس نے جمہوریت کی تبلیغ کی اوراس پر عمل کیا،مسجد میں اذان کے ساتھ عبادت کرنے والے جمع ہو جاتے ہیں اوردن میں پانچ بار اللہ اکبر کے اعلان پر ایک ساتھ جھکتے ہیں، اسلامی جمہوریت پر عمل کرتے ہیں ، میں نے بار بار محسوس کیا ہے کہ اسلام اتحادِ عمل سے ایک انسان کو دوسرے انسان کا بھائی بنادیتا ہے، جب آپ لندن میں کسی مصری،الجزائری، ہندوستانی اورترک سے نکلتے ہیں،تو اس کی اہمیت نہیں ہوتی کہ ایک کا وطن مصر ہے اوردوسرے کا ہندوستان۔‘‘

(بحوالہ تہذیب وتمدن پر اسلام کی احسانات،ازمولانا ابوالحسن علی ندوی:۴۷)

پنڈت گیا نندرا دیو شرما شاستری نے گورکپور میں دیے گئے اپنے ایک لکچر میں ان لوگوں کے خلاف جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، بڑے حوصلہ مند طریقے پر کہا:

’’یہ لوگ کیا نہیں دیکھتے کہ محمد ﷺ نے جس تلوار سے خودکولیس کیا تھا،وہ پیار ومحبت ، رحم وکرم ، دوستی و بھائی چارگی ،عفو ودرگزر کی تلوار تھی ، وہ تلوار جو دشمنوں پر فتح پا لیتی ہے اوران کی دلوں کو عداوت سے پاک کردیتی ہے،محمد کی یہ تلوار لوہے کی تلوار سے زیادہ تیز تھی۔‘‘

(بحوالہ:The Choice, Ahmed deedat:136)

الغرض اسلام نے انسانیت کو ایک بلند ترین مقام دیا اورتمام انسانوں کے مساوی قرار دیا،انسانیت کا احترام سکھایا اور کسی ایک انسان کے قتل کو ساری انسانیت کا قتل ٹھہرایا اوراس مساوات انسانیت کے اسلامی نعرے نے تمام طبقات انسانی پر اثر ڈالا اوراس کی معنویت و معقولیت کو سبھی نے قبول کیا۔اس کے بعد کیا گنجائش ہے کہ کوئی اسلام یا اہل اسلام کو انسانیت کا دشمن یا انسانی حقوق کی پامالی کا مرتکب قرار دے؟ کیا اس سے بڑا کوئی جھوٹ ہو سکتا ہے؟اس سے بڑی کوئی ناانصافی متصور ہے؟

قانون اسلامی میں مذہبی آزادی کا حق

سیکولر ڈیموکریسی نظام { Secolar Democracy } کا نعرہ ہے کہ رعایا کو مذہبی آزادی کا حق حاصل ہے اور ہونا چاہیے اور سیکولر ڈیموکریسی نظام حکومت قیام اسی بنیاد پر ہوا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ جہاں سیکولر حکومتیں ہیں، وہاں لوگوں کو ان کے مذہب و عقیدے اور ان کے اپنے شخصی قوانین پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ اس میں تو کلام نہیں کہ اس نظام کا دعوی یہی ہے اور اسی دعوے پر اس کو فروغ بھی ملا ہے؛ مگر جب ہم اس کو واقعاتی دنیا میں دیکھتے ہیں، تو واقعہ اس کے خلاف سامنے آتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ صرف ان حکومتوں کا نعرہ ہی نعرہ اور دعوی ہی دعوی ہے؛ کیوں کہ بیشتر سیکولر حکومتوں میں تمام باشندوں کو ایک ہی سیکولر نظام یا ملکی قانون کا پابند بنانے کی کوشش کی جاتی ہے؛ بل کہ ان کو اس کا پابند قرار دیا جاتا اور اس پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انتہائی عجیب بات ہے کہ جمہوری نظام کو ایک جانب یہ دعوی ہے کہ اس نظام کے تحت چلائی جانے والی حکومتوں میں اس کے باشندوں کو اپنے اپنے مذہب و عقیدے پر عمل کرنے کی آزادی ہوتی ہے اور دوسری جانب وہ عملاً اس کے خلاف قانون سازی کرتا ہے۔

چناں چہ متعدد مغربی ملکوں میں آج بھی تمام باشندوں کے لیے ایک ہی قانون لاگو کیا گیا ہے اور سب کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اسی کے مطابق اپنے تمام امور میں عمل کریں، خواہ وہ عیسائی ہوں، یا مسلمان ہوں یا ہندو یا اور کوئی اور مسئلہ خواہ شادی و نکاح کا ہو یا طلاق و فسخ نکاح کا، یا جائیداد کی تقسیم کا یا کوئی کوئی کچھ ہو۔

ہمارا ملک ہندوستان بھی جمہوری ملک ہے اور اس کے قانون نے بھی یہاں کے سب

باشندوں کو یکساں طور پر یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے سلسلے میں آزاد ہیں، ان کو ان کے مراسم عبادت ادا کرنے اور اپنے مذہب کے مطابق حلال وحرام چیزوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا پورا پورا حق ہے اور اہل ہند کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ بہت حد تک یہاں کی حکومتیں اس آئین وقانون کی پابندی کرتی ہیں؛ مگر کبھی کبھی بعض جمہوریت کے دشمن عناصر اس بنیادی قانونی حق کو غبن کرنے کی کوشش شروع کرتے ہیں، جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہمارے اس دیش میں مسلمانوں کے عقیدے کے خلاف ''گاؤکشی'' کوممنوع قرار دینے کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے اور آئے دن آواز لگائی جاتی ہے کہ گاؤکشی پر پابندی لائی جائے ؛حالاں کہ یہ اس بنیادی قانونی حق کے خلاف ہے، جو یہاں کا جمہوری آئین مذہبی آزادی کے سلسلے میں یہاں کے باشندوں کو دیتا ہے ۔اسی طرح کبھی طلاق کے مسئلے میں، کبھی نکاحوں کے بارے میں، کبھی اذان اور نماز کے بارے میں آوازے کسے جاتے ہیں اور ان کے پرسنل لاء میں مداخلت کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ حال ہے آج کے سیکولر نظاموں کا جو دنیا میں رائج ہیں؛ مگر اس کے باوجود کس قدر عجیب بات ہے کہ بہت لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ دنیا میں مذہبی آزادی کا تصور اگر کسی نے پیش کیا ہے، تو وہ ڈیموکریسی نظام نے پیش کیا ہے؛ مگر یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے، جس کی بنیاد تاریخ سے عدمِ واقفیت ہے۔

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مذہبی آزادی کا تصور اسلامی قانون کی دین ہے؛ چناں چہ اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے اپنے قانون کی اہم دفعات میں جہاں اپنی غیر مسلم رعایا کی جان و مال وآبرو وعزت اور ان کے عبادت گاہوں کی حفاظت کو شامل کیا تھا، وہیں اس کو بھی شامل کیا کہ ہر شخص کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

ہم یہاں اس مضمون میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے اسلام نے اپنے قانون

میں ''مذہبی آزادی'' کا وہ واضح تصور پیش کیا کہ آج جمہوری حکومتوں کے ایوانوں سے اسی کی آوازِ بازگشت سنائی دے رہی ہے، اگر چہ یہ حکومتیں آج تک بھی صحیح طور پر اس کو اپنے نظام میں نافذ العمل نہیں کر سکی ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں تاریخ اسلام کے صفحات سے اور فقہ اسلامی کے قانونی دفعات سے چند شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔

چناں چہ حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب ملک شام فتح کیا اور وہاں ایلیاء وغیرہ علاقوں کے لوگوں کو عہد نامے لکھ کر دیے گئے، تو ان میں سے اہل ایلیاء اور اہل لد کو جو عہد نامہ لکھوایا تھا، اس میں یہ بھی تھا:

''أعْطَاهُم أماناً لأنفُسِهِم، وأموَالِهِم، و لِكَنَائِسِهِم، وصُلبَانِهِم و سَقِيمِها، و بَرِيئِها، و سائر ملتها : أنّهُ لا تُسكَنُ كَنائسُهم، ولا تُهدَمُ، ولا يُنتقَصُ منها، و لا من حيزها، و لا من صَليبهم، و لا من شَيءٍ من أموالهم، ولا يُكرَهُونَ على دِينِهم''.

(تاریخ الأمم والملوک: ۲/۴۴۹)

(امیر المؤمنین عمر نے ان کو جان و مال، عبادت خانوں، صلیبوں کے متعلق امن دیا، خواہ وہ صحیح سالم ہوں یا شکستہ اور ان کے مذہبی مراسم و طریقوں کے بارے میں بھی امن دیا کہ (مسلمانوں کو) ان کے عبادت خانوں میں نہ رہائش دی جائے گی، نہ ان کو گرایا جائے گا اور نہ ان میں کمی بیشی کی جائے گی اور نہ ان کے عبادت خانوں کی متعلقہ عمارتوں میں یا صلیبوں میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کے مالوں میں سے بغیر حق کے کچھ لیا جائے گا اور ان کو ان کے مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا۔)

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ امارت میں سن ۱۹ ہجری میں شہر نہاوند فتح ہوا اور اہل ماہین کو حضرت نعمان بن مقرن نے صلح نامہ لکھ کر دیا، اس میں جو لکھا گیا تھا، اس کا ایک جملہ یہ بھی تھا:

’’أعطاهم الأمان على أنفسهم، و أموالهم، و أراضيهم، ولا يغيرون على ملة، ولا يُحَالُ بينهم و بين شَرَائِعِهم‘‘

(تاریخ الأمم والملوک،طبری:۲/۵۳۰)

(ان کوان کی جانوں ،ان کے مالوں ،ان کی زمینوں کے متعلق امان دیا جاتا ہےاوران کے مذہب سے ان کو بدلانہیں جائے گا اوران کےاوران کے مذہبی مراسم وطریقوں میں مداخلت کی جائے گی۔)

اسی طرح حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے محرم سنہ ۱۹ میں اہل ماہ دینار کو جو خط تحریر کر کے دیا،اس میں لکھا ہے:

’’أعطاهم الأمان على أنفسهم و أموالهم و أراضيهم، ولا يغيرون عن ملة ، ولا يُحَالُ بينهم و بين شَرَائِعِهِم‘‘

(تاریخ الأمم والملوک،طبری:۲/۵۳۰)

(ان کوان کی جانوں ،ان کے مالوں ،ان کی زمینوں کے متعلق امان دیا جاتا ہےاوران کے مذہب سے ان کو بدلانہیں جائے گا اوران کےاوران کے مذہبی مراسم وطریقوں میں مداخلت کی جائے گی۔)

جب شہر بعلبک مفتوح ہوا،تو حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک عہد نامہ دیا،جس میں منجملہ اورامور کےایک بات یہ لکھی تھی:

’’و أنهم على نسكهم ، لا يكرهون عليه‘‘(مختصر تاریخ دمشق لابن منظور:۴/۱۸۲)

(یہ غیر مسلم لوگ اپنے مذہبی طریقے پر ہوں گے،ان کواس کے خلاف مجبور نہیں کیا جائے گا۔)

اسی طرح حضرات فقہائے کرام نے اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ خرید وفروخت کے تمام معاملات میں وہ مسلمانوں ہی کی طرح ہوں گے، سوائے ان امور کے جن میں ان کا دین و مذہب اس کے خلاف ہے کہ وہ ان امور میں اپنے

دین وشریعت کے مطابق کریں گے۔

ہدایہ جوفقہ اسلامی کی ایک معتبر کتاب ہے، اس میں لکھا ہے:

''وأهل الذمة في البياعات كالمسلمين .... إلافى الخمروالخنزير خاصةً ؛ فإن عقدهم على الخمر كعقدالمسلم على العصير،وعقدهم على الخنزير كعقد المسلم على الشاة؛لأنهاأموال فى اعتقادهم،ونحن نأمرنا أن نتركهم ومايعتقدون.'' (الہدایۃ:۳/۷۹)

(ذمی لوگ (اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے) تمام معاملات میں مسلمانوں ہی طرح ہوں گے، سوائے شراب اور خنزیر کے بارے میں خاص طور پر (وہ اپنے عقیدے پر عمل کر سکتے ہیں) کیوں کہ ان کا شراب کا معاملہ کرنا۔ ایسا ہی ہے جیسے مسلمان کا شربت کا معاملہ کرنا اور ان کا خنزیر کا معاملہ کرنا ایسا ہے جیسے مسلمان کا بکری کا معاملہ کرنا، اس لیے یہ شراب اور خنزیر ان کے نزدیک مال شمار ہوتے ہیں اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان کے دین و عقیدے کے درمیان مداخلت نہ کریں۔)

فقہ اسلامی کا عظیم انسائیکلوپیڈیا ''مبسوط امام سرخسی'' میں ہے:

''وهو في جميع بياعاته بمنزلة المسلم إلاّ في الخمر والخنزير'' (مبسوط امام سرخسی:۲۹/۱۱۰)

(اور وہ یعنی غیر مسلم تمام معاملات میں مسلمان ہی کی طرح ہوگا سوائے شراب وخنزیر کے۔)

فقہ اسلامی کی ایک اور مستند کتاب: ''تبيين الحقائق'' اور اسی کے قریب قریب ''البحر الرائق'' میں لکھا ہے:

”فکل ما جاز للمسلمین من البیاعات کالصرف، والسلم، وغیرھما من أنواع التصرفات جاز لھم، وما لا یجوز من الربا وغیرہ لا یجوز لھم إلا فی الخمر والخنزیر، فإن عقدھم فیھما کعقد المسلم علی العصیر و الشاۃ.....لأنھما أموال نفیسۃ عندھم .... وھذا إنا أمرنا أن نترکھم و ما یعتقدون“.

(تبیین الحقائق:۱۱/ ۳۳۰،البحر الرائق:۶/ ۱۸۸)

(پس جو کچھ مسلمانوں کے لیے جائز ہے، وہ غیر مسلم رعایا کے لیے بھی جائز ہے، جیسے بیع صرف بیع سلم وغیرہ اور جو مسلمانوں کے لیے جائز نہیں، وہ ان کے لیے بھی جائز نہیں ہوگا، جیسے سود وغیرہ، سوائے شراب وخنزیر کے؛ کیوں کہ ان کا ان دونوں کے بارے میں معاملہ کرنا ایسا ہے جیسے مسلم کا شیرہ اور بکری کا معاملہ کرنا......کیوں کہ یہ دونوں چیزیں ان کے نزدیک بہترین مال ہیں، ....اور یہ ان کے حق میں جائز ہونا اس لیے ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان کو اور ان کے دینی مراسم کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔)

یہی بات ”الجوہرۃ النیرۃ: (۲/ ۳۴۲)اور”اللباب فی شرح الکتاب: (۱/ ۱۳۰) العنایۃ وغیرہ فقہی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔

یہ بات صرف ان دو تک محدود نہیں ہے، بل کہ حسب تصریح اللباب منیتہ ومردار کی بیع ومجوسی کا ذبیحہ وغیرہ میں بھی ہے۔

اسی طرح شادی ونکاح کے مسائل میں بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہر وہ نکاح جو اہل اسلام میں کسی شرط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے حرام ہوتا ہے جیسے نکاح بلا گواہ یا عدت کے اندر نکاح، اگر یہ غیر مسلموں کے یہاں ان کے عقیدے کے مطابق جائز ہے، تو ان کا نکاح مانا جائے گا اور ان کو اس نکاح پر برقرار رکھا جائے گا۔اسی طرح اپنے محرموں سے وہ نکاح کریں (جیسے ہندوؤں میں ماموں بھانجی کا نکاح ہوتا ہے) تو چوں کہ ان کے اعتقاد

میں یہ جائز ہے؛ لہٰذا اس کو برقرار رکھا جائے گا۔

(البحر الرائق: ۲۲۲/۳، الدر المختار مع الشامی: ۱۸۵/۳)

الغرض بتانا یہ ہے کہ اسلامی قانون نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو مذہبی آزادی عطا ہے اور ان کے عقیدے کے مطابق ان کو چلنے کا اختیار دیا ہے۔

یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ اسلامی قانون میں جو کہ اللہ کا دیا ہوا قانون ہے، شراب اور خنزیر حرام اور سخت حرام چیزیں ہیں، ان کی خرید وفروخت اسلامی مملکت میں ممنوع ہے، حتی کہ شراب پینے والے پر اسلامی قانون میں اخروی عذاب کے علاوہ دنیوی سزا بھی اسی کوڑوں کی مقرر ہے؛ مگر اس کے باوجود اسلامی قانون صراحت کرتا ہے کہ یہ قانون مسلمانوں کے لیے جاری ہوگا، غیر مسلم رعایا پر اس قانون کا نفاذ نہ ہوگا؛ بل کہ ان کو ان چیزوں کی اجازت ہوگی اور یہ اجازت اس بنیاد پر ہوگی کہ اسلامی قانون غیر مسلم رعایا کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی و مداخلت کا روادار نہیں ہے۔

پھر یہاں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ غیر مسلم رعایا کے لیے یہ مذہبی آزادی اس ملک میں نہیں دی جارہی ہے، جو آج کل کی زبان میں ''جمہوری ملک'' کہلاتا ہے؛ بل کہ اس ملک میں یہ رعایت دی جارہی ہے، جس کا دعوی ''اسلامی مملکت'' ہونے کا ہے، خالصتاً اسلامی ملک ہونے کے باوجود ہمارے اسلامی قانون نے اس میں بھی ''مذہبی آزادی'' دے کر ساری دنیا کو یہ دکھایا ہے کہ ''حقیقی جمہوریت'' تو دراصل اسی کا نام ہے، صرف جمہوریت نام رکھ دینے اور عوام کا گلا گھونٹنے نے کوئی ملک جمہوری ملک نہیں بن جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ صحیح جمہوری قانون بھی اسلام ہی کی دین ہے، اسی نے حقیقی جمہوریت کا سبق دنیا والوں کو دیا اور عوام الناس کی رائے کا، ان کے مذہبی خیالات وعقائد کا اور ان کے طور طریقوں کا احترام سکھایا، جس کی تفصیلات اوپر پیش کی گئیں ہیں، پس جو شخص بھی انصاف کی نظر سے ان امور کو دیکھے گا، وہ ضرور بالضرور اس بات کا اقرار کرے گا کہ اسلام نے اپنی رعایا کو مذہبی آزادی دی اور ان کے عقیدے و مذہب کے بارے میں اسلامی

حکومت کو مداخلت نہ کرنے کا پابند کیا ہے۔

اے کاش! کہ آج کی جمہوری حکومتیں اس سے کوئی سبق لیتیں اور عوام ورعایا پر ان کی جانب سے نافذ کیے جانے والے غیر جمہوری فیصلوں سے وہ باز آتیں!

☆☆☆

یوگا یا سوریا نمسکار - اسلامی نقطہ نظر سے ناقابل قبول

وزیر اعظم مودی جی نے اقوام متحدہ سے ۲۱/ جون کے دن کو ''عالمی یوم یوگا'' کے طور پر منظور کروالیا ہے اور اسی کے ساتھ یہاں کی سرکاری مشنری اور مختلف ہندو تنظیموں کی جانب سے بڑی کوشش یہ ہورہی ہے کہ یوگا کو یہاں کے سارے باشندوں پر اور بالخصوص اسکولوں میں طلبہ و طالبات پر واجبی ولازمی کام کے طور پر لاگو کیا جائے؛ لہذا اس کے فوائد ومنافع کا تذکرہ زور وشور کے ساتھ کیا جارہا ہے، اس کو مذہبی رسم کے بجائے ایک طبی عمل قرار دیا جارہا ہے، اس کی تبلیغ و دعوت بھی خوب خوب کی جارہی ہے اور وہ بھی محض ترغیبی پہلو اور عنوان کے ساتھ نہیں؛ بل کہ اس کی خلاف ورزی پر تہدید وترہیب کے عنوانات بھی اختیار کیے جارہے ہیں۔

مگر اس پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ اس سے قطع نظر کہ یوگا مذہبی رسم ہے یا غیر مذہبی، آخر اس کی ایسی کیا ضرورت پیش آئی کہ اس کو اس قدر اہمیت دی جارہی ہے؟ کیا اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے؟ کیا حکومت کے پیش نظر اس کے سوا کوئی اور مسئلہ قابل توجہ نہ تھا کہ اس کی جانب زیادہ توجہ دی جاتی اور کیا سارے مسائل ہمارے حل ہو چکے ہیں؟

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ یوگا کے جاری ونافذ کرنے سے یا ''یوم یوگا'' منانے سے آخر عالمی برادری میں ہندوستان کی کیا کوئی شناخت قائم ہورہی ہے یا اس کی وجہ سے ملک کی حیثیت میں کوئی اضافہ اور اس کو چار چاند لگ رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سے ایسی کوئی بھی بات وابستہ نہیں ہے۔ پھر خواہ مخواہ اس کا ہوا کیوں کھڑا کیا جارہا ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ بی جے پی نے انتخابات سے

پہلے اپنا جو ایجنڈا پیش کیا تھا، اس میں عوامی فلاح و بہبودی کے متعدد پروگرام اور تعمیری وعدے شامل تھے؛ مگر ان میں سے کسی پر بھی عمل نہیں ہوسکا اور آج تک یہ سارے مسائل تشنہ کام نظر آتے ہیں۔ اسی لیے متعدد سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ مودی سرکار نے اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے جہاں اور مسائل چھیڑ رکھے ہیں، وہیں اب اس مسئلے کو چھیڑ دیا ہے؛ تاکہ لوگ اسی بحث و مباحثہ میں لگے رہیں اور اصل مسائل کی جانب توجہ نہ دی جاسکے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ یوگا اگر کوئی صحت بخش عمل اور مفید ورزش ہے، تب بھی اس کا اطلاق ہر ایک پر کرنے کا راز سمجھ سے بالاتر ہے؛ کیوں کہ دنیا میں ایک طویل عرصے سے مختلف قسم کے تجربات کے نتیجے میں بہت سے مفید و صحت بخش طریقے لوگوں میں معروف و مسلم چلے آرہے ہیں، جن میں قدیم و جدید سبھی طریقے ورزش و کسرت کے داخل ہیں اور لوگوں کو معلوم بھی ہیں اور ان کے مابین رائج بھی ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان تجربات کی روشنی میں کسی کو کوئی طریقہ زیادہ مفید لگتا ہے، تو کسی کو دوسرا طریقہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور اسی لیے یوگا قدیم زمانے سے ہونے کے باوجود اکثر لوگ اس کے بجائے دوسرے طریقوں کو اپنے لیے پسند کرتے چلے آئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان سب طریقوں کو چھوڑ کر خاص ''یوگا'' پر اس قدر زور دینا اور سب پر اس کو لاگو کرنے کی کوشش کرنا کس دلیل کی بنیاد پر معقول عمل سمجھا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ دنیا میں ورزش کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ ثابت ہے کہ سب سے عمدہ و بہتر یہی طریقہ ہے؛ بل کہ بہت سے لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوگا کی اس تحریک کے پیچھے کوئی راز ہے، جس کو چھپایا جارہا ہے اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہوئے اس کو ایک جسمانی ورزش کا نام دیا جارہا ہے۔

لہٰذا رائے دینے والوں کی یہ رائے غلط نہیں معلوم ہوتی کہ مودی سرکار اور بی جے پی کا جو ایجنڈا ہے کہ ملک کو ہندو راشٹر بنایا جائے، یہ دراصل اسی کی تمہید ہے اور آہستہ آہستہ لوگوں کو ہندو مذہب سے قریب کرنے اور برہمنی تہذیب میں رنگنے کی ایک کوشش؛ بل کہ

ایک سازش ہے۔

اس کے بعد ہمیں دو باتوں پر روشنی ڈالنا ہے: ایک تو اس پر کہ یوگا محض ایک ورزش ہے یا ہندوانہ وبرہمنی طریقے کی عبادت؟ دوسرے یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا حکم کیا ہے؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اس سلسلے میں شروع سے اب تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ یوگا دراصل ایک طریقۂ عبادت ہے، جو برہمنی عقائد اور ہندوانہ رسوم کے مطابق انجام دی جاتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ یوگا ان کی عبادت کا ایک طریقہ ہے۔ اگر چہ اب بعض حلقوں کی جانب سے یہ آواز اٹھائی جارہی ہے کہ یوگا کوئی عبادت نہیں؛ بل کہ ایک جسمانی ورزش ہے اور یہ ایک سائنٹیفک اور طبی طریقۂ علاج ہے اور یہ کہ اس سے بہت سی بیماریوں کا علاج ہوجاتا ہے، وغیرہ، وغیرہ؛ مگر جب دلائل کی رو سے جانا جاتا ہے، تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ’’یوگا‘‘ ایک ہندوانہ رسم وطریقۂ عبادت ہے۔

اور اس کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ یوگا کا بنیادی فلسفہ ہندو مذہب کی بنیادی کتاب ’’گیتا‘‘ سے ماخوذ ہے اور خود وہ لوگ بھی یوگا کا مصدر وماخذ اسی کو مانتے ہیں۔ اور یہ بات مسلم بھی ہے اور سب کو معلوم بھی اور خود گیتا کے صفحات بھی اس کے شاہد ہیں کہ گیتا ہندو عقیدے کے مطابق ’’شریعت‘‘ یعنی قانون خداوندی ہے، چناں چہ گیتا کے مستند شارح سری شنکر آچاریہ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے، جس کو یہاں اس کے انگریزی ترجمے سے نقل کرتا ہوں، وہ لکھتے ہیں:

> It is the religion, which was thought by the Lord, that the omniscient and adorable Veda-Vyasa (the arranger of the Vedas) embodied in the seven hundred verses called Gitas.

(Bagwad Gita comentary by Sri Sankar acharya, english translation by Alladi Mahadeva Sastry: p:4)

مطلب یہ ہے کہ یہی وہ ویداس والا مذہب، جس کو خدا کی جانب سے جو وجود مطلق و کلی اور ویدوں کا تالیف کرنے والا ہے، سکھایا گیا تھا، اس کو سات سو آیات میں گیتا میں جمع کیا گیا ہے۔

اس عبارت کو پڑھنے والا کوئی بھی شخص یہ فیصلہ کرتے ہوئے متذبذب نہیں ہوسکتا کہ گیتا ایک مذہبی کتاب ہے، جس کو ہندو کے یہاں ایک مذہبی کتاب اور مذہبی شریعت کے نظریے سے مانا جاتا ہے۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ ہمیشہ سے یوگا کا یہ طریقہ ہندو رشیوں اور آچاریوں میں ہی رائج رہا ہے اور وہی اس کے کرتا دھرتا سمجھے جاتے ہیں، جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس کا تعلق ہندو عقیدے وعمل سے ہے؛ کیوں کہ جو چیز کسی مذہب کی ہوتی ہے، وہ اس کے مذہبی طبقے کے لوگوں میں پروان چڑھتی اور وہی اس کے ذمے دار ہوتے ہیں۔

اگر یہ محض ایک سائنسی طریقۂ ورزش ہوتا، تو اس کی کوئی وجہ نہیں کہ اس کا رواج صرف ہندوؤں میں اور ان کے رشیوں اور جوگیوں میں ہوتا۔

نیز ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''گیتا'' کے اوراق اور اس میں دیے گئے کرشن جی کے بیانات کو پڑھتے جایئے، تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ دراصل یوگ کا عمل ان کے نظریے کے مطابق ایک ''مقدس عبادت'' ہے، جس کا مقصد ایک جانب جسمانی ورزش ہے، تو دوسری جانب ''روحانی ورزش'' اور بھگوان (خدا) تک رسائی کے لیے مختلف درجات عمل طے کرتے کرتے اس حال کو پالینا ہے کہ خود خدا میں روح انسانی حلول کر جائے اور خدا و بندے کی دوئی ختم ہو جائے۔

اس حقیر نے ان دنوں حقیقت حال جاننے کے لیے ''گیتا'' اور اس کی شرح جو شنکر آچاریہ نے لکھی ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ، جو الاڈی مہادیوا ساستری نے کیا ہے، نیز گیتا کی اردو شرح مصنفہ سوامی اڑگڑانند وغیرہ کتب کا مطالعہ کیا (اور ممکن ہے کہ ''تکبیر مسلسل'' کی کسی قریبی اشاعت میں ہم ان کتب کے حوالجات کے ساتھ اس سلسلے میں مکمل و مدلل تحریر

پیش کریں؛ مگر فی الحال مطالعے کا نچوڑ پیش ہے کہ) ان کتب سے بھی یہ بات ایک واضح حقیقت کے طور پر سامنے آئی کہ سری کرشن نے گیتا میں اپنے شاگرد ارجن کو کچھ اہم تعلیمات دی ہیں اور ان میں سے ایک یوگا بھی ہے، جس کو ان کی تعلیم میں ایک اہم مقام حاصل ہے؛ نیز اس کے جو مقاصد بیان کیے ہیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ یوگا سے ایک عبادت و ریاضت مقصود ہے، جس سے انسان خواہشات نفسانی سے چھٹکارا حاصل کر کے اور اپنے دماغ و خیال، اپنے دل و روح کی صفائی و پاکی حاصل کر کے خدا کی قربت پاتا ہے اور اس قدر قریب ہوتا ہے کہ اس کی روح خدا کی روح سے مل جاتی ہے، یہی مقصد ہے، جس کے لیے یوگا کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پھر یوگا سے اس مقصد کو پانے کے لیے جو طریق عمل اختیار کیا جاتا ہے، اس میں بتوں کی عبادت وخوشنودی کو بھی ذریعہ بنایا جاتا ہے اور اسی میں سورج کی پوجا بھی داخل ہے؛ بل کہ متعدد جگہ گیتا میں ہے کہ یوگا اصل میں سورج کو سکھایا گیا، پھر سورج سے منو نے سیکھا؛ لہذا سورج کی پوجا کو اس میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

غور کیجیے کہ اس تعلیم میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ یوگا کا مقصد روح و دماغ کی صفائی اور روحانی ترقی اور خواہشات سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے اور اس ذریعے سے خدا کی قربت پانا ہے۔ کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یوگا جسمانی ورزش نہیں؛ بل کہ ایک روحانی ترقی اور خواہشات نفسانی کے ازالے کا ذریعہ ہے، پھر اس کو ایک جسمانی ورزش قرار دینا کیا قرین عقل و دانش ہوسکتا ہے؟

جب یہ واضح ہوگیا کہ یوگا ایک ہندوانہ طرز و رسم کی عبادت ہے، تو اب ہمیں دوسرے پہلو سے غور کرنا ہے کہ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

اس کا جواب واضح ہے: ایک تو اس لیے کہ یہ ایک ہندوانہ رسم وطریق عبادت ہے، اس کا اختیار کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے، اسلام نے عبادت کا طریقہ ہمیں سکھایا ہے اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اللہ تعالی کے حکم سے جو طریقہ ہمیں سکھا

دیا ہے، اس میں نجات وفوز وفلاح ہے، اس کے علاوہ کسی اور طرز عبادت کو اختیار کرنا جائز نہیں، اگر یہ طریقہ کسی زمانے میں تھا بھی، تو وہ اسلام کے آنے کی وجہ سے منسوخ ہو گیا

دوسرے اس لیے کہ یوگا والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس سے انسانی روح خدا میں ضم ہو جاتی ہے، یہ عقیدہ اسلامی نقطۂ نظر سے کفریہ عقیدہ ہے، کیوں کہ خالق ومخلوق کا متحد ہونا ایک محال امر ہے اور اس سے خالق ومخلوق کے مابین جو ایک حد فاصل ہے، جو اسلامی عقیدۂ توحید کی بنیاد ہے، وہی ختم ہو جاتی ہے اور اس سے انسان شرک کی وادی میں پڑ جاتا ہے۔

تیسرے اس میں بتوں کی پوجا اور سورج کی پوجا اور اس کے نمسکار شامل ہے، جو اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے سراسر شرک ہے اور اسلام کسی طرح ایک لمحے کے لیے بھی غیر خدا کی پوجا کو برداشت نہیں کرتا؛ بل کہ وہ تو اسی کو دنیا سے مٹانے آیا اور سبھی لوگوں کو ایک خدا کی عبادت کا سبق پڑھانے آیا ہے۔

یہ باتیں نہایت واضح ہیں، جن کو ہر کوئی موٹی سے عقل سے بھی سمجھ سکتا ہے؛ لہٰذا اسلامی نطقہ نظر سے یوگا کے جواز کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا؛ لہٰذا ہمارے نزدیک اور جمہور اہل اسلام کے نزدیک یوگا کا عمل اسلامی نقطہ نظر سے ناجائز؛ بل کہ کفر وشرک کے دائرے میں آجاتا ہے۔

لہٰذا اہل اسلام کے دین وایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اس سے پورے طور پر بچیں اور اس میں کسی طرح بھی نہ خود شریک ہوں اور اپنی اولاد کو اس میں شریک ہونے دیں۔

اس کے بعد ہمیں ایک بات تو اہل حکومت سے کہنی ہے، وہ یہ کہ سب لوگوں پر یوگا کا نفاذ ایک غیر جمہوری فیصلہ ہے؛ کیوں کہ اس سے مذہبی آزادی کا حق جو ہندوستانی تمام باشندوں کو یکساں طور پر بنیادی حقوق میں دیا گیا ہے، اس پر براہ راست ضرب پڑتی ہے؛ لہٰذا حکومت کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔

دوسری بات اہل ایمان سے کہنا ہے، وہ یہ کہ یہ دور ہمارے لیے دور امتحان وابتلاء ہے، کس کا امتحان؟ ہمارے ایمان کا امتحان! اللہ تعالی کی عادت وسنت رہی ہے کہ وہ کبھی لوگوں

کے ایمان کو جانچنا چاہتے ہیں، اس کا گریڈ اور درجہ معلوم کرتے ہیں کہ یہ ایمان کا دعوے کرنے والے ایمان میں کہاں تک راسخ ہیں؟ کس قدر مضبوط ہیں، کہیں ان کے قدم ڈگمگاتے تو نہیں، یہ دینا کی خاطر کہیں ایمان تو نہیں بیچ دیتے، مفادات کی خاطر کفر و شرک کو تو نہیں خرید نہیں لیتے؟ اور ''اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ'' اور ''الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى'' کا مصداق تو نہیں بن جاتے؟

اس وقت ہمیں اپنے ایمان کا امتحان دیتے ہوئے مضبوط و کامل یقین کا ثبوت دینا چاہیے، ہر مفاد کو لات مار دینا چاہیے، ہر نفع کو ٹھکرا دینا چاہیے اور یہ حوصلہ ہونا چاہیے کہ نہ بڑی سے بڑی دولت کا لالچ ہمارے قدموں میں جنبش پیدا کر سکے، نہ خوف و دہشت ہمارے ایمانوں میں کوئی تزلزل پیدا کر سکے۔

اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ہم سبھی کو ثابت قدم رکھے اور اپنے ایمان کو محفوظ و باقی رکھنے میں ہمیں بھر پور مدد پہنچائے۔

نظام تربیت

یہ بات ہر شبہ سے بالاتر ہے کہ مدارس کا قیام محض تعلیم کے لیے نہیں ہے؛ بل کہ تعلیم کے ساتھ ان کا اس سے بھی اونچا مقصد طلبا کی ذہنی وفکری اصلاح ،عملی و اخلاقی تربیت بھی ہے؛اس لیے یوں کہا جا سکتا ہے کہ مدارس دو کاموں کے ذمے دار ہیں: ایک یہ کہ طلبا میں صلاحیت پیدا کریں اور دوسرے یہ کہ ان میں صالحیت پیدا کریں؛ لہٰذا مدارس کا کام عام اسکولوں اور کالجوں کے لحاظ سے بڑا بھی ہے اور بڑھا ہوا بھی ہے۔اگر چہ مدارس کی فضا اور وہاں کا ماحول ہر وارد و صادر کے لیے ''روحانیت ونورانیت'' کا سبق و درس دیتا ہے؛لیکن اس میں کیا شک ہے کہ اس سبق و درس سے فائدہ وہی لوگ اُٹھاتے ہیں، جو اپنی شرست میں خیر،فطرت میں نیکی اور مزاج میں اعتدال کی خوبی کے حامل ہوتے ہیں ؛اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس ماحول میں پلنے والے طلبا کا مزاج وطبیعت بنانے کی بھی فکر کی جائے۔

یہاں حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی رحمہ اللہ کا ایک بیان نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو مدرسوں کی حقیقت و اصلیت اور اسی کے ساتھ ان کے کام و طریق پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے،وہ فرماتے ہیں:

''میں مدرسے کو پڑھنے پڑھانے اور پڑھا لکھا انسان بنانے کا کارخانہ نہیں سمجھتا، میں مدرسے کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے تیار نہیں ہوں ، میں اس سطح پر آنے کو تیار نہیں ہوں کہ مدرسہ اسی طریقے سے پڑھنا لکھنا سکھانے یا یوں کہنا چاہیے کہ پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کا ایک مرکز ہے جیسے کہ دوسرے اسکول اور کالج ہیں ، میں اس کو مدرسے کے لیے ازالۂ حیثیت عرفی کے

مرادف سمجھتا ہوں، یعنی اگر میں مدرسہ کا وکیل ہوں یا میں خود مدرسہ بن جاؤں، تو میں اس پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کرسکتا ہوں، اگر کوئی مدرسے کو صرف اتنا حق دینے اور مدرسے کو صرف اتنا ماننے کے لیے تیار ہے کہ ”صاحب! جیسے پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کے لیے بہت سے کارخانے ہیں، بہت سے مرکز ہیں، کوئی اسکول کہلاتے ہیں، کوئی کالج کہلاتے ہیں، ان کے مختلف معیار اور مختلف سطحیں ہیں، اسی طریقے سے مدرسہ بھی عربی زبان یا عربی فنون، فقہ اور دینیات، تفسیر یا حدیث سکھانے کا ایک مرکز یا کارخانہ ہے۔

میں مدرسہ کو نائبین رسول و خلافت الٰہی کا فرض انجام دینے والے اور انسانیت کو ہدایت کا پیغام دینے والے اور انسانیت کو اپنا تحفظ و بقا کا راستہ دکھانے والے افراد پیدا کرنے والوں کا ایک مرکز سمجھتا ہوں، میں مدرسے کو آدم گری اور مردم سازی کا ایک کارخانہ سمجھتا ہوں۔“

(بحوالہ میر کارواں: ۱۷۲)

الغرض دینی مدارس عام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح نہیں ہیں کہ محض کچھ لکھنے پڑھنے کی قابلیت پیدا کردی جائے؛ بل کہ ان کا مقصد اس سے بہت اونچا ہے جیسا کہ ملاحظہ کیا گیا، ورنہ تربیت کے بغیر محض تعلیم تو نقصان دہ ہے، اس سلسلے میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے چند ارشادات بھی سننے کے قابل ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: ”اگر کتابی علم کامل ہو اور تربیت نہ ہو، تو چالاکی اور دھوکہ دہی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، علم بدون تربیت مورث عیاری ہے، نرے پڑھنے پڑھانے سے کیا ہوتا ہے، نرا علم شیطان اور بلعام باعور کا سا ہے، درخت خودرو کہیں ٹھیک نہیں ہوتا، ناہموار اور بعض اوقات بدمزہ رہتا ہے، جب تک باغباں درست نہ کرے کاٹ چھانٹ نہ کرے قلم نہ لگاوے، ایسے ہی وہ شخص جو محض کتابوں کے پڑھ لینے کو کافی سمجھ بیٹھے، اس کی مثال بعینہ درختِ خودرو کی سی ہے جب تک اسے کوئی مربی درست نہ کرے، تب تک ٹھیک نہیں ہوتا؛ بل کہ بد دین اور بدعقائد یا بد

اخلاق ہوجاتا ہے۔

(طریق النجاۃ ومقالات حکمت: ۴۰۷)

بہر حال یہ معلوم ہوا کہ مدارس میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا خصوصی اہتمام ضروری ہے ،اس سلسلے میں جن باتوں کی جانب توجہ دیئے جانے کی ضرورت ہے، ان میں سے بعض اہم امور کی نشاندہی پر اکتفا کرتا ہوں:

(۱) طلبہ کی تربیت کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھیں اخلاص نیت کی تعلیم دی جائے ،حدیث: ''**إنما الأعمال بالنيات**'' سب ہی کے پیش نظر ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کی ابتدا اسی حدیث سے فرمائی اور اس طرف رہنمائی کی کہ ہر طالب کو سب سے پہلے اپنی نیت کو درست کرلینا چاہیے۔ قاضی ابن جماعہ نے طالب علموں کے لیے اخلاص وللّٰہیت کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''طالب علم کے لیے علم کی طلب میں دوسری شرط خلوص نیت ہے؛ یعنی علم کے حاصل کرنے کا مقصد خداوند تعالی کی خوشنودی کی جستجو، اس کے حکموں پر عمل اور شریعت کو زندہ، دل کو روشن اور باطن کو اجاگر کرنا ہے۔''

(تذکرۃ السامع: ۴۷)

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ کے شاگرد علامہ زرنوجی رحمہ اللہ اپنی مشہور عالم کتاب ''**تعلیم المتعلم**'' میں لکھتے ہیں: ''طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحصیل علم سے رضائے الہی اور طلب آخرت، ازالۂ جہل اور احیائے دین کی نیت کرے''۔

(تعلیم المتعلم: ۱۴)

قاضی ابن جماعہ رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے، جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں: ''لوگو! اپنے علم سے صرف رضائے الہی حاصل کرنے کی نیت رکھو، میں جب کبھی کسی مجلس میں اس نیت سے بیٹھا کہ خاکسار اور متواضع رہوں گا، تو ہمیشہ اس مجلس سے سر بلند ہو کر اٹھا اور جب کبھی میری نیت

میں فطور آیا اور ہم چشموں میں سر بلند ہونے کا تصور دل میں آیا، تو مجھے اس مجلس سے رسوا ہوکر اٹھنا پڑا۔ (تذکرۃ السامع:٦٩)

سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں

”إنما يُطلبُ الحديثُ ليُتّقٰى به اللّٰه عز وجل ، فلذلک فضلٌ على غيره من العلوم، ولو لا ذلک كان كسائر الأشياء“

(حدیث اس لیے حاصل کی جاتی ہے؛ تاکہ اس کے ذریعے اللہ سے ڈرا جائے اور اسی وجہ سے اس کو دیگر علوم پر فضیلت ہے، اگر یہ بات نہ ہو، تو وہ اور چیزوں کی طرح ایک چیز ہے۔)

(جامع بیان العلم:۱/۲۳۴)

اور حضرت حماد ابن سلمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”من طلب الحديث لغير اللّٰه مُكِرَ به“

(جو غیر اللہ کے لیے حدیث کا علم حاصل کرے، اس کے ساتھ مکر کیا جاتا ہے؛ یعنی اللہ کی جانب سے اس کو ڈھیل دی جاتی ہے۔)

(جامع بیان العلم:۱/۲۳۴)

اور ابراھیم تیمی فرماتے ہیں

”من طلب العلم للّٰه عز وجل أعطاه اللّٰه منه ما يكفيه“

(جو اللہ کے لیے علم حاصل کرتا ہے، اللہ تعالی اس کو اس میں سے وہ عطا کرتے ہیں، جو اس کے لیے کافی ہو۔)

(جامع بیان العلم:۱/۲۳۴)

الغرض طلبا کی اصلاح و تربیت کا آغاز ہی اس بات سے ہونا چاہیے کہ وہ سب سے پہلے اپنی نیتوں کو خالص کریں اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے علم کی طلب و تحصیل میں لگیں۔

(۲) اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ طالب علم کو اس کی ذمے داری اور فرائض منصب سے آگاہ کیا جائے؛ تاکہ اپنے منصب کی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے وہ ابھی سے تیار ہو سکے۔

قاضی ابن جماعہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''طالب علموں کو چاہیے کہ وہ اپنی تعلیم کا مقصد اللہ کی مرضی کا حاصل کرنا، علم کی اشاعت کرنا، شریعت کو قائم و نافذ کرنا، حق کا اظہار و اعلان اور باطل کا ابطال و انکار قرار دیں۔

(تذکرۃ السامع: ۴۸)

مدارس کے بہت سے طلبا کو ان کا مقصد حیات و منشائے تعلیم کا کوئی علم نہیں ہوتا، اور وہ بس یوں ہی پڑھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو اس کام کے لیے تیار نہیں کر پاتے، جو ان کا نصب العین اور ان کی ذمے داری ہے۔ اس لیے وقتاً فوقتاً اس کا تذکرہ اور اس کے افہام و تفہیم کا سلسلہ رہنا چاہیے۔

(۳) طلبہ کی تربیت کا بہت ہی اہم پہلو ان کے ظاہر و باطن کی اصلاح و نگرانی سے متعلق ہے؛ کیوں کہ یہی مقصود بالعلم ہے، اگر یہ نہ ہو، تو علم کا کوئی فائدہ ہی نہیں، اسی لیے سلف صالحین نے اس سلسلے میں بڑی توجہ فرمائی ہے، حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الإلماع إلی معرفة أصول الروایة والسماع'' میں اپنی سند سے حضرت امام زہری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل فرمایا:

''إن هذا العلم أدب اللّٰه الذي أدّب به نبيَّه عليه السلام وأدَّب به نبيُّه أمتَه ''

p: یہ علم اللہ کی طرف سے ایک ادب ہے، جس کے ذریعے اللہ نے اپنے نبی کو ادب سکھایا اور نبی علیہ السلام نے اپنی امت کو ادب سکھایا۔

(الإلماع: ۲۱۳/۱)

حضرت ابو مرزوق رحمہ اللہ اپنے صاحبزادے سے فرماتے ہیں: ''بیٹا! حصول علم

کے ساتھ صحبتِ علما وفقہا اختیار کر، ان سے تعلیم حاصل کر، تہذیب اور ادب سیکھ، یہ میرے نزدیک زیادہ باتیں کرنے سے بہتر ہے۔ (تذکرۃ السامع:۲)

ابن سیرین رحمہ اللہ اپنے اسلاف اور اساتذہ اور مشائخ کا طریق ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ لوگ جیسے علم حاصل کرتے تھے، ویسے ہی سیرت اور اخلاق بھی حاصل کرتے تھے۔ بعض بزرگوں کا قول ہے ''تہذیب اور ادب کا ایک باب پڑھنا علم کے ستر بابوں کے پڑھنے سے افضل ہے۔ اور حضرت مخلد بن حسین کا ارشاد ہے کہ'' ہم لوگ حدیثیں زیادہ حاصل کرنے کے بجائے حسن ادب حاصل کرنے کے زیادہ خواہشمند تھے''۔

(تذکرۃ السامع:۱۲-۱۴)

آج عام طور پر اہل مدارس نے اس پہلو کو اس طرح نظر انداز کر دیا ہے کہ گویا یہ کوئی غیر ضروری اور فضول کام ہے؛ بل کہ اکثریت کا حال یہ ہے کہ صرف سبق پڑھا دینے کے سوا اپنی کوئی ذمے داری ہی نہیں سمجھتے کہ طلبا تعلیم کے مطابق اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے کی عملی مشق بھی کرتے ہیں یا نہیں؛ بل کہ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض مدارس کے اساتذہ بھی بد عملی و بداخلاقی کا شکار ہوتے ہیں، وہ بھلا کہاں اس کی طرف توجہ دیں گے؟ لہٰذا ضروری ہے کہ اہل مدارس اس پہلو سے بھی غور کریں اور طلبا کو علمی اعتبار سے بھی تیار کریں اور عملی و اخلاقی اعتبار سے بھی تیار کریں۔

اس لحاظ سے جن باتوں کی طرف توجہ دینا چاہیے، ان میں سے بعض ظاہر سے متعلق ہیں اور بعض باطن کے متعلق ہیں، ظاہر سے متعلق اہم امور یہ ہیں:

(۱) لباس اور وضع قطع

پہلی بات یہ ہے کہ طلبا کے لباس اور وضع قطع کی خوب نگرانی رکھی جائے۔ بعض مدارس میں اس جانب کوئی توجہ نہیں دی جاتی؛ بل کہ اس کو فضول سمجھا جاتا ہے اور اس سلسلے میں طلبا کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہاں کے طلبا ہر قسم کا لباس پہنتے ہیں اور

ڈاڑھیاں کٹاتے ہیں، ٹخنے سے نیچے پاجامہ پہنتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے عادی ہوتے ہوتے وہ ان حرام کاموں کو جائز بھی سمجھنے لگتے ہیں؛ کیوں کہ ان کو کسی نے ان پر تنبیہ نہیں کی اور پھر اسی وضع قطع کے ساتھ جب عوام میں جاتے اور کہیں خدمت کرتے ہیں، تو عوام ان پر نکیر کرتے ہیں اور یہ اپنی شان باقی رکھنے کے لیے تاویل سے یا غلط فتوے سے کام لیتے ہیں ؛لہٰذا شرعی لباس اور شرعی وضع قطع کا ان کو پابند بنانے کے لیے نگرانی ضروری ہے۔

(۲) صفائی وسلیقہ مندی کی تربیت:

اسی طرح ایک بات یہ ہے کہ طلبا کی تربیت کے لیے ان کی ظاہر کی صفائی وستھرائی کا اہتمام کرایا جائے۔ اسلام میں اس کی اہمیت کا سبھی کو علم ہے اور حدیث: ”**الطهور شطر الإيمان**“ (طہارت آدھا ایمان ہے) کس سے پوشیدہ ہے؟ مگر افسوس یہ ہے کہ اس سلسلے میں اسلام کو ماننے والوں میں سب سے زیادہ کمی پائی جاتی ہے، اور پھر اہل ایمان میں سے بھی عموماً اہل مدارس میں اس کا ظہور اور زیادہ ہے، جو انتہائی تشویش ناک بات ہے، اور طلبا اس سلسلے میں عام طور پر سستی وغفلت کا شکار ہوتے ہیں اور بسا اوقات اسکولوں کے لوگ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس صورت حال سے علم واہل علم؛ بل کہ کبھی اسلام ہی سے بدظنی کا شکار ہوجاتا ہے؛ لہٰذا بہت ہی ضروری ہے کہ طلبا کو اس کا مکلّف بنایا جائے کہ وہ روزانہ خود اپنی اور اپنی رہائش اور متعلقہ چیزوں کی صفائی کا خوب اہتمام کریں اور اس کے لیے استاذ مقرر کیا جائے، جو ان کی اس سلسلے میں نگرانی کرے، بالخصوص کمسن طلبا کے لیے اس کی نگرانی کا بہت زیادہ اہتمام ہونا چاہیے، مثلاً یہ کہ ان کے رہائش کمرے کی صفائی خود ان ہی سے کھڑے ہوکر کرائی جائے اور ان کے کپڑوں پر نظر کی جائے کہ صاف ہیں یا نہیں، ان کے ناخنوں اور بالوں کی صفائی پر نظر رکھی جائے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ”نظافت مطلوب ہے، اس کی ترغیب دی گئی ہے ،ارشاد فرمایا کہ: ”**نَظِّفُوا أَفْنِيَتَكُمْ ، وَلَا تَشَبَّهُوا بِالْيَهُودِ**“ کہ اپنے فنائے دار کو

صاف رکھو اور اس کو میلا کچیلا رکھ کر یہود جیسے نہ بنو، جب فنائے دار تک کی نظافت مطلوب ہے، تو خود دار اور حجرہ اور لباس و بدن کے صاف کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا، اب طالب علموں کی یہ حالت ہے کہ چاہے دو بالشت کوڑا ان کے حجرہ میں ہو جائے؛ لیکن یہ کبھی بھی صاف نہ کریں گے۔ (دعوات عبدیت: ۳۱/۳۲)

اس سلسلے میں حضرت اقدس مرشدنا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ کا ایک عجیب معمول دیکھا، وہ یہ کہ آپ جب کسی مدرسے میں تشریف لے جاتے اور اس کا معائنہ فرماتے، تو اولاً وہاں کے استنجا خانے دیکھتے اور فرماتے کہ اگر استنجا خانوں کی صفائی کا اہتمام ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اور جگہوں کا زیادہ اہتمام ہوگا، بندے کو متعدد مواقع پر اس کا موقعہ ملا کہ حضرت والا رحمہ اللہ کے ساتھ بعض مدارس کی زیارت کروں اور اس وقت حضرت کا یہ معمول دیکھا اور حضرت سے یہ بات سنی۔

اسی طرح یہ بھی اہم ہے کہ انہیں سلیقہ سکھایا جائے، اٹھنے، بیٹھنے، بولنے، چلنے پھرنے، نیز کسی سے بات چیت و ملاقات، کسی کو کچھ پیش کرنے وغیرہ سے متعلق سلیقہ کی تعلیم بہت ضروری ہے، عام طور پر اس میں بھی طلبا کوتاہ ہوتے ہیں اور تربیت نہ ہونے سے اس میں مزید کوتاہی پیدا ہو جاتی ہے؛ لہٰذا اس کے لیے سبھی اساتذہ کو محنت کرنی چاہیے اور اس کے علاوہ مقرر نگراں کو مستقل ذمے داری بھی دینی چاہیے کہ وہ روزانہ طلبا کے کمروں اور متعلقہ اشیا پر ایک نظر ڈالے اور ان کو ترتیب و سلیقہ کے ساتھ رکھنے کی ہدایت دے؛ تاکہ ان کو اسی کی عادت ہو جائے، ورنہ اس کے بغیر عالم ہو جانے کے باوجود بد سلیقہ لوگ تیار ہوں گے۔

(۳) سنن نبویہ اور اسلامی آداب کی تربیت

اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ طلبا کو سنتوں اور اسلامی آداب کا خوگر بنایا جائے، کھانے پینے سونے جاگنے، مسجد جانے آنے وغیرہ کی جو سنتیں اور آداب اور ادعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں اساتذہ اور نگراں حضرات کے ذریعے اس کی عملی مشق بھی کرائی جائے اور اس پر

بار بار ان کو متنبہ بھی کیا جائے، ورنہ یہ باتیں صرف زبان پر تو ہوں گی؛ مگر عمل میں نہیں آئیں گی؛ چناں چہ بہت جگہ ان سنن وآداب کو یاد کرانے کے باوجود عملی تربیت سے تغافل برتا جاتا ہے، جس کی وجہ سے طلبا کے ذہنوں میں ان سنن وآداب کی کوئی اہمیت ہی نہیں پیدا ہوتی، اس لیے وہ ان کو یاد کر کے سنا بھی دیتے ہیں؛ مگر اس کے مطابق ان کا عمل نہیں ہوتا، تو آخر ان سنن وآداب کو پڑھانے کا کیا فائدہ ہوا؟

اور باطن سے متعلق اہم امور یہ ہیں:

(۱) تقوی وطہارت

ایک تو یہ کہ طالب علم کو تقوی وطہارت کی زندگی پر ابھارا جائے اور اس کی ضرورت و اہمیت اس کے سامنے بار بار واضح کی جائے، اوپر حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کا یہ ارشاد نقل کر آیا ہوں کہ ’’حدیث اس لیے حاصل کی جاتی ہے؛ تاکہ اس کے ذریعے اللہ سے ڈرا جائے اور اسی وجہ سے اس کو دیگر علوم پر فضیلت ہے، اگر یہ بات نہ ہو، تو وہ اور چیزوں کی طرح ایک چیز ہے۔

لہٰذا اگر تقوی مطلوب نہ ہو، تو یہ علم بھی دینوی علم کی طرح ایک علم ہوگا اور اس کے طالب کو وہ فضیلت نہ ملے گی، جو اس علم کی بیان کی گئی ہے؛ اسی لیے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’ویل لمن لا یعلم ولا یعمل مرةً ، وویل لمن یعلم ولا یعمل سبعَ مرات‘‘ (جامع بیان العلم: ۶/۲)

(جس نے نہ علم حاصل کیا اور نہ عمل کیا، اس کے لیے ایک مرتبہ خرابی ہے اور جس نے علم تو حاصل کیا؛ مگر عمل نہیں کیا، اس کے لیے سات مرتبہ خرابی ہے۔)

اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

”إنما العلم ليتّقىَ اللّٰهَ به، و يَعملَ به لآخرته، و يصرفَ عن نفسه سوءَ الدنيا و الآخرة، و إلا فالعالم كالجاهل إذا لم يتقِ اللّٰهَ بعلمِهٖ“

(علم تو بس اس لیے ہے کہ اس کے ذریعے اللہ سے ڈرے اور اپنی آخرت کے لیے عمل کرے اور دنیا اور آخرت کی برائی دور کرے، ورنہ عالم جاہل کی طرح ہے، اگر وہ اپنے علم سے اللہ سے نہ ڈرے۔)

(تاریخ بغداد:۲۱۳/۴)

(۲)علم پر عمل

دوسری اہم چیز علم پر عمل کے لیے تیار کرنا ہے؛ کیوں کہ علم کی غرض وغایت ہی عمل ہے ،اسی لیے بعض صحابہ سے مروی ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کی ایک سورت ”سورۃ البقرۃ“ بارہ سال میں یا چودہ سال میں مکمل کی، جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ بارہ سال میں ”سورۃ البقرہ“ ختم کی اور ختم پر ایک اونٹ ذبح کیا۔

(تفسیر القرطبی:۴۰/۱)

اور حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس دس آیات پڑھاتے تھے اور دیگر آیات اس وقت تک نہیں پڑھاتے تھے، جب تک کہ ان دس آیات میں جو عمل ہے، اس کو نہ سیکھ لیتے ، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ آپ ہم کو قرآن اور اس پر عمل دونوں کی تعلیم دیتے تھے۔

(قرطبی:۳۹/۱)

بعض حکما نے فرمایا:

”لو لا العقل لم يكن علم ، ولولا العلم لم يكن عمل ، ولأن أدع الحقَّ جهلاً به خيرٌ من أدعه زهداً فيه“

اگر عقل نہ ہوتی ،تو علم نہ ہوتا اور اگر علم نہ ہوتا ،تو عمل نہ ہوتا اور میں حق کو لاعلمی کی وجہ سے چھوڑ دوں یہ بہتر ہے، اس سے کہ میں حق کو اس سے لاپروائی کی وجہ سے ترک کردوں)

(جامع بیان العلم:۲/۶)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''العالم الذي وافق علمه عمله، ومن خالف علمه عمله فذلک روایة حدیث سمع شیئاً فقاله''

(عالم وہ ہے، جس کا عمل اس کے علم کے موافق ہو اور جس کا عمل اس کے علم کے خلاف ہو، تو وہ بس حدیث کی روایت ہے، کہ اس نے سنا اور کہہ دیا۔)

(جامع بیان العلم:۲/۹)

حضرت عبدالملک بن ادریس رحمہ اللہ کے اس سلسلے میں یہ اشعار بڑے عمدہ ہیں:

والعلمُ لیس بنافعٍ أربابَهُ ما لم یُفِدْ عملاً وحسنَ تبصُّرٖ

علم اہل علم کو اس وقت تک نفع نہیں دیتا، جب تک کہ وہ عمل اور عمدہ بصیرت کا فائدہ نہ دے۔

سِیّانِ عندی علمُ منْ لم یستفد عملاً به وصلاةُ من لم یطهر

میرے نزدیک اس کا علم، جس نے علم سے عمل کا فائدہ حاصل نہیں کیا اور بے وضو آدمی کی نماز دونوں برابر ہیں۔

امام ابن القاسم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے امام مالک سے سنا ہے:

''لیس العلم بکثرة الروایة ،إنما العلم نور یضعه اللّٰهُ في القلوب''

(علم کثرت روایت کا نام نہیں ہے، علم تو ایک نور ہے، جو اللہ تعالی دلوں میں رکھتے ہیں۔)

نیز امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

" الحكمة والعلم نور يهدي به الله من يشاء وليس بكثرة المسائل "

(علم وحکمت ایک نور ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالی جسے چاہتے ہیں، ہدایت دیتے ہیں اور وہ بہت سارے مسائل کا نام نہیں ہے۔

(الجامع لبیان العلم: ۳۱/۲، الالماع: ۲۱۷/۱)

حضرت عبداللہ بن عون رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"كان الفقهاء يتواصون بثلاث و يكتب بعضهم إلى بعض: أنه من أصلح سريرته، أصلح الله علانيته، ومن أصلح ما بينه و بين الله، أصلح الله ما بينه و بين الناس، ومن عمل للآخرة، كفاه الله الدنيا."

(فقہائے کرام تین وصیتیں فرماتے تھے اور ان میں سے بعض بعض کو لکھتے تھے: ایک یہ کہ جس نے اپنی خلوت کا معاملہ درست کر لیا، اللہ تعالی اس کی جلوت کا معاملہ درست فرما دیتے ہیں، دوسری یہ کہ جس نے اپنے اور اللہ کے درمیان معاملہ کو درست کر لیا، اللہ تعالی اس کے اور لوگوں کے درمیان معاملہ کو درست فرما دیتے ہیں اور تیسری یہ کہ جس نے آخرت کے لیے عمل کیا، اللہ اس کی دنیا کے لیے کافی ہو جاتے ہیں)

(الإلماع: ۲۲۲/۱)

الغرض طلباء کو علم کے ساتھ عمل کی طرف توجہ دلانا اور اس کی نگرانی کرتے رہنا ضروری ہے؛ تاکہ وہ اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عملی زندگی میں علم کو بروئے کار لانے والے بن سکیں۔

نیز طلبائے کرام کو بتایا جائے کہ بد عمل اور بے عمل عالم کے لیے کس قدر وعید شدید

وارد ہوئی ہے، مثلاً یہ حدیث کس قدر ہم کو چونکا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً مِمَّا يُبْتَغِي بِهِ وَجْهَ اللّٰهِ لا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَة»

(جو شخص اس علم میں سے جو صرف اللہ کی رضا کے لیے حاصل کیا جاتا ہے ،اس کو اس لیے حاصل کرتا ہے کہ اس سے دنیا کا سامان کمائے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو نہیں پائے گا۔

(ابوداؤد:۳٦٦٤،ابن ماجہ: ۲۵۲، احمد: ۸۴۳۸، صحیح ابن حبان: ۱/۲۷۹، مستدرک حاکم:۱/۱٦۰)

اور یہ حدیث کس قدر لائق توجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار صحابہ سے فرمایا:

« تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنَ جُبِّ الْحُزْن »

(تم لوگ جُب الحزن یعنی غم کے کنویں سے اللہ کی پناہ مانگو) صحابہ نے عرض کیا:

« يَا رَسُولَ اللّٰهِ ! وَمَا جُبُّ الْحُزْنِ؟ »

(یارسول اللہ! یہ غم کا کنواں کیا ہے)

آپ نے فرمایا:

«وَادٍ فِي جَهَنَّمَ تَتَعَوَّذُ جَهَنَّمُ فِي كُلِّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ»

(یہ جہنم میں ایک وادی ہے، جس سے خود جہنم بھی روزانہ سو دفعہ پناہ مانگتی ہے)

صحابہ رضی اللہ عنہما نے پوچھا کہ یا رسول اللہ !اس میں کون لوگ داخل ہوں گے؟

آپ نے فرمایا:

«القُرَّاء المُراءُ بأعمالهم » (ترمذی:۲۳۸۳)

(وہ قراء جو اپنے اعمال سے دکھاوا کریں گے۔)

اوراسی حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ اس وادی سے جہنم چار سو مرتبہ روازانہ پناہ مانگتی ہے۔ (ابن ماجہ:۲۵۶،معجم اوسط طبرانی:۲۶۱/۳)

(۳) علمی وقار وشان

ایک بات یہ ہے کہ طلبا کے اندر علمی وقار وشان پیدا کی جائے،اس سے مراد بڑائی وتکبر نہیں؛بل کہ چھچھورے پن سے حفاظت اوران خصوصیات کو پیدا کرنے کی کوشش ہے، جو علمی وقار کو بلند کرتی ہیں،وہ کیا چیزیں ہیں؟ ان کو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح بیان فرمایا:

”ینبغي لقارىء القرآن أن یعرف بلیله إذا الناس نائمون، و بنهاره إذا الناس مستیقضون، و ببکائه إذا الناس یضحکون، و بصمته إذا الناس یخوضون، و بخضوعه إذا الناس یختالون، و بحزنه إذا الناس یفرحون“ (تفسیر القرطبی:۲۱/۱)

(قاری یعنی عالم قرآن کے لیے شایان شان بات یہ ہے کہ وہ اس کی رات سے پہچانا جائے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں،اوراس کے دن سے بھی وہ جانا جائے، جب کہ لوگ بیدار ہوں اور اس کے رونے سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ہنس رہے ہوں اوراپنی خاموشی سے پہچانا جائے،جب کہ لوگ گپیاں مار رہے ہوں اوراپنی تواضع وخاکساری سے پہچانا جائے،جب کہ لوگ ڈینگیں مار رہے ہوں اور اپنے غم سے جانا جائے، جب کہ لوگ خوشیاں منارہے ہوں۔)

اگر طلباء عوام الناس ہی کی طرح گپیاں ماریں،ٹھٹا مار کر ہنستے بیٹھیں،خوف وخشیت کا کوئی اثر ان کے اخلاق واعمال واحوال وآثار سے ظاہر نہ ہو،تو یہ کیا علم ہےاورکیا علمی وقار؟ جیسا کہ آج بہت سے علمانے اس وقار کو چھوڑکر

اورعوامی بل کہ جاہلی طریقے کو اختیار کر کے اللہ کی نظر میں بھی اور عوام الناس میں بھی اپنا وقار ختم کرلیا ہے؛ لہذا ان سب امور پر طلبا کرام کی فہمائش وتنبیہ ہوتی رہنی چاہیے۔

☆☆☆

مسلمانِ ہند کا سیاسی مستقبل
اہل دانش کی خدمات میں ایک تجویز

حالیہ بی بی ایم پی انتخابات کی مہم حسب سابق اپنی سیاسی سرگرمیوں اور سابقوں اور لاحقوں کے ساتھ گزر چکی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی وہی سب کچھ دیکھنے کو ملا، جو پہلے سے اور ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ قانون واصول کی پاسبانی کے بجائے ان کی پامالی، دنیوی عہدے ومنصب کی چوکھٹ پر شرافت واخلاق کی قربانی، مختلف پارٹیوں کی ایک دوسرے پر الزام تراشی، عوام کے سامنے بلند بانگ دعوے، ووٹ کے لیے رشوت کا لین دین، ووٹوں کی خرید وفروخت اور اس کے لیے قوم وملت میں جوڑ توڑ، وغیرہ وغیرہ بہت سے امور جو موجودہ جمہوری نظام میں انتخابات کے لوازمات میں شامل ہو گئے ہیں۔

ان سب کے ساتھ یہ بات بھی اسی طرح دہرائی گئی، جس طرح سابق میں کہ متعدد سیکولرزم کی مدعی پارٹیوں نے مختلف وارڈس میں اپنے نمائندے کے طور پر ''مسلم امیدوار'' کو کھڑا کیا اور ان امیدواروں نے بلا کھٹک وبلا جھجک اپنی اپنی پارٹی کی جانب سے دیے گئے ٹکٹ پر اپنی امیدواری کا پرچار کیا اور سچے یا جھوٹے وعدوں اور بلند بانگ دعووں سے عوام کو متاثر یا مرعوب کرتے گئے۔

اور اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ باعثِ تشویش پہلو یہ ہے کہ ایک ہی وارڈ میں کئی کئی مسلم امیدوار انتخابات لڑ رہے تھے، بعض بعض علاقوں میں چار چار، پانچ پانچ یا اس سے بھی زائد مسلم امیدوار تھے، جس کا نتیجہ بالکل واضح ہے کہ ان میں آپسی رسہ کشی ومقابلہ آرائی

کی وجہ سے مسلم ووٹ تقسیم ہوکر ان میں سے کسی کے لیے بھی کامیابی و فتح مندی مشکوک؛ بل کہ محض ایک خواب وخیال بن کر رہ جائے اور اس کے بالمقابل فرقہ پرست اور فسطائیت زدہ پارٹیوں کے امیدوار اس ہار جیت کے کھیل میں ان سیکولر امیدواروں پر بازی لے جائیں، جیسا کہ اس سے پہلے بھی بارہا یہ تماشا دیکھنے کو ملا ہے اور امت برابر اپنے ناکردہ گناہ کی سزا بھگتتی چلی آرہی ہے۔

یہاں ملت کے اہل دانش و اہل حل وعقد حضرات؛ خواہ وہ طبقۂ علما میں سے ہوں یا دنیوی تعلیم کے ماہرین میں سے ہوں یا میدان سیاست کے قائدین میں سے ہونے کے لیے متعدد امور غور وفکر اور سنجیدہ غور وفکر کے متقاضی ہیں:

(۱) انتخابات کے موسم میں ہر مسلم امیدوار عوام کے سامنے اپنی پارٹی کی تعریف اور دوسری پارٹی کی تنقیص کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کل اگر ایک پارٹی کی جانب سے ٹکٹ لیکر امیدوار بنا تھا، تو وہ اس پارٹی کی تعریف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے؛ لیکن اگر کسی وجہ سے وہ اس پارٹی کو چھوڑ دیتا ہے اور کسی دوسری پارٹی میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے، تو دوسرے ہی دن سے اس کا طرز عمل بدل جاتا ہے اور اب پہلی پارٹی کی تنقیص شروع کر دیتا ہے اور نئی پارٹی کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔

اس صورتِ حال کے بارے میں اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر مسلم امیدوار کسی نہ کسی پارٹی کی تعریف کرتے ہوئے، اس کے حق میں ووٹ دینے کی تلقین کرتا ہے تو آخر بھولی بھالی عوام کس کے حق میں ووٹ دینے کا فیصلہ کرے گی؟ اگر کچھ لوگ ایک کو اور دوسرے کسی اور کو ووٹ دیتے ہیں، تو نتیجہ وہی ہوگا اور ہے کہ فرقہ پرستوں کے لیے راہ ہموار ہوگی اور یہ سارے امیدوار اپنی امیدواری پر پانی پھرتا دیکھ لیں گے۔ تو کیا یہ مسلم سیاست داں اپنی سیاست کا کھیل کھیلنے کے لیے ملک وملت کو اسی طرح فرقہ پرستوں کے حوالے کرتے رہیں گے؟ اور امت کیا ہمیشہ اسی صورتِ حال کا تماشا کرتی رہے گی؟

(۲) یہ سیاست داں ہمیشہ ملک وملت کی بھلائی کا دعوی ونعرہ لے کر اٹھتے ہیں اور عوام

الناس سے ہر ایک پارٹی کا نمائندہ وہی کہتا ہے، جو دوسری پارٹی کا نمائندہ کہتا ہے۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ جب ایک ہی وارڈ میں متعدد مسلمان امیدوار یہ دعوی ونعرہ لے کر اٹھیں گے، کہ وہ ملک وملت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور بھلائی وخیر وخوبی کے کاموں کو بہ طریق احسن انجام دینا چاہتے ہیں، تو آخر عوام الناس ایک کو سچا اور دوسرے کو جھوٹا بلا وجہ و بلا دلیل کیوں سمجھ لے؟ لہذا عوام میں سے کوئی کسی کو کوئی اور کسی کو ووٹ دینے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر وہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلم ووٹ مختلف مسلم امیدواروں میں بٹ کر اپنی حیثیت و وزن کھو بیٹھتے ہیں اور فرقہ پرستوں کے لیے ایک زرین موقعہ ہاتھ آتا ہے، کہ وہ اپنی پارٹی کو کامیابی کی منزل تک پہنچادیں۔

(۳) ایک ہی وارڈ میں متعدد مسلم امیدواروں کا انتخابات لڑنا ملک کے حق میں کوئی نیک فالی ہے، نہ ملت کے حق میں؛ بل کہ اس لحاظ سے یہ ملک وملت کے حق میں سخت خطرناک اقدام ہے کہ اس کا پورا پورا فائدہ فرقہ پرست پارٹیوں کو ملے گا۔ اور یہ بات محض فرضی وخیالی نہیں؛ بل کہ بار بار کے تجربات ومشاہدات نے اس کو یقینی بنادیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے مسلم سیاست داں انتخابات کے وقت اس نتیجے سے بے خبری وغفلت شعاری کا ثبوت دیتے ہوئے جو امیدواری کے لیے جدو جہد کرتے اور امیدواری کی ٹکٹیں وصول کرتے ہیں، اس کو کیا ملک وملت سے وفاداری کی کسی قسم وشکل میں شمار کیا جاسکتا ہے؟ یا اسے ملک وملت سے بے وفائی اور مفاد پرستی کا عنوان دینا مناسب ہے؟

یہیں سے ان سیاسی بازیگروں کے اس دعوے ونعرے کی قلعی کھل جاتی ہے کہ وہ قوم و ملت کی خدمت اور سماج کی بھلائی کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ نعرہ محض دھوکہ بازی اور اس کی آڑ میں مفاد پرستی نہیں ہے؟ اگر یہ لوگ ملک وملت کی وفاداری میں مخلص اور اپنے اس دعوے ونعرے میں سچے ہوتے، تو ایسی راہ اور وہ طرز عمل کیوں اختیار کرتے، جو ملک و ملت کے لیے خطرات پیدا کرنے والا اور فرقہ پرستوں کے لیے راہیں ہموار کرنے والا ہے؟

حضرات! یہ صورت حال ملک میں بار بار دہرائی گئی ہے اوراس کے نتیجے میں اس وقت ملک فرقہ پرستوں کے قبضے و شکنجے میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے اوران فرقہ پرستوں کی جانب سے اب یہ کوششیں وسازشیں بھی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں کہ وہ یہاں مسلم ووٹ کو بالکل بے حیثیت بنا دینا اور مسلمانوں کو ووٹ کے حق سے محروم کر دینا اوراس سے بھی بڑھ کر ملک کو جمہوری سے بڑھ کر ہندو ملک بنا دینا چاہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ حالت وصورت کب تک قائم رہے گی اور ملک وملت کے مفادات کو کب تک پامال کرتی رہے گی؟ اور کیا اس صورت حال میں کسی تبدیلی کا امکان بھی متصور ہے؟ ظاہر ہے کہ ہمیں اس پہلو سے بار بار غور کرنے کی اور پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے اور کسی اچھے و بار آور نتیجے تک پہنچنے کی کوشش لازم ہے۔

اس سلسلے میں احقر کی ایک تجویز اہل دانش کی خدمات میں پیش کرنے کی جرأت و جسارت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ہندوستان میں سیاسی امور کے متعلق مسلمانوں کے مسائل وحالات پر غور وخوض کے لیے ایک ایسی مجلس تشکیل دینا چاہیے، جو مختلف اسلامی مکاتب فکر کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور اُسے یہ حق حاصل ہو کہ وہ پوری بصیرت کے ساتھ یہ طے کرے کہ کس جگہ کس کو کس پارٹی کی جانب سے انتخابات میں کھڑا کرنا چاہیے اور وہ جس کو طے کر دے، وہی انتخابات میں حصہ لے اور مجلس تمام مسلمانوں سے اسی کے حق میں ووٹ دینے کی ایسی مہم چلائے کہ مسلمانوں کا ووٹ ایک جگہ جمع ہو اور بٹنے نہ پائے اور ساتھ ساتھ اس کی بھی کوشش کرے کہ اس کے مقابلے میں کوئی اور مسلمان کسی بھی پارٹی کی جانب سے انتخابات میں حصہ نہ لے اور اگر کوئی مفاد پرست حصہ لے، تو اس کو خود اس کا نتیجہ سمجھ میں آ جائے کہ اس کو کوئی مسلم ووٹ ملنے والا نہیں۔

اور ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس وقت مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سوا کوئی جماعت و تنظیم ایسی نہیں، جس میں تمام مکاتب فکر کے نمائندے شامل ہوں اور ملک کے مسلمان جس پر متفقہ طور پر اعتماد کرتے ہوں، اس لیے اگر اس کام کو مسلم پرسنل لاء بورڈ اپنے ہاتھ میں لے

اور ایسی کوئی مجلس یا باڈی تشکیل دیدے اور اس کی ذیلی کمیٹیاں ملک کے طول و عرض میں پھیلا دے اور وہ سب پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کام کو انجام دیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں ایک نہایت خوش آئند اقدام ہوگا اور نہایت مفید و بارآور نتائج کا حامل ہوگا۔

☆☆☆

دیہاتوں اور قریوں کی دینی پسماندگی
اہل علم واصحاب ثروت کے لیے لمحۂ فکریہ

دیہات اور قریہ جات کا حال جس طرح دنیوی لحاظ سے پسماندگی کا شکار رہتا ہے، اسی طرح دینی اعتبار سے بھی وہاں کا ماحول عموماً نہایت پسماندہ ہوتا ہے؛ بل کہ دنیوی ابتری کی بہ نسبت دینی ابتری زیادہ ہوتی ہے۔

وہاں کے لوگوں کو اسلام کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں، ایمان وعقیدہ کے لحاظ سے بھی وہ پستی کے شکار ہوتے ہیں اور اسلامی اعمال واخلاق کے لحاظ سے بھی پسماندگی میں مبتلا ہوتے ہیں، انھیں اللہ ورسول کی صحیح پہچان ہوتی ہے، نہ دینی اعمال وعبادات کی کوئی جانکاری، اس کے برخلاف غیر دینی عقائد واعمال کا ان میں چلن ہوتا ہے۔

یہاں تک کہ کئی جگہ دیہاتوں میں مسلمانوں کے گھروں میں ہنومان وغیرہ کے بت رکھے ہوئے ہیں اور بعض جگہ کے مسلمان بت خانوں اور مندروں میں اپنی حاجات و ضروریات کا حل تلاشنے کے لیے جاتے ہیں، ان بتوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں، جو ہندو قومیں کرتی ہیں، ان کو حاجت روا سمجھ کر ان سے مانگتے ہیں، پوجا کرتے ہیں یا ان کی خوشنودی پانے کی نیت سے ان کے لیے منتیں مانتے ہیں۔

بدعقیدگی کی ایک عجیب اور افسوس ناک حالت سنتے چلیے کہ چند دنوں قبل ہمارے جامعہ ”جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم“ کا ایک وفد دیہی علاقوں کے جائزے کے لئے گیا ہوا تھا، تو ایک گاؤں میں لوگوں نے وہاں کا حال یہ بتایا کہ یہاں کتے کی فاتحہ ہوتی ہے، جس کا طریقہ

یہ ہوتا ہے کہ کتے کو مسجد میں لاکر منبر پر بٹھاتے ہیں اور اس کے گلے میں ہار پہناتے ہیں اور کھانے پر فاتحہ پڑھ کر اولاً کتے کو کھلاتے ہیں اور اس کا بچا ہوا بہ طور تبرک لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

عقیدے کے لحاظ سے تو یہ صورت حال ہے، رہا اعمال وعبادات کا مسئلہ، تو اس کے بارے میں کیا کہا جائے، بہت سے دیہی علاقے تو ایسے ہیں، جہاں کے لوگ صرف جمعہ یا عیدین ہی کو جانتے ہیں، روزانہ پنج وقتہ نمازوں کو جانتے ہی نہیں، یا جانتے ہیں، تو بھی صرف وجمعہ وعیدین ہی پڑھتے ہیں۔

بہت سے دیہی علاقوں میں مساجد کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، دور دور تک وہاں اس کا تصور مشکل ہے اور بہت سی جگہیں ایسی ہیں، جہاں مساجد ہونے کے باوجود مساجد مقفل رہتی ہیں، وہاں کوئی امام ہے نہ مؤذن، اذان ہوتی ہے نہ نماز۔

دعوتی اسفار کے دوران ایسے علاقوں میں جانا آنا ہوتا رہتا ہے اور یہ صورتِ حال مشاہدے میں برابر آتی رہتی ہے، حتی کہ بعض جگہ دیکھنے میں آیا کہ مسجد ہے، مگر مقفل، کسی سے معلوم کیا کہ مسجد کی تالی کہاں ہے؟ تو بعض لوگوں نے کہا کہ فلاں صاحب کے پاس ہے اور وہ کہیں گئے ہوئے ہیں؛ اس لیے مسجد نہیں کھل سکتی اور بعض موقعوں پر ایسا ہوا کہ تالی تلاش کرتے کرتے آدھا گھنٹا ہو گیا؛ مگر مسجد کی تالی نہیں ملی یا بہت تاخیر سے دستیاب ہوئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ صرف جمعے میں نماز پڑھی جاتی ہے، باقی دنوں میں مسجد بند رہتی ہے۔

رہا مکتب یا مدرسے کا نظام، تو اس کا اکثر جگہوں میں کوئی وجود تک نہیں اور بعض جگہ ہے بھی، تو اس کا کوئی نظام نہیں، جس کی وجہ سے وہاں کے بچے اور بڑے، مرد وعورتیں سب دینی تعلیم سے بالکلیہ محروم رہتے ہیں۔

یہ سب تصویر کا ایک رخ ہے، جس سے دیہی علاقوں میں عقیدے وعمل کے باب میں جہالت وغفلت کا نقشہ سامنے آتا ہے، تصویر کا ایک دوسرا رخ یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں سے بعض علاقوں میں جب کچھ دینی شعور پیدا ہوا اور مسجد ومکتب کی ضرورت کا ان میں احساس

بیدار ہوا اور وہاں ان لوگوں نے کسی حد تک جد و جہد کر کے مسجد و مکتب قائم کر لیا، یا تو ان میں سے بعض جگہوں پر یہ رواج ہے کہ مسجد کی کمیٹی مسجد کے لیے جمع شدہ چندہ کی رقم سودی قرضے کے طور پر لوگوں کو دیتی ہے اور جو سود وصول ہوتا ہے، اس کو امام کی یا مؤذن یا مدرس کی تنخواہ میں دیتی ہے۔ گویا سود سے امام و مؤذن کی پرورش کی جاتی ہے۔ یہ کس قدر افسوس ناک صورتِ حال ہے، اس کا اندازہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔

بعض دیہاتوں میں مساجد پر قادیانی لوگوں کا قبضہ ہے، صرف اس لیے کہ دیہاتی لوگ امام و مؤذن وغیرہ کی تنخواہ نہیں دے سکتے اور قادیانیوں نے اپنا امام و مؤذن لا کر وہاں بلا تنخواہ رکھ دیا ہے اور وہ امام امامت بھی کرتا ہے اور ان کے بچوں کو پڑھا بھی لیتا ہے اور یہ دیہاتی لوگ اس کو بلا تنخواہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ برداشت کرتے ہیں؛ بل کہ اس سے بڑے خوش رہتے ہیں۔

حالاں کہ یہ امام و مدرس دراصل وہاں اپنی قادیانی تحریک لیکر پہنچتے ہیں اور وہاں کے بھولے بھالے لوگوں کو اپنے دام فریب میں گرفتار کرتے جاتے ہیں، حتی کہ بعض جگہ گاؤں کے گاؤں قادیانی ہو جاتے ہیں۔

الغرض دیہی علاقوں کے دینی حالات نہایت ابتری و پستی کا شکار ہیں، یہاں چند امور کی نشاندہی بطور مثال کی گئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کے پیدا ہونے میں کن عوامل و وجوہات کا دخل ہے اور یہ حالات کس بنیاد پر رونما ہو رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں مختلف عوامل و وجوہات کارفرما نظر آتے ہیں؛ مگر ان سب امور کا خلاصہ دو امور ہیں:

ایک یہ ہے کہ دیہی علاقوں کے لوگوں میں علم دین کے فقدان یا کمی کی وجہ سے انھیں خود اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ دینی لحاظ سے وہ اور ان کی نسلیں کس قدر ابتری و کمزوری کے شکار ہیں؟ اگر ان میں کم از کم اپنی اس کمزوری و ابتری کا احساس بھی ہوتا؛ تو شاید وہ اس کو دور کرنے کی جانب متوجہ ہوتے، جیسے کہ یہ لوگ عموماً اپنے دنیوی مسائل کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ تگ و دو کرتے رہتے ہیں اور اپنی دنیوی لحاظ سے ابتری و پسماندگی کو دور کرنے کی کسی نہ

کسی درجے میں فکر بھی کرتے ہیں؛ کیوں کہ ان کو خود اس کا احساس وشعور ہے کہ ہم دنیوی لحاظ سے پسماندہ ہیں اور ہمیں اس کو دور کرنا چاہیے؛ مگر چوں کہ ان میں دینی پسماندگی و کمزوری کا احساس وشعور تک نہیں ہے، اس لیے اس کو دور کرنے کی اور اس میں بہتری لانے کی کوئی جد و جہد و محنت دور دور تک نہیں کرتے۔ الغرض دینی شعور کے فقدان اور علم دین سے بعد و دوری کی وجہ سے دیہی علاقوں میں یہ صورتِ حال ہے۔

دوسری اہم وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے پاس اس ابتری و پسماندگی کو دور کرنے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے، ان کو حاصل کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی، مثلاً مسجد یا مدرسہ و مکتب قائم کرنا، مسجد میں امام یا مؤذن کا تقرر کرنا، مکتب یا مدرسے میں مدرس کا نظم کرنا، وغیرہ۔ نیز طالب علموں کے لیے کتابوں وغیرہ کی خریدی بھی ان لوگوں کے لیے ایک مسئلہ بنا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کی غربت و افلاس اس صورت حال کی دوسری اہم وجہ ہے۔

متعدد علاقوں میں ہم نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے کوئی امام اپنی مسجد کے لیے کیوں نہیں رکھا؟ مدرس مکتب کے لیے فراہم کیوں نہیں کیا؟ تو ان کا جواب یہ تھا کہ ہم ان لوگوں کو تنخواہ نہیں دے سکتے، ہمارے پاس اس کی طاقت نہیں ہے، بعض لوگوں نے بتایا کہ ہم نے ایک امام صاحب کو رکھا تھا؛ مگر وہ اس لیے چلے گئے کہ ان کی تنخواہ ہم نہیں دے سکے، بعض جگہ کے لوگوں نے بتایا کہ ایک امام صاحب چند ماہ تک رہے؛ مگر مسلسل کئی ماہ تک ان کی تنخواہ کا کوئی نظام نہیں بن سکا، اس لیے ہم نے خود ان کو کہہ دیا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ الغرض غربت و افلاس ایک بنیادی وجہ ہے، جس کی وجہ سے دیہی علاقوں میں یہ ابتری پائی جاتی ہے۔

ان دو بنیادی وجوہات سے دیہی علاقوں کے دینی حالات بہت ہی ناگفتہ بہ ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ (جیسا کہ اوپر بھی اشارہ دے چکا ہوں) یہ ہوتا ہے کہ ایسے علاقوں میں قادیانی گھس آتے ہیں اور امامت و مدرسی کے بہانے ان کو بے ایمان بنا دیتے ہیں۔ ان

لوگوں کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ وہ وہاں کے لوگوں کو کبھی تو دنیوی مفادات کا لالچ دیتے ہیں ،تو کبھی وہاں ان کے دینی رہنما بن کر جاتے ہیں اور مسجد کے لیے امام یا مکتب کے لیے مدرس فراہم کرتے ہیں اور وہاں کے لوگ اپنی مالی مجبوریوں کے پیش نظر اس کو نہ صرف یہ کہ قبول کر لیتے ہیں؛ بل کہ ان کے گرویدہ ہوجاتے ہیں اور شدہ شدہ ان کے نظریات بھی قبول کرتے جاتے ہیں۔

اسی طرح ان علاقوں میں عیسائی مشنریاں بھی اپنا کام بڑے پیمانے پر کرتی ہیں اور عوام الناس کے ایمان کو خراب کرتی ہیں۔ان کا بھی وہی طریقہ ہے کہ لوگوں کو روپے کا لالچ دے کر، ان کی ضروریات کی کفالت کر کے، ان کے کھانے پینے اور رہائش وغیرہ کے انتظامات کر کے،ان کے بچوں کی تعلیم کا نظام قائم کر کے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں ، یہاں تک کہ اسی سے بہت سے مسلمانوں کو عیسائی بنا جاتے ہیں یا کم از کم ان کو ایمان سے ہٹا دیتے ہیں۔

آمدم برسر مطلب:

دہی علاقوں کی اس دینی ابتری و پستی کے پیش نظر بڑی ضرورت ہے کہ ایک جانب اس سلسلے میں اہل علم و دین متوجہ ہوجائیں اور دوسری جانب اہل ثروت و دولت طبقہ بھی اپنی توجہات و خدمات پیش کرے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ، ان علاقوں میں اگر ایک جانب دین اور دینی علم کی کمی ہے تو دوسری جانب مال و اسباب کی بھی کمی ہے اور انہی دو وجوہات نے وہاں یہ صورت حال پیدا کی ہے؛ لہذا علاج بھی اس کا اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم ان وجوہات کو ختم کرنے کی کوشش کریں؛ لہذا وہاں علم کا سلسلہ جاری کریں اور اس کے لیے وہاں جن اسباب کی ضرورت ہے، ان کو فراہم کیا جائے ، امام فراہم کیا جائے ، مدرس فراہم کیا جائے ،مؤذن فراہم کیا جائے ، پڑھنے والوں کے لیے کتابیں و دیگر ضروریات فراہم کی جائیں۔

اگر دیہاتی لوگوں کے سامنے ایمان و عمل اور دین و شریعت کی اہمیت کا درس دیا جائے گا،

تو وہاں سوال یہی پیدا ہوگا کہ ان کی ضرورت تو ہے اور ان کی ضرورت سب کو مسلم بھی ہے ؛مگر اس ضرورت کو کیسے پوری کریں؟ اسباب کہاں سے لائیں ،اس کے لیے امام کی ،مؤذن کی ، مدرس کی ضرورت پڑے گی ،تو تنخواہ کہاں سے دیں گے؟

لہذا ان ہی سوالات کا عملی جواب دیتے ہوئے وہاں کام کرنے کی ضرورت ہے۔

احقر کا خیال ہے کہ دیہی علاقوں میں کام ان دونوں طبقات (اہل علم و اہل ثروت) کی مشترکہ توجہ و خدمت سے ہی ہوسکتا ہے، جیسا کہ خود شہروں میں بھی جو کام ہورہا ہے، وہ اسی طرح ہورہا ہے کہ ایک جانب اہل علم کی دینی و علمی جدوجہد کا سلسلہ جاری ہے، وہ مدارس و مکاتب قائم کرتے اور ان میں تعلیم و تربیت کا نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں،تو دوسری جانب سے اہل ثروت و عامۃ المسلمین کی مالی امداد و نصرت کا سلسلہ ان مدارس و مکاتب کو جاری ساری کرنے اور باقی رکھنے میں معین و مددگار بنتے ہیں۔اسی طرح دیہی علاقوں میں بھی ایک جانب اہل علم کی توجہ، ان لوگوں میں دینی شعور پیدا کرنے کی جانب ہونا چاہیے اور اس کے لیے دیہی علاقوں میں مساجد کے لیے امام، مکاتب کے لیے مدرس کی فراہمی کا کام انجام دیا جانا چاہیے اور اگر مسجد یا مکتب نہ ہو تو اس کا بھی نظام قائم کرنے کی جدوجہد ہونا لازم ہے۔ اور دوسری جانب اہل ثروت کی توجہ، ان کو ان کے دینی امور کی انجام دہی کے لیے اسباب فراہم کرنے کے لیے ہونا چاہیے ؛لہذا مسجد یا مکتب بنانے اور امام و مؤذن یا مدرس کی تنخواہوں کی فراہم کرنے کے لیے اپنے مال کا ایک حصہ خرچ کرنا چاہیے۔

اسی سلسلے میں تبلیغی جماعت کے ذمے داروں سے بھی ایک گزارش ہے کہ جماعتوں کا رض شہروں سے زیادہ دیہاتوں کی جانب کیا جائے ؛ تاکہ وہاں جماعتوں کے نقل و حرکت سے دینی اثرات مرتب ہوں اور گھر گھر پھیلیں ؛ یہ بات اس لیے عرض کی کہ بعض جگہ پتہ چلا کہ کبھی کبھی کوئی جماعت آجاتی ہے، مسلسل کوئی سلسلہ نہیں ہے ؛لہذا جماعتوں کا رخ اگر اس جانب زیادہ ہوگا ،تو ایک بڑی دینی ضرورت کے پورا کرنے میں مدد ملے گی اور جو جماعتیں جمارتیں بھیجی جائیں، ان کو یہ ہدایت برابر کی جائے کہ وہ وہاں کے امام و مدرس سے براہ

راست رابطے کی شکل پیدا کر کے ایک جانب ایک جماعت میں نکلنے کی اہمیت بتائیں، تو دوسری جانب وہاں رہتے ہوئے علم دینی سیکھنے، مکاتب سے وابستہ ہونے کی ضرورت کو بھی ہرگز فراموش نہ کریں؛ تاکہ دینی کاموں میں کوئی تضاد نہ محسوس کیا جائے؛ بل کہ سب دینی کاموں کی اہمیت سمجھی و سمجھائی جائے۔

الحمدللہ! جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم کی جانب سے اس سلسلے میں ایک پیش رفت کی گئی ہے اور کام شروع کر دیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں اب تک متعدد دیہی علاقوں اور بعض جگہ شہروں میں بھی جہاں ضرورت تھی، وہاں سو سے زائد مکاتب کا نظام اللہ کے فضل و کرم سے قائم ہو چکا ہے؛ اس کے لیے ہمارا بنایا ہوا ایک نصاب جو تقریباً بیس سال قبل ہماری زیر سرپرستی چلنے والے مکاتب کے لیے بنایا گیا تھا، اسی کو نظر ثانی کے بعد اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے، جو چھ سالانہ نصاب ہے، جس میں مشہور زمانہ ''نورانی قاعدہ'' بعدہ قرآن کریم مع تجوید، مختلف سورتوں کا حفظ، احقر کی کتاب ''اسلامی اسباق''، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تعلیم الاسلام'' چاروں حصے اور اردو پڑھائی لکھائی کے لیے اشرفی قاعدہ و اشرفی تعلیم کے پانچ حصے داخل ہیں۔ اس نصاب میں ہر سہ ماہی کے لیے ایک مقدار نصاب مقرر ہے اور کل چھ سالہ نصاب ہے، جس کو ایک زمانے میں الحمدللہ ہمارے زیر سرپرستی مکاتب و مدارس میں برتا اور آزمایا گیا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ کوئی ایک ادارہ یا دو چار ادارے کام کر کے اس سلسلے میں کامیاب نہیں ہو سکتے؛ اس لیے کہ بعض جگہوں کے بارے میں خبر ہے کہ وہاں قرب و جوار میں سو سے زائد قریہ جات ایسے ہیں، جہاں کوئی مسجد تک نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اگر ایک مختصر سی پٹی پر بھی یہ کام کیا جائے گا، تو وہ بھی ایک دو اداروں کے قبضے میں آنا مشکل ہے؛ اس لیے اس کی تحریک مختلف حضرات اور متعدد اداروں کی جانب سے ہونا چاہیے۔ اور سب کا مقصد بس یہ ہونا چاہیے کہ ہم اللہ کے دین کا کام کریں، نصاب و نظام تو بدل سکتے ہیں؛ لیکن اللہ کا دین بدلتا نہیں، مقصود اللہ کے دین کو بنا کر کام کیا جائے، کوئی ''تو تو'' ''میں میں'' کی نوبت دینی خدام

میں نہ آئے ، ہر دینی کام کرنے والا دوسرے کو اپنا رفیق سمجھے، فریق نہ سمجھے، کوئی تضاد پیدا نہ کیا جائے؛ بل کہ اس اخلاص نیت سے کام کیا جائے کہ سب کی محنتوں سے دین کا بول بالا ہو ، دہی علاقوں کی صورتِ حال میں دینی لحاظ سے بہتری پیدا ہو، اگر اس راہ میں کام کرنے والے سارے لوگ اخلاص کے ساتھ ایک دوسرے کو اپنا معاون سمجھ کر کام کریں گے اور کسی تضاد کا شکار نہ ہوں گے، تو امید ہے کہ بہت بڑا کام ہو سکتا ہے۔

اخیر میں یہ بات اس لیے لکھنا پڑی کہ آج دیکھا جا رہا ہے کہ کس طرح دین کے نام پر خلاف دین کام کیے جا رہے ہیں، دین کے نام سے خود کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے، بعض دینی تحریکات سے جڑے ہوئے غیر مخلص عناصر کس طرح دوسرے دینی کام میں لگے ہوئے لوگوں کو محض اپنے طریق کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدنام کرنے، ان کے کام کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ سب باتیں دراصل اخلاص کے فقدان کا نتیجہ ہوتے ہیں؛ لہٰذا ہر ایک دینی کام کرنے والے کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ مخلصانہ طور پر کام کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کرے اور دین کے کسی کام آجائے۔

ربیع الاول کا پیغام امت اسلامیہ کے نام

اسلامی کیلنڈر کا ایک اہم و مقدس مہینہ ''ربیع الاول'' ہر سال آتا اور جاتا ہے، اور ہم خواب غفلت میں پڑے سوتے رہتے ہیں، کبھی نہیں سوچتے کہ اس ماہ نے اپنی آمد سے ہمیں کیا پیغام دیا ہے یا دینا چاہتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ایک اہم ترین پیغام امت مسلمہ کے نام ہر سال وہ چھوڑ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ یاد دلاتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال قبل جب یہ دنیا جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، گمراہی کے مہیب بادل اس کی فضا پر مسلط تھے، انسانیت اپنی منزل اور اپنا راستہ بھول چکی تھی، اپنے خالق و مالک سے اس کا رشتہ کٹ گیا تھا، وہ اچھے و برے کی تمیز و ادراک کی صلاحیت کھو چکی تھی، خالق و معبود کا فرق ذہنوں سے محو ہو چکا تھا، ہر شجر و حجر خدا کا درجہ پایا ہوا تھا اور یہ انسانیت جس کو اشرف و اعلیٰ قرار دیا گیا تھا، ان حقیر و ذلیل اشیاء کے سامنے اپنا ماتھا ٹکائے ان کی غلامی میں گرفتار ہو چکی تھی، اخلاق و کردار، تہذیب و شرافت، نیکی و طاعت کا کوئی تصور باقی نہیں رہ گیا تھا، انسان انسان کا دشمن بنا ہوا تھا اور عداوت و بغض، کینہ و حسد، قتل و غارت گری، چوری و ڈکیتی اس کی پہچان بن گئی تھی، فسق و فجور، فحش و بے حیائی، عشق بازی و زنا کاری اس کا شیوہ بن گیا تھا، الغرض انسانوں میں نہ انسانیت ہی باقی رہی تھی، نہ خدا کی معرفت و پہچان، ایسے پُر خطر دور میں مشیت ایزدی و حکمت ربانی نے محض اپنی رحمت خاصہ سے ایک ہادیٔ برحق کو حضرت محمد عربی فداہ ابی و امی یا رسول اللہ ﷺ کی صورت میں بھیج کر اس بھٹکتی انسانیت پر احسان عظیم فرمایا۔

آپ کے آتے ہی دنیا کے احوال و کوائف میں یکلخت تغیر و تبدیلی پیدا ہونی شروع

ہوگئی، حقائق سے پردے اٹھنے لگے، جہالت کی تاریکیاں چھٹنے لگیں، گمراہی کے مہیب بادل ہٹنے لگے، لوگوں میں انسانیت کا شعور زندہ ہونے لگا، کفر وشرک کے جھنڈے گرنے لگے، ظلم وعدوان کے پرخچے اڑنے لگے، ایمان وکفر کے فرق کو سمجھا جانے لگا، خالق کون ومکان کی پہچان ہونے لگی، عبد ومعبود میں امتیاز قائم ہوتا گیا، رذائل وفضائل کا فرق معلوم ہونے لگا، یہاں تک کہ خدا کی بڑائی وعظمت، مخلوقات کی دناءت وحقارت، ایمان ونیکی وتقوی کی بڑائی وفضیلت، کفر وشرک اور رذائل کی برائی وخباثت، عدل وانصاف کی بلندی واولی العزمی، ظلم وعدوان کی بے حقیقتی ورسوائی لوگوں پر آشکار ہوتی چلی گئی۔ اس کے نتیجے میں ایک جانب بھٹکتی انسانیت کو اپنے مالک حقیقی کی معرفت وپہچان ملی، تو دوسری جانب اس کو اپنے کھوئے ہوئے اقدار انسانیت بھی حاصل ہوگیے۔

لیکن یہ حیرت انگیز تبدیلی وتغیر کس طرح بپا ہوگیا؟ اس کی پیچھے کیا محرکات ومجاہدات تھے؟ ''ربیع الاول'' ہمیں یہ بھی یاددہانی کرتا ہے کہ اللہ کے رسول کی ذات والا صفات نے شروع میں تن تنہا اور بعد میں اپنے اصحاب کو ساتھ لے کر دنیا کی ان جہالتوں وگمراہیوں کو دور کرنے اور انسانیت کو راہ راست پر لانے کے لیے ان تھک محنت ومجاہدہ کیا، دعوت وتبلیغ کی ہر صورت وشکل کو اختیار فرمایا، اصلاح وتزکیہ کی ہر ممکن کوشش فرمائی، تب جا کر لوگوں کے نظریات وخیالات بدلے، کفر وشرک کی جگہ ایمان وتوحید کی فضا قائم ہوئی، ظلم وعدوان کی جگہ امن وانصاف نے لی۔

نہیں، نہیں، اسی قدر نہیں؛ بل کہ مزید یہ ہوا کہ آپ کو مخالفتوں کا، دشمنیوں کا، نفرتوں کا، دھمکیوں کا، ظلم وتشدد کا سامنا کرنا پڑا، اپنے غیر ہونے لگے، اہل خاندان وقبیلہ بھی روٹھ گئے، حرب وضرب کی فضا برپا ہوگئی، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، گردن میں چادر ڈال کر کھینچا گیا، گالیوں وطعنوں سے اذیت پہنچائی گئی، یہاں تک کہ آپ کو اپنے وطن مالوف ومحبوب سے نکلنے پر مجبور کیا گیا اور جب وہاں سے نکل کر مدینہ طیبہ چلے گئے، تب بھی تعاقب کیا گیا اور وہاں سے بھی نکالنے کی کوششیں کی گئیں اور آخر کار آپ کو جنگ پر مجبور کیا گیا اور

اور جانوں اور مالوں کی بے پناہ قربانیاں دینی پڑیں، بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی شہادتیں ہوئیں، بھوک و پیاس، افلاس وتنگی سے گزرنا پڑا، پریشانیوں وکلفتوں کو برداشت کرنا پڑا، صبر وحلم کے سخت ترین آزمائشی دور سے گزرنا پڑا۔ تب جا کر وہ صورت دنیا نے دیکھی، جس کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا۔

ان محنتوں ومجاہدات کے نتیجے میں ایک ایسا صالح معاشرہ تیار ہوا، جس کی کوئی مثال نہیں، وہ پاکیزگی میں یکتا، ایمان وتقوی میں بےنظیر، علم وفہم میں بہت ارفع، عمل وکردار میں نہایت اعلی، صداقت وسچائی میں بےمثال، عدل وانصاف میں لاجواب معاشرہ تھا۔

یہی وہ معاشرہ ہے، جس کا ذکر قرآن نے موقعۂ مدح وتعریف میں اس طرح کیا ہے:

﴿مُحَمَّد”رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ ، رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ، تَرٰئھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا ، سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ، ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰئۃ ، وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ، فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ ، وَعَدَاللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ (سورۃ الفتح)

(محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں، آپس میں مہربان ہیں، تو ان کو دیکھے گا کہ محض اللہ کے فضل ورضا کی جستجو کرتے ہوئے کبھی رکوع میں ہیں، تو کبھی سجدے میں ہیں، ان کی عبدیت کے آثار ان کے چہروں پر سجدے کی تاثیر سے نمایاں ہیں، یہ ان لوگوں کے اوصاف تورات میں لکھے ہیں اور انجیل میں ان کی صفت یہ لکھی ہے کہ جیسے کھیتی نے اپنی نوک نکالی، پھر اس کی کمر مضبوط کی پھر اور موٹی ہوئی اور اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہو

نے لگی، یہ ان کا نشو ونما اس لیے؛ تا کہ کافروں کو جلائے اور آخرت میں ان ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔)

ماہ ربیع الاول ہمیں اس حیرت انگیز صورتِ حال کی یاد دہانی کرتا ہے کہ سوچو کہ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اس دنیا کا کیا نقشہ تھا اور پھر آپ ﷺ کی برکت سے کس طرح کا نقشہ اس سطح دنیا پر ابھرا؟ اور پھر یہ کہ جب آپ دنیا سے تشریف لے گئے تھے،تو کس طرح کا معاشرہ چھوڑ گئے تھے؟ کن اوصاف اور کمالات کا، کن خصوصیات اور امتیازات کا، کن خوبیوں اور دل آویزیوں کا؟

مگر آج امت مسلمہ کہاں کھڑی ہے؟ آج کے اسلامی معاشرے کی کیا حالت ہے؟ اس موجودہ اسلامی معاشرے میں اور اُس اولین اسلامی معاشرے میں کس قدر بون بعید اور فرق عظیم پیدا ہو گیا ہے؟ ایمان ویقین کی کیفیات میں، اعمال وعبادات کی انجام دہی میں، اخلاقی اقدار سے متصف ہونے میں، معاشرتی احوال میں، معاملاتی زندگی میں، کیا کیا اور کیسی کیسی تبدیلیاں وتغیرات ہم میں پیدا ہو چکے ہیں۔

ماہ ربیع الاول ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ مسلمانو! میں تمہیں یہ یاد دلاتا جا رہا ہوں کہ تم اپنی ڈگر سے ہٹ گئے ہو، جس پر حضرت محمد ﷺ نے تمہیں چھوڑا تھا، ان اوصاف و کمالات سے تم دور ہو چکے ہو، جس سے اسلامی معاشرے کو موصوف کیا گیا تھا، تمہارے اندر سے وہ ایمانی کیفیات مفقود ہوتی جا رہی ہیں، جن سے دور اول کے اسلامی معاشرے کو امتیاز بخشا گیا تھا، ان اخلاقی قدروں کی پامالی کے مرتکب تم ہو رہے ہو، جو تمہارے لیے باعث افتخار تھے، کیف عبادت و لطف تقوی سے تمہارے دلوں کی دنیا محروم نظر آتی ہے، جو کبھی ہمارے اسلاف کا سرمایۂ اعزاز تھا۔ ذوقِ اطاعت شعاری وشوق مناجات وسرگوشی کی دنیا سے تم نابلد و ناواقف لگتے ہو، جس سے کبھی تمہارے اسلاف کی زندگیاں معمور تھیں۔

غور کرو کہ کس قدر فرق پیدا ہو گیا ہے، ہم میں اور اُن میں؟ اس معاشرے میں اور اس معاشرے میں؟ ہاں چند رسومات ورواجات ہیں، جن کو ہم لوگوں نے لے لیا ہے، کوئی دین و شریعت کو چھوڑ کر من مانی امور کو دین تصور کیے بیٹھا ہے، کوئی بدعات وخرافات کا نام دین رکھ لیا ہے، اسوۂ نبوی سے روگردانی کرتے ہوئے زندگی گزاری جارہی ہے، نماز تو نمازی پڑھتے ہیں؛ مگر بے جان، روزے دار روزے تو رکھتے ہیں، مگر عشق سے خالی، تلاوت والے تلاوت تو کرتے ہیں، مگر سوز سے عاری، ذکر ذکر کے عادی کرتے ہیں؛ مگر کیف سے محروم۔

ماہ ربیع الاول کا یہ پیغام ہے کہ ہم اس میں نبی کے اُسوہ کی، ان کے مجاہدات کی، ان کے افکار کی، ان کے احوال کی، ان کے جذبات کی، ان کے اصحاب کی، ان کے احکام کی، ان کی شریعت کی یاد اپنے دلوں میں زندہ کریں اور اسی کے مطابق زندگی کرنے کی کوشش کریں، صرف نام کے نہیں کام کے مسلمان بنیں اور صرف ظاہری نہیں حقیقی مؤمن بنیں۔

اے کاش! کہ ربیع الاول میں نبی ﷺ کے نام سے جشن کرنے والے نبی ﷺ کے اسوہ واحکام کا اتباع کریں اور اپنے حالات کو اس کے موافق ڈھالنے کی کوشش کریں۔

دین کے تمام شعبے ضروری اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں، دینی محنت کرنے والوں کو اکابر کی اہم نصیحت

آج کل دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے لوگ دین کے مختلف شعبوں: تعلیم وتعلم، تبلیغ و دعوت، تزکیہ وسلوک اور پھر دعوت وتبلیغ کے دو رکن: امر بالمعروف ونہی عن المنکر، وغیرہ میں سے ایک یا چند شعبوں کو تو دین سمجھتے ہیں اور دیگر شعبوں کو یا تو دین ہی نہیں سمجھتے یا ضروری نہیں سمجھتے؛ حالاں کہ دین کے مختلف شعبوں میں سے ہر شعبہ اپنی جگہ اہم وضروری ہے اور ایک دوسرے سے ان کا ربط وتعلق بھی ہے۔ مثلاً دین کے اہم وبنیادی شعبوں میں سے ایک شعبہ تعلیم وتعلم کا ہے، ایک شعبہ اصلاح وتزکیہ کا ہے اور ایک شعبہ دعوت وتبلیغ کا ہے اور یہ تینوں شعبے اہم وضروری ہونے کے ساتھ ایک دوسرے سے مربوط ومتعلق بھی ہیں۔

اسی لیے حضرات اکابرین نے ہمیشہ اس قسم کی ذہنیت کو ختم کرنے اور امت کو راہِ استقامت دکھانے کی کوشش کی ہے، یہاں مناسب ہے کہ بعض اکابرین کے بیانات سے اہم اقتباسات پیش کر دیے جائیں؛ تاکہ لوگ غلو سے دور رہیں اور راہ راست سے دور نہ ہوں۔

حضرت اقدس مولانا سعید احمد خان صاحب مکی رحمہ اللہ جو تحریک دعوت وتبلیغ کے اساطین میں مانے جاتے ہیں، انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں، جو ”تبلیغی کام کے اہم اصول“ کے نام سے شائع شدہ ہے، لکھا ہے:

”دین کے تمام شعبے ایسے ہی ہیں جیسے انسان کے اعضاء وجوارح، آنکھ

سے دیکھنے کا کام، زبان سے بولنے کا کام، ہاتھ سے پکڑنے، کانوں سے سننے، پیروں سے چلنے، دماغ سے سوچنے کا کام، یہ سارے کام انسان کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ایک عضو میں بھی کمزوری ہوگی یا نقص ہوگا، تو اس سے تمام جسم کو تکلیف ہوگی اور چیزوں سے استفادہ میں نقصان ہوگا۔ ان سب اعضاء کی سخت ضرورت ہے۔ یہ سب اعضاء ایک دوسرے کے معاون ہیں، مقابل نہیں ہیں۔ اسی طرح سے اللہ کا ذکر اور علم، عبادت، خدمت اور معاملات، قضا، سب ایک دوسرے کے معاون ہیں، مقابل نہیں ہیں، معاون ہونے ہی کی وجہ سے دین مکمل ہوتا ہے، دعوت تو ان تمام شعبوں کو دنیا میں پھیلانے اور عام کرنے ہی کے لیے ہے۔''

(تبلیغی کام کے اہم اصول: ۷-۸)

نیز حضرت والا رحمہ اللہ نے اس سے ذرا پہلے ان لوگوں کے طرزِ عمل پر نکیر کی ہے، جو دیگر شعبوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں، جس سے ان شعبوں کی تنقیص و تحقیر لازم آتی ہے۔ آپ اسی مکتوب میں لکھتے ہیں:

''بہت سارے حضرات کو خصوصاً کسی دینی شعبے کو چلانے والے کے لیے ہماری دعوت اور ہمارے بیانوں سے اعتراض پیدا ہو جاتا ہے کہ گویا ہم ان شعبوں کو ناقص سمجھ رہے ہیں یا ان کو حقیر سمجھ رہے ہیں، اگر ہمیں دعوت کا صحیح صحیح طرز آجائے، تو ہر ایک ہمیں اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھ کر خود بھی قریب ہوگا اور ہمیں بھی اپنے سے قریب کرے گا، مثلاً جب ہم دعوت کے نمبر کو اور اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں، تو کبھی علم والوں کے شعبے پر یعنی مدارس پر اس طرح فوقیت دیتے ہیں گویا وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں اور کبھی ذکر والوں کے مقابلے میں، جیسا کہ بہت سے واعظین حضور ﷺ کی فضیلت دوسرے

انبیاء کے مقابلے میں اس طرح بیان کرنے لگتے ہیں کہ دوسرے انبیاء کی تنقیص لازم آنے لگتی ہے اور ان کا یہ طرز بیان دین کے لیے بہت خطرناک ہے، ایسے ہی ہمارا طرز بیان بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔''

(تبلیغی کام کے اہم اصول:۵)

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمہ اللہ جو حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کے بلا واسطہ فیض یافتہ ہیں، انھوں نے اپنے مواعظ میں متعدد مواقع پر اس بات کی وضاحت اور اس پر تنبیہ کی ہے کہ دین کے شعبے: علم وذکر اور دعوت سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور سب کی ضرورت ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے ہماری کامیابی کے لیے اور ہم سب کو ایمان دار بنانے کے لیے تین چیزیں اتاری ہیں۔ تعلیم، تبلیغ اور تزکیہ، اور ان تین چیزوں میں تضاد نہیں ہے؛ بل کہ تو اَم (جڑواں) ہیں۔ بغیر ذکر کے علم پر عمل مشکل، بغیر علم کے ایمانی زندگی کا حاصل ہونا مشکل، بغیر تبلیغ کے ایمانی زندگی کا چلنا اور پھیلنا مشکل۔ حضور ﷺ کو یہ تینوں چیزیں ساتھ دی گئی ہیں۔''

(مواعظ عبیدیہ:۵۵۶)

ان تینوں شعبوں کی ضرورت وافادیت اور ان کے باہمی ربط وتعلق کے سلسلے میں بانی جماعت تبلیغ حضرت اقدس مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر سن لیں، حضرت مولانا عبید اللہ بلیاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ نے ان تینوں کو جوڑا، ان تینوں کو اکھٹا کیا ہے، جو صرف علم حاصل کر رہا ہے، بے شک اس کے پاس علم کا نور رہے اور علم کے اعتبار سے اس کو پتہ چل جائے؛ لیکن اگر اس کے پاس ذکر نہیں ہے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ علم والا ظلمت میں رہے اور بہک جائے اور پھسل

جائے اور جو صرف ذکر کررہا ہے اور علم حاصل نہیں کررہا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس ذکر کرنے والے کو نور ذکر کامل جائے؛ لیکن اس سے کوئی لغزش ہوجائے، کوتاہی ہوجائے، علم نہ ہونے کی وجہ سے۔ وہ زیادہ خطرہ کے موقعے پر ہے۔ اور صرف علم و ذکر والا جو دعوت وتبلیغ (یعنی کسی بھی نہج وطریقے سے اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانے اور پھیلانے کا کام) کے میدان میں نہیں ہے، تو اس کے علم و ذکر سے ہوسکتا ہے کہ ایک دائرے میں اسلام محفوظ رہے اور کچھ خاص اشخاص کے پاس علم آجائے اور ذکر آجائے؛ لیکن پوری دنیا میں خدا کا نظم آجائے اور پوری دنیا میں اللہ کا حکم نافذ ہوجائے، تو یہ غلبہ بغیر دعوت وتبلیغ کے کام کے نہیں ہوگا۔ اس واسطے یہ تینوں چیزیں متلازم ہیں اور بڑے حضرت رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ تینوں چیزیں متلازم ہیں۔

(مواعظ عبیدیہ: ۴۵۱)

اسی کے ساتھ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کا ایک ملفوظ سن لیجیے، جس کو حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنے مواعظ میں نقل کیا ہے، فرمایا:

''حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں علم اور ذکر کی تقویت کے لیے تبلیغ کا کام کررہا ہوں، جب آدمی جماعت میں چل کر تین چلے لگالے گا اور پھر تم اس کو علم پر اور دوازدہ تسبیح پر ڈال دوگے، تو وہ زیادہ نفع بخش کام کرنے والا بن جائے گا۔ فرماتے تھے کہ تبلیغ کے ذریعے تصوف کی طرف کھینچنا ہے اور تبلیغ کے ذریعے علم کی طرف کھینچنا ہے۔ ....مولانا عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ.......'' اسی طرح حضرت (مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ) بغیر ذکر اور علم کے تبلیغ سے بہت جلد فتنوں کے آنے کا اندیشہ ظاہر کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بغیر علم و ذکر والی تبلیغ کے ذریعے صدیوں میں آنے والا فتنہ وفساد منٹوں میں آجائے گا اور جب تبلیغ کا

کام صحیح اصولوں پر ہوگا، تو صدیوں کے فتنے وفساد منٹوں میں ٹل جائیں گے۔

(مواعظ عبدیہ: ۱۹۷)

الغرض ان اکابر کے بیانات وتصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دین کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ لازم وضروری ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی اور ایک شعبے والے دوسرے شعبے والوں کے معاون ہیں، نہ کہ مقابل اور ایک دوسرے کے رفیق ہیں، نہ کہ فریق؛ لہٰذا سب کو اسی طرح دین کے شعبوں میں معاون بننا چاہیے نہ کہ ایک دوسرے کے مقابل۔

جب تمام شعبوں کی اہمیت وضرورت وافادیت معلوم ہوگئی، تو کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ جب بعض حضرات علما ان شعبوں میں سے بعض شعبوں پر کام کرتے ہیں، تو ان پر اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ کیوں یہ کام کیا جا رہا ہے؟ جب کہ وہ بھی دین ہی کا ایک شعبہ ہے اور اس پر بھی کام وخدمت کی اسی طرح ضرورت ہوتی ہے، جس طرح دیگر شعبوں پر محنت وخدمت کی ضرورت ہے۔

اس کا اندازہ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کے ایک ملفوظ سے بہ خوبی ہو سکتا ہے، آپ نے فرمایا:

''علما سے کہنا ہے کہ ان تبلیغی جماعتوں کی چلت پھرت، زور محنت وکوشش سے عوام میں دین کی صرف طلب اور قدر ہی پیدا کی جاسکتی ہے اور ان کو دین سیکھنے پر آمادہ ہی کیا جاسکتا ہے، آگے دین کی تعلیم وتربیت کا کام علما وصلحا کی توجہ فرمائی ہی سے ہوسکتا ہے؛ اس لیے آپ حضرات کی توجہات کی بڑی ضرورت ہے۔''

(ملفوظات: ۱۴۲)

اس ملفوظ سے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت کی نظر میں علما ومشائخ اور ان کے زیر نگرانی قائم وجاری تعلیمی واصلاحی ادارے، جن کو مدارس وخانقاہیں کہا جاتا ہے، ان کی کس قدر اہمیت تھی؟ کہ آپ صاف فرماتے ہیں کہ اس تبلیغی کوشش ومحنت کا اثر تو صرف یہ ہے کہ

لوگوں میں دین کا ذوق وشوق، اس کی قدر و منزلت اور اس کی طلب و جستجو پیدا کی جا سکتی ہے؛ مگر اس کے بعد وہ علم حاصل کریں یا اپنی تربیت چاہیں تو کیا کریں؟ اس کا جواب یہ دیا کہ وہ علما و صلحا ہی کا کام ہے، یہ کام تو وہی حضرات کر سکتے ہیں۔ اسی لیے علما نے مکاتب اسلامیہ و مدارس دینیہ کا جال بچھایا ہے اور مشائخ نے خانقاہی نظام و اصلاحی پروگرام ترتیب دیا ہے اور ان دونوں طبقات کی محنتیں جاری ہیں؛ لہذا مدارس و خانقاہوں کو اسی تبلیغ کا ایک اہم جز و حصہ سمجھا جائے، تو یہ سب کے سب مربوط رہیں گے۔

حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کا ایک اور ارشاد آپ کے ملفوظات میں ہے، جو تمام تبلیغی جماعتوں اور اس سلسلے سے وابستہ حضرات؛ بل کہ سبھی دینی کام کرنے والوں کے لیے فکر انگیز ہے، ملاحظہ کیجیے:

''ہماری اس دینی دعوت میں کام کرنے والے سب ہی لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دینی چاہیے کہ تبلیغی جماعتوں کے نکلنے کا مقصد صرف دوسروں کو پہنچانا و بتانا ہی نہیں ہے؛ بل کہ اس کے ذریعے سے اپنی اصلاح اور اپنی تعلیم و تربیت بھی مقصود ہے؛ چناں چہ نکلنے کے زمانے میں علم و ذکر میں مشغولیت کا بہت زیادہ اہتمام کیا جائے۔ علم دین و ذکر اللہ کے بغیر نکلنا کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ علم و ذکر میں مشغولیت اس راہ کے بڑوں سے وابستگی رکھتے ہوئے اور ان کے زیرِ ہدایت و نگرانی ہو۔ انبیاء علیہم السلام کا علم و ذکر اللہ کے زیر ہدایت تھا اور صحابۂ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علم و ذکر لیتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پوری پوری نگرانی فرماتے تھے، اسی طرح ہر زمانے کے لوگوں نے اپنے بڑوں سے علم و ذکر لیا اور ان کی نگرانی و رہنمائی میں تکمیل کی۔ ایسے ہی آج بھی ہم اپنے بڑوں کی نگرانی کے محتاج ہیں، ورنہ

شیطان کے جال میں پھنس جانے کا بڑا اندیشہ ہے۔''

(ملفوظات شاہ محمد الیاس:۹۳-۹۴)

اس میں حضرت نے علمِ دین وذکر اللہ کے بغیر دعوتی وتبلیغی مہم وتحریک کو''کچھ بھی نہیں'' کہہ کر غیر مفید قرار دے دیا ہے، پھر ایک اہم بات یہ بتائی کہ علم وذکر کی تحصیل ''اس راہ کے بڑوں'' سے حاصل کی جائے اور یہ معلوم ہے کہ علم کی راہ کے بڑے ''علمائے امت'' ہیں اور ذکر کی راہ کے بڑے ''مشائخ صوفیا'' ہیں؛ لہذا ان سے علم وذکر کی تحصیل کی جائے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ اوپر سے ہی یہ طریقہ وسنت چلی آرہی ہے، کہ علم وذکر اس راہ کے بڑوں سے حاصل کیا جاتا ہے؛ لہذا دعوت وتبلیغ سے نسبت رکھنے والے اپنے علم وذکر کی تحصیل علما وصلحا سے کریں تو یہ سارے شعبے مربوط رہیں گے اور یہ لوگ بھی ان سارے شعبوں سے مربوط رہیں گے۔

نیز آپ نے فرمایا:

''ہماری اس تحریک کا اصل مقصد ہے مسلمانوں کو جمیع ما جاء بہ النبی ﷺ سکھانا (یعنی اسلام کے پورے علمی وعملی نظام سے امت کو وابستہ کر دینا) یہ تو ہے ہمارا اصل مقصد۔ رہی قافلوں کی چلت پھرت اور تبلیغی گشت؛ سو یہ اس مقصد کے لیے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ ونماز کی تلقین وتعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی ''الف بے تے'' ہے۔ یہ بھی ظاہر کہ ہمارے قافلے پورا کام نہیں کر سکتے، ان سے تو بس اتنا ہی ہوسکتا ہے، ہر جگہ پہنچ کر اپنی جد وجہد سے ایک حرکت وبیداری پیدا کر دیں اور غافلوں کو متوجہ کر کے وہاں کے مقامی اہل دین سے وابستہ کرنے کی اور اس جگہ دین کی فکر کرنے والوں (علما وصلحا) کو بیچارے عوام کی اصلاح پر لگا دینے کی کوشش کریں۔ ہر جگہ تو اصلی کام وہیں کے کارکن کر سکیں گے اور عوام کو زیادہ فائدہ اپنی جگہ کے اہل دین ہی سے استفادہ کرنے سے ہوگا۔ البتہ اس کا طریقہ ہمارے ان آدمیوں

سے سکیھا جائے، جو ایک عرصے سے افادہ واستفادہ اور تعلیم و تعلم کے اس
طریقے پر عامل ہیں اور اس پر بڑی حد تک قابو پا چکے ہیں۔"

(ملفوظات:۲۹-۳۰)

نیز آپ نے خانقاہی نظام و مشائخ صوفیا سے جماعتوں کو وابستہ رکھنے کی جد و جہد بھی فرمائی؛ تاکہ وہاں سے بھی فیض پانے کا سلسلہ جاری رہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے آپ کی سوانح میں حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کے ایک خط کا ذکر کیا ہے، جو آپ نے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ کو تحریر فرمایا تھا، اس میں آپ نے لکھا:

"میری ایک پرانی تمنا ہے کہ خاص اصول کے ساتھ مشائخ طریقت کے یہاں یہ جماعتیں آدابِ خانقاہ کی بجا آوری کرتے، خانقاہوں میں فیض اندوز ہوں اور جس میں باضابطہ خاص وقتوں میں حوالی کے گاؤں میں تبلیغ بھی جاری رہے، اس بارے میں ان آنے والوں سے مشاورت کر کے کوئی طرز مقرر فرما رکھیں، یہ بندہ ناچیز بھی اسی ہفتے بہت زیادہ اغلب ہے کہ چند رؤساء کے ساتھ حاضر ہو، دیوبند اور تھانہ بھون کا بھی خیال ہے۔"

(مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت:۱۲۴-۱۲۵)

نیز قرآن پڑھنا اور صحت و تجوید سے پڑھنا ایک اہم و ضروری کام ہے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اس اہم و ضروری کام کی جانب تبلیغی جماعتوں کو متوجہ کیا اور اس کو بھی اہل علم سے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے؛ چناں چہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

"تبلیغی جماعتوں کے نصاب تعلیم کا ایک اہم جز تجوید بھی ہے، قرآن شریف اچھی طرح پڑھنا بڑی ضروری چیز ہے........لیکن تجوید کی تعلیم کے لیے جتنا وقت درکار ہے، جماعت میں اتنا وقت نہیں مل سکتا؛ اس لیے ان ایام میں تو صرف اس کی کوشش کی جائے کہ لوگوں کو اس کی ضرورت کا احساس ہو

جائے اور کچھ مناسبت ہو جائے اور پھر اس کو سیکھنے کے لیے وہ مستقل وقت صرف کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔''

(ملفوظات:۱۳۸)

اندازہ لگائیے کہ اس میں صاف اقرار ہے کہ محض تبلیغی جماعت میں نکل جانے سے یہ اہم وضروری کام ''تجوید کی تحصیل'' پورا نہیں ہو سکتا، جماعت میں صرف ترغیب وتشویق پیدا کی جاسکتی ہے؛ لہٰذا اس کے بعد اہل علم حضرات سے رجوع کر کے اس کو مستقل وقت میں پڑھنا چاہیے؛ لہٰذا ان مدارس کو اس طرح تبلیغ سے مربوط کر دیا۔

یہی نہیں کہ یہ سارے شعبہ جات اسلامیہ وخدمات دینیہ آپ کی نظر میں ضروری تھے؛ بل کہ یہ بڑے اہم واونچے درجے کے کام بھی تھے؛ چناں چہ آپ کے ملفوظات میں ایک ارشاد یہ بھی نقل کیا گیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

> ''بزرگوں کی خدمت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے جو عمومی ومعمولی کام دوسرے لوگ انجام دے سکتے ہوں، وہ ان کو اپنے ذمے لے لیں؛ تاکہ ان کے اوقات اور ان کی قوتیں ان بڑے کاموں کے لیے فارغ ہو جائیں، جو وہی انجام دے سکتے ہیں، مثلاً شیخ وقت یا کسی عالم ومفتی کے وہ عمومی کام آپ اپنے ذمے لے لیں، جو آپ کے بس میں ہیں اور ان کو ان کی طرف سے فارغ وبے فکر کر دیں، تو وہ حضرات دین کے جو بڑے بڑے کام کرتے ہیں (مثلاً اصلاح وارشاد اور درس وافتاء وغیرہ) تو وہ زیادہ اطمینان ویکسوئی سے ان کو انجام دے سکیں گے اور اس طرح یہ خدام ان کے ان بڑے کاموں کے اجر میں حصہ دار بن جائیں گے۔''

(ملفوظات:۱۳۸-۱۳۹)

اس میں آپ نے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی اور متوجہ کیا کہ علماء ومشائخ جو بڑے بڑے کاموں میں لگے ہیں، ان کے دنیوی معمولی وعمومی کاموں کو خود کر کے ان کو فارغ

کردیں؛ تاکہ وہ اپنی بڑی و عظیم الشان خدمات قرآن وسنت کی تدریس، قلوب ونفوس کی اصلاح وتزکیہ، علوم کی تحقیق وترتیب، افتاء وغیرہ میں خوب یکسوئی سے خدمت انجام دے سکیں۔

اب اخیر میں حضرت کی ایک نہایت ہی اہم بات سن لیں اور عبرت حاصل کریں کہ حضرت مولانا نے اپنے نہج کی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں میں لگنے والوں کو اس بات کی بھی تلقین کی ہے کہ وہ اس خیال سے استغفار کی کثرت کریں کہ اس کام میں لگنے سے کئی اہم شعبوں کے سلسلے میں ہم سے تقصیر ہوگئی۔ لیجیے آپ کے الفاظ پڑھیے:

> ''کسی کام میں اشتغال اس کے علاوہ اور بہت سی چیزوں سے اعراض کو مستلزم ہوتا ہے؛ یعنی اشتغال فی شیء ہوگا، تو اشتغال عن اشیاء ہوگا اور پھر جس درجے کا اشتغال فی شیء ہوگا، تو دوسری چیزوں کے اہتمام میں اسی درجے کی کمی ہوگی، شریعت میں جو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر اچھے سے اچھے کام کے ختم پر استغفار کیا جائے، میرے نزدیک اس میں ایک راز یہ بھی ہے کہ شاید اس اچھے کام میں مشغولی اور انہماک کی وجہ سے کسی دوسرے امر کی تعمیل میں کوتاہی ہوگئی ہو، خاص کر جب کسی کام کی لگن میں دل لگ جاتا ہے اور دل دماغ پر وہ کام چھا جاتا ہے، تو پھر اس کے ماسوا دوسرے کاموں میں بسا اوقات تقصیر ہو جاتی ہے؛ اس لیے ہمارے کام میں لگنے والوں کو خصوصاً کام کے زمانے میں اور کام کے خاتمے پر استغفار کی کثرت اپنے اوپر لازم کر لینی چاہیے۔''

(ملفوظات: ۱۴۱-۱۴۲)

اللہ اکبر! کیا اعتدال وتوسط ہے اور کس قدر حقیقت کشا بیان ہے کہ آپ کی نظر میں دیگر کام بھی نہایت اہم ہیں؛ مگر انسان ایک کام میں مشغولی کی وجہ سے دوسرے امور سے کبھی غفلت یا اعراض کر جاتا ہے، اسی طرح حضرت کہتے ہیں کہ دعوتی کام میں لگنے والے بھی سوچیں کہ ہم سے دیگر شعبوں اور کاموں کے بارے میں غفلت ہو رہی ہے؛ اس لیے

استغفار کریں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس کا یہ احساس ہو وہ اس سلسلے میں سعی بلیغ بھی کرے گا، کہ مجھ سے یہ کوتاہی نہ ہو؛ لہذا اس میں تعلیم ہے کہ دیگر کاموں و خدمات سے غفلت نہ کی جائے۔

الحاصل تمام شعبہ جات دینی شعبے ہونے کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں اور سب کے سب ضروری بھی ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی۔

☆☆☆

کب تک یہ گستاخیاں؟

گزشتہ دنوں ہندو مہا سبھا یو پی کے کارگزار صدر ملعون نجس و ناپاک کملیش تیواری نے اپنے بیان میں جس عظیم و پاکباز ہستی؛ یعنی حضرت آقائے نامدار مدینہ کے تاجدار رحمۃ للعالمین خاتم المرسلین محمد عربی مکی و مدنی ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی کی ہے اور جس انداز سے کی ہے، اس نے انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیا اور عالمی برادری کے مابین ہندوستان کی عزت و شرافت کو بر سر بازار نیلام کر دیا، اس شخص نے تہذیب و اخلاق کے تمام حدود کو پار کر دیا اور انسانیت و شرافت کے دائرے سے گزر کر نہ معلوم شیطانیت کے کس مقام کو پہنچ گیا؟

ہندوستان کی سرزمین گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ ہے، جہاں مختلف المذاہب لوگ اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے اور پیار و اخوت کے ساتھ میں رہتے چلے آئے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ادب و اکرام سے پیش آتے ہیں اور ایک دوسرے کے بزرگوں کا لحاظ و احترام کرتے ہیں؛ مگر بعض انسانیت دشمن اور ملک دشمن عناصر ان اصول و آداب کو پامال کرتے ہوئے ایسی بدترین و ناپاک حرکات کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں، جن کی قیمت چکانا ملک کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔

ہندوستان کو جو کہ جمہوری آئین رکھتا ہے اور اسی سے اس کی ساکھ عالمی برادری میں بنی ہوئی ہے، اس کو تباہی کے دہانے تک لے جانے کا عزم و قصد رکھنے والے لوگ آئے دن ملک کی سالمیت سے کھیلتے رہتے ہیں اور اپنی بدطینتی و کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں، کبھی دین اسلام پر حملہ کرتے ہیں، تو کبھی مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے نظر آتے ہیں، کبھی

ان کی عبادات اور عبادت گاہوں کا مذاق اڑاتے ہیں، تو کبھی ان کے نبی کی توہین و تحقیر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ ملک دشمن فرقہ پرست عناصر کا ہاتھ اس قسم کی ناپاک حرکات کے پیچھے کام کرتا ہے اور وہ ملک کو امن وامان کا گہوارا بنانے کے بجائے شر وفساد کی آماجگاہ بنانا چاہتے ہیں اور مسلمانوں میں اشتعال پیدا کر کے ان کے جذبات سے کھیلنا چاہتے ہیں اور جب اس پر مسلم نوجوان بھڑک کر کوئی جذباتی کام کر بیٹھیں، تو ان کو دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف کارروائی کرنا اور ان کی زندگیوں سے کھیلنا ان کا مقصود اعظم ہوتا ہے۔

ہم حکومت سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کب تک یہ گستاخیاں؟ کیا اس کا کوئی قانون نہیں بننا چاہیے؛ جو کملیش تیواری جیسے ناپاک وملعون لوگوں کو لگام دے سکے اور وہ اپنی عبرت ناک سزا پائیں اور پھر کوئی ایسی حرکت نہ کر سکے؟

ہم یہاں اس بات کا ظہار کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں ایک طویل عرصے سے ان مسلم دشمن عناصر اور ملک دشمن عناصر کی جانب سے بڑے بڑے مظالم برداشت کرتا چلا آرہا ہے، کبھی ان کی طرف سے منصوبہ بند طریقے پر مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی، ہم نے اس کو برداشت کیا، کبھی منظّم سازش کے تحت مسلمانوں کی جانوں اور مالوں کو نقصان پہنچایا گیا، یہ بھی برداشت کیا گیا، ان کی دکانوں اور تجارتوں کو برباد کیا گیا، اس کو برداشت کیا جا رہا ہے، کبھی ان کو ان کے ملکی حقوق سے محروم رکھنے کی سازش کی گئی، مسلمان ان تمام چیزوں کو یہاں سہتا اور برداشت کرتا چلا آرہا ہے؛ اس لیے کہ مسلمان کی نظر میں اس کی جان ہو یا مال، اولاد یا خاندان، سب فانی ہیں، اس کی اصل نگاہ آخرت پر ہوتی ہے، وہ اس دنیا کو اپنا مسکن نہیں آخرت کو اپنا وطن ومسکن سمجھتا ہے؛ لیکن مسلمان-کوئی ادنی سے ادنی مسلمان-کبھی اس بات کو برداشت کرنے ایک لمحے کے لیے بھی تیار نہیں اور کسی بھی قیمت پر تیار نہیں کہ اس کے دین پر کوئی حرف آئے یا اس کے نبی کے خلاف کوئی زبان کھولے اور ان کی توہین کرے۔

اسی لیے مسلمان اپنے پیغمبر کی توہین وتحقیر پر اگر ایک جانب غم ودکھ کا شکار ہوتا ہے، تو دوسری جانب وہ اپنے جذبات عشق ومحبت کے سلسلے انتہائی حساس ہوتا ہے اور وہ اس کو چھپا کر نہیں رکھ سکتا؛ وبے تحاشا اپنے جذبات عشق ومحبت کا اظہار اور اپنے نبی کے ساتھ اپنی وارفتگی ودیوانگی کا مظاہرہ کیے بغیر رہ نہیں سکتا؛ بل کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنا ایک مذہبی ودینی فریضہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے نبی سے اپنی اس وارفتگی ودیوانگی کا اظہار کرے، خواہ اسے اس راہ میں بڑی سے بڑی کوئی قیمت ادا کرنی پڑے، خواہ وہ قیمت اپنی جان ہو یا اولاد یا مال وجائیداد، وہ اس کو اپنے لیے باعث فخر واعزاز سمجھتا ہے کہ وہ اور اس کی نسل ومال نبی پر قربان ہوگئی۔

ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑے شرف واعزاز کی کیا بات ہوسکتی ہے کہ اسے عشق رسول کا یہ مقام حاصل ہو جائے کہ وہ اپنے نبی پر قربان ہو جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ حضرات صحابہ کی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کیسی تھی؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ: خدا کی قسم! ہمیں آپ ہمارے مالوں سے، اولاد سے، ماں باپ سے اور سخت گرمی کی دوپہر میں ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب تھے۔ (شفاء:۲/۲۲)

ایک انصاری خاتون کے والد، بیٹے اور بھائی تینوں غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے اور اس کو کسی نے اس کی خبر دی؛ مگر وہ یہ معلوم کرنے کو بے قرار تھی کہ اللہ کے نبی کا کیا حال ہے؟ جب اس کو بتایا گیا کہ تیرا بیٹا باپ اور بھائی تینوں شہید ہو گئے، تو وہ کہنے لگی کہ مجھے یہ تو بتاؤ کہ آپ کا کیا حال ہے؟ جب اسے آپ کی خیریت کی خبر دی گئی، تو کہنے لگی کہ مجھے ذرا آپ کا چہرہ دکھا دو، لوگوں نے زیارت کرادی، تو اس نے کہا: "**کل مصیبة بعدک جلل**" (آپ کے بعد ہر مصیبت کا برداشت کرنا آسان ہے)

(الروض الانف:۳/۲۸۵، شفاء قاضی عیاض:۲/۲۳، سیرت ابن ہشام:۴/۵۰) ایک خاتون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ میرے لیے

رسول اللہ ﷺ کی قبر کو کھول دیجیے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کھول دیا، تو وہ خاتون قبر اطہر کو دیکھ کر روتی رہیں، یہاں تک کہ روتے روتے انتقال کر گئیں۔

(شفاء: ۲/۲۳)

حضرت زید بن الدثنہ رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ نے قید کر لیا تھا اور قتل کرنے کے ارادے سے حرم کے باہر لائے، تو ابوسفیان جو اس وقت حالت کفر میں تھے، انھوں نے زید سے پوچھا کہ میں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ آج یہاں تمہاری جگہ محمد ہوتے اور ان کو قتل کر دیا جاتا اور تم اپنے اہل عیال میں رہتے؟ اس پر حضرت زید نے جواب دیا کہ میں تو یہ بھی نہیں پسند کرتا کہ محمد ﷺ کو ان کی اپنی جگہ میں بھی کوئی کانٹا چبھ جائے اور میں اپنی اہل عیال میں بیٹھا رہوں۔

اس پر ابوسفیان نے کہا:

”مارأیت من الناس أحدا یحب أحدا کحب أصحاب محمد محمداً“

(شفاء قاضی عیاض: ۲/۲۳، الروض الانف: ۳/۳۶۵، سیرت حلبیہ: ۳/۱۶۴، سیرت ابن کثیر: ۳/۱۲۸)

(میں نے لوگوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ کوئی کسی سے ایسی محبت کرتا ہو جیسی محمد کے اصحاب محمد سے محبت کرتے ہیں۔)

یہ چند واقعات ہیں، جن سے صحابہ کی رسول اللہ ﷺ سے محبت؛ بل کہ شدید ترین محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور تاریخ کے صفحات میں ایسے سیکڑوں واقعات محفوظ ہیں، جن سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان کی سب سے بڑی قیمتی چیز وہ حب الٰہی وحب نبوی ہے، وہ اسی کے لیے جیتا اور اسی کے لیے مرتا ہے۔

بہر حال یہ بات ہمیں واضح کرنی ہے کہ آج کا مسلمان بھی الحمد للہ اعمال وعبادات میں ممکن ہے کہ کچھ کوتاہ واقع ہوا ہو؛ مگر عشق رسول کی وہ شدید کیفیت وحیرت انگیز حالت آج بھی اس کے خون اور رگ وریشے میں پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے؛ لہذا مسلمان کے

لیے یہ نا قابل برداشت ہے کہ کوئی ان کے نبی کی توہین کرے۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اور ان کے نبی اور دین اسلام کے خلاف بکنے والے برابر بکتے آ رہے ہیں اور ایسے متعدد واقعات تاریخ کے صفحات پر بہ طور داغ ثبت ہیں، کبھی نبی کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کوئی کاٹون بناتا ہے، کبھی کوئی آپ کی پاک سیرت کو داغدار کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے؛ مگر اہل انصاف غور کریں کہ کیا کبھی مسلمانوں کی جانب سے کسی بھی مذہب کی محترم شخصیات کی توہین وتحقیر میں ایک لفظ بھی کبھی سنا گیا؟ مسلمان کتنا بھی گیا گزرا ہو؛ مگر وہ محترم شخصیات کا احترام اپنا فریضہ جانتا ہے اور اس کو قرآن میں یہی حکم بھی دیا گیا کہ دوسروں کے معبودوں کو بھی برا بھلا نہ کہو ہو؛ مگر حیرت ہے کہ جب مسلمان کسی کی توہین نہیں کرتے اور ان کے سب سے مقدس ومحبوب نبی کی توہین کرنے والے توہین کرتے ہیں اور مسلمان اس پر اپنے غم وغصے کا اظہار کرتے ہیں، تو ان کو اسی پر دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے اور جنھوں نے توہین کی اور غم وغصہ دلایا، ان کے ساتھ حکومتیں بھی رواداری کا معاملہ کرتی ہیں۔ یہاں غالب کا شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ تو غالب نے شاید اپنے دور کے حالات کے پیش نظر کہا تھا کہ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا؛ مگر اب تو حالات بدل چکے ہیں؛ اس لیے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی رحمہ اللہ نے کہا کہ میں اس شعر میں ترمیم کرتا ہوں اور یوں کہتا ہوں کہ

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو پا جاتے ہیں انعام

لہذا حکومت کو چاہیے کہ وہ کملیش ہو یا کوئی اور ہو، مذہبی شخصیات کی توہین وتذلیل کرنے والوں کے لیے سخت سے سخت سزا جاری کرے، جو سبھی کے لیے باعث عبرت ہو اور اس سلسلے میں کسی قسم کی رورعایت سے کام نہ لے، ورنہ اس قسم کی ذہنیت کے لوگ ملک کی سالمیت کے

بہت بڑا خطرہ بن سکتے ہیں، ملک میں انتشار وافتراق، فساد ونزاع کی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔

کملیش ملعون کی اس ناپاک حرکت پر تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل زخمی ومجروح ہیں ؛ بالخصوص مسلمانان ہند کو اس سے جو ٹھیس و دکھ پہنچا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ پورے ملک میں اس کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے اور ہو رہے ہیں، ہر صوبے اور ہر ضلع اور ہر شہر میں اس کے خلاف اپنے غم وغصے کا مسلمان اظہار کر رہے ہیں، بنگلور میں بھی حضرت امیر شریعت مفتی اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کی زیر سرپرستی عیدگاہ قدوس صاحب میں تمام مکاتب فکر کے رہنماؤں کے اتحاد کے ساتھ ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا، جس میں لاکھوں مسلمانوں کی بلاتفریق مسلک جمع ہو کر بیک آواز حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ کملیش تیواری کو سخت سے سخت اور عبرت ناک سزا دے اور اس اتحاد نے یہ بھی واضح کر دیا کہ مسلمانوں میں اگرچہ بعض امور میں مسلکی ونظریاتی اختلافات موجود ہیں؛ لیکن جہاں تک حضرت محمد کی مقدس شخصیت کا تعلق ہے، اس میں سارے مسلمان ایک ہیں اور ایک رہیں گے اور آپ کے خلاف کوئی یاوہ گوئی وہرزہ سرائی کرے، تو سارے مسلمان ایک ہو کر اس کے خلاف کارروائی کریں گے۔ اس سے حکومت کو مسلمانوں کے احساسات و جذبات کو پڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور جلد سے جلد اس سلسلے میں کوئی ایسا اقدام کرنا چاہیے، جس سے مسلمانوں کے ان بھڑکے ہوئے جذبات کی تسلی کا سامان ہو۔

میں اخیر میں اہل اسلام کی خدمات میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ، آپ کے اخلاق وکردار، آپ کی پاکیزگی وطہارت، آپ کا اللہ تعالی سے تعلق ونسبت، آپ کی لوگوں کے ساتھ ہمدردی وغمخواری، آپ کی انسانیت دوستی وانسانیت نوازی وغیرہ کے اسباق کا بڑی گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کریں اور دوسروں کو بھی ان امور سے روشناس کرائیں اور آپ کی سیرت کو دنیا میں عام کرنے اور پھیلانے کی کشش کریں۔

قوت عشق سے پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے

مولانا انظر شاہ کی اچانک گرفتاری
ہندوستانی مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ

۶/ جنوری کی رات ہندوستان کے معروف ومشہور عالم دین اور بے باک مقرر حضرت مولانا انظر شاہ قاسمی زید مجدہ کو دہلی پولیس نے ممنوعہ تنظیم ''القاعدہ'' سے تعلقات اور اس کے لیے کام کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے پھر ایک بار ہندوستانی مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مرکزی حکومت اپنی کارروائیوں میں انتہائی متعصّبانہ کردار ادا کر رہی ہے اور وہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے سلسلے میں مخلص نہیں ہے۔

مولانا انظر شاہ صاحب کی یہ گرفتاری جس انداز سے ہوئی ہے، اس کو علما اور دانشوران ملک کے طبقے میں غیر قانونی اور مسلمانوں بالخصوص ان کے علما کو بدنام کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش سمجھا جا رہا ہے اور یہ بھی کہ حکومت ان لوگوں کا آلہ کار بنی ہوئی ہے، جو یہاں ملک کی سلمیت کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں اور آئے دن ایک نہ ایک سازش کر کے ملک کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا انظر شاہ قاسمی سے پہلے بھی متعدد اہل علم واہل صلاح کے ساتھ یہاں اس طرح کے واقعات پیش آ چکے ہیں اور اسی طرح کے الزامات لگا کر ان کے کیریئر کو مخدوش کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے؛ نیز ان ہی لوگوں کی سازش سے بہت سے مسلم نوجوانوں کو کبھی القاعدہ سے تعلق کے الزام میں اور کبھی داعش سے تعلق کے الزام میں گرفتار کر کے جیلوں کو بھرنے کا ناپاک سلسلہ جاری ہے، جن میں بہت سے پڑھے لکھے اور مختلف ڈگریوں کے حامل نوجوان لوگ بھی شامل ہیں، جس کے نتیجے میں ان معصوم لوگوں کا مستقبل ویران و

تاریک ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ الحمد للہ تفتیش و تحقیق کے بعد بالآخر ہمارے علما کی بے گناہی ہی ثابت ہوئی اور ہوتی رہی ہے اور ان کی باعزت رہائیاں بھی ہوئی ہیں، جس سے صاف و واضح طریقے پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے اور ثابت ہونے کے لیے کافی شہادت بھی ہے کہ یہ علما و اہل صلاح کبھی اپنے اس ملک سے غداری و بے وفائی نہیں کر سکتے: کیوں کہ وہ تو دن رات وفاداری و حب الوطنی کا سبق ساری دنیا کو پڑھاتے ہیں، تو وہ خود کیوں نہ اس پر عمل کریں گے؟ اور یہی تو وہ علما ہیں، جنھوں نے اس ملک کو پردیسی قوتوں و طاقتوں سے اور سامراجی تسلط سے آزاد کرانے اپنی جانوں تک کی قربانیاں پیش کی تھیں اور اس ملک کے گیسوؤں کو سنوارنے کے لیے جان و مال لگا دیا تھا۔

مدراس دینیہ اور ان کے پروردہ علمائے کرام کا رول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ سب کو حق و حق گوئی کا سبق دیتے، اخلاق و کردار کی پاکیزگی کی تعلیم دیتے، صداقت و سچائی، امانت و دیانت، راستی و راست بازی، مخلوق خدا سے ہمدردی و غمخواری، انسانوں کی مدد و نصرت، آپسی امن و آشتی اور پیار و محبت، دلوں کی صفائی و ستھرائی کا درس دیتے چلے آئے ہیں اور یہی وہ طبقہ ہے، جس کی اس روش و طرز و انداز نے اس ملک کو مختلف مذاہب کا گہوارے بنے رہنے میں مدد کی اور تمام مذاہب کے لوگ یہاں شیر و شکر ہو کر رہتے چلے آئے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہمارے اس ملک کی اس پرسکون فضا میں خلل اندازی کرنے اور اس کی اس ساکھ کو داغدار کرنے کی کوشش کرنے والے امن و آشتی کے دشمنوں نے امن و آشتی کے داعیوں کو داغدار بنانے کی کوشش شروع کر دی ہے اور ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' والا قصہ ہے، جو ہمارے اس ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہونے کے ساتھ ساتھ غیر ہندوستانی اقوام میں اس ملک کی ساکھ کو داغدار بنانے کے مترادف ہے۔

مولانا انظر شاہ صاحب قاسمی ایک حق گو عالم دین ہیں، جن کا مزاج و مذاق شروع ہی سے یہ ہے کہ وہ اپنے خطبات و بیانات کے ذریعے لوگوں کو دین و اخلاق کی تعلیم دینے، ان

کے عقائد کو مضبوط کرنے، ان کے اندر سے اخلاقی ومعاشرتی بے راہ رویوں کو ختم کرنے اور بالخصوص نوجوانوں میں پائی جانے والی گمراہیوں اور بے اصولیوں کو ختم کرنے کی جدوجہد و کوشش میں بلا خوف لومۃ لائم لگے ہوئے ہیں۔ ایسے عالم دین کو ملکی بغاوت کا الزام دینا اور القاعدہ سے منسوب کرتے ہوئے اس کی شخصیت کو مجروح کرنا ہمارا احساس ہے کہ ایک سازش ہی کے زیر اثر ہوسکتا ہے اور ایک مسلمان اس ملک میں رہتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کیا یہاں ہماری اور ہمارے علماء کی کوئی عزت و وقار نہیں ہے؟ کیا ہمیں اس ملک میں مجرموں کی طرح زندگی کرنا ہے؟ کیا ہمارا اس ملک میں کوئی حصہ نہیں؟

پھر مولانا کو جس انداز سے گرفتار کیا گیا ہے، اس سے یہاں کے اہل علم و دانش کے علاوہ عام اہل اسلام کے درمیان بھی ایک سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی؛ کیوں کہ بنگلور کی پولیس کے توسط کے بغیر دہلی پولیس نے مولانا کو اپنی حراست میں لیا تھا؛ جب کہ خود یہاں کی پولیس کے پاس کوئی ایک ادنی سے شبہ وشک کی بات بھی مولانا کے تعلق سے پائی نہیں جاتی۔

ایک اور بات جو تشویش کو بڑھاتی ہے، وہ یہ ہے کہ میڈیا کا رول اس قسم کے واقعات میں یہ ہوتا ہے کہ وہ پولیس کے شک وشبہ پر گرفتاری کو اور پولیس کے الزام ہی کو جرم بنا کر پیش کردیتی ہے اور ملزم کو مجرم کے کٹھرے میں کھڑا کردیتی ہے اور اس کی تشہیر میں جان وتن کی بازی لگا دیتی ہے، یہاں تک کہ عدالتی فیصلے سے پہلے ہی محض الزام کو ایک حقیقت بنا کر شخصیت کو مجروح کردیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب مولانا انظر شاہ ہوں یا کوئی اور ہو، ان پر کیے گئے شک کا اور لگائے گئے الزام کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے اور ابھی تفتیشی و تحقیقی مراحل سے گزارا جانا باقی ہے اور عدالت کا کسی فیصلہ پر پہنچنے کے لیے وقت درکار ہے، تو اس سے پہلے کسی ملزم کو مجرم بنا کر پیش کردینے کا کیا جواز ہے؟ کیا اس سے عدالت عالیہ کی شان میں تنقیص لازم نہیں آتی کہ عدالت کے فیصلے سے پہلے ہی یہ لوگ فیصلہ صادر کردیتے ہیں؟

لہٰذا ہم حکومت سے یہ مطالبہ کرنا چاہتے ہیں:

(۱) حکومت کو سمجھنا چاہیے کہ یہاں کے علما اس ملک کا اثاثہ اور سرمایہ ہیں، اس ملک کی

رونق ہیں، ان کی عزت ووقار ملک کا وقار وعزت ہے؛ لہذا ان کی حفاظت خود حکومت کی ذمے داری ہے اور یہ بھی کہ وہ کسی کو یہاں اس بات کی اجازت نہ دے کہ وہ علمائے کرام کی ساکھ کو خراب کرنے و بگاڑنے والا کوئی عمل کریں۔

(۲) شک و شبہ کو بنیاد بناتے ہوئے گرفتاری کی صورت میں بلا تحقیق و تفتیش علماء یا مسلمانوں کے سر جرم کو تھوپ دینا عدل و انصاف کے تقاضوں کی پامالی کے ساتھ ساتھ انسانیت سے کھلواڑ ہے؛ مگر یہاں عموماً یہی دیکھا جاتا ہے کہ محض شک کی بنیاد پر مجرم بنادیا جاتا ہے؛ لہذا اہل حکومت کو بہ نظر انصاف اس سلسلے میں توجہ دینا چاہیے

(۳) اگر کسی تفتیشی مرحلے کی ضرورت کے لیے ایسی کوئی ضرورت پیش آئے، تو علما کے وقار کا خیال رکھا جائے اور جب تک مکمل تفتیش ہو کر عدالت کا فیصلہ نہ ہو جائے کسی کی شخصیت کو مجروح ہونے نہ دیا جائے؛ مگر افسوس ہے کہ مولانا انظر شاہ ہو یا کوئی اور، جب کسی کو پولیس گرفتار کرتی ہے، تو عدالت کے فیصلے سے پہلے ہی ملزم کو مجرم قرار دے دیا جاتا ہے اور میڈیا کا رول اس سلسلے میں انتہائی غیر ذمے دارانہ ہوتا ہے۔

مولانا کی گرفتاری کے بعد نہ صرف شہر بنگلور کے؛ بل کہ ملک بھر کے علما اور علما کے ساتھ اہل دانش اور عوام سبھی نے اس واقعے پر رنج و غم کا اظہار کیا اور ہر سنجیدہ ذہن انسان کو اس واقعے نے فکر مند کر دیا اور علما و دانشوران نے اس سلسلے میں مولانا کی رہائی کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کا کام شروع کر دیا ہے، چیف منسٹر سے ملاقات بھی کی جا چکی ہے۔ اور اس سلسلے میں خاص طور پر حضرت اقدس مولانا ارشد مدنی دامت برکاتہم کی جانب سے جو پیش رفت ہو رہی ہے، وہ قابل تحسین ہے اور یہ معلوم ہے کہ حضرت والا کی جانب سے بے گناہوں کی رہائی کے بارے میں قانونی چارہ جوئی کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس کے مفید نتائج سامنے آتے رہتے ہیں۔ اللہ کرے کہ ان اکابر کا سایہ امت پر تادیر قائم فرما کر استفادے کی توفیق دے۔

اخیر میں میں مولانا انظر شاہ صاحب کے متعلقین سے بھی اور ان کے متعلقین و منسلکین

سے بھی یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا انظر شاہ صاحب کی گرفتاری کے اس واقعے سے جس قدر آپ کو دکھ و درد ہوا ہے، ہمیں بھی اس سے کچھ کم نہیں ہوا ہے، اور ہمارا اندازہ ہے کہ ان کی خدمات اور ان کی حق گوئی کا صلہ اللہ تعالی ضرور ان کو عطا کرے گا اور امید ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ رہا ہو جائیں گے؛ بل کہ باعزت رہا ہوں گے اور ان کے حق میں یہ مصیبت و پریشانی دراصل اللہ کی جانب سے ان کے درجات کی بلندی کا ایک انتظام ہے۔

ہم اخیر میں دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کو جلد سے جلد باعزت

طریقے پر رہائی عطا فرمائے اور ان غیر متوقع حالات کو اللہ تعالی ان کے حق میں اور ان کے

متعلقین کے حق میں باعث ترقی درجات بنادے۔

☆☆☆

مسلمانان ہند کی حب الوطنی

فرقہ پرست تنظیموں کی فرقہ پرستی نے جو شوشے ملک بھر میں اڑا رکھے ہیں؛ تا کہ یہاں فرقہ بندیاں قائم رہیں؛ بل کہ جنم لیتی رہیں اور ہندوستان کی ساکھ کو ٹھیس پہنچتی رہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانان ہند کو دیش بھکتی نہ ہونے کا طعنہ بھی دیتی اور ان کی حب الوطنی کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ چند دنوں قبل ایک ایسی ہی تنظیم کے سربراہ نے اہل مدارس اور مسلمانان ہند کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مدارس میں دیش بھکتی بننے کی تعلیم دی جائے اور وہ دیش بھکتی بنیں، جس کو پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی اور وہ مقولہ ذہن میں تازہ ہو گیا جو کہا جاتا ہے کہ ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے''۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند نے شروع سے اس ملک کو اپنا ملک اور وطن سمجھ کر ہمیشہ سے اس کی ہمہ جہتی خدمات کو اپنے لیے باعث اعزاز وافتخار سمجھا ہے اور وہ برابر اس کے لیے کام کرتے چلے آئے ہیں۔ تاریخ کے صفحات اس سے پُر ہیں اور پوری توانائیوں کے ساتھ اور صفائی و وضاحت کے ساتھ یہ شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانان ہند نے اس ملک سے وفا شعاری وحب الوطنی کا ایک ایسا نقش دائم قائم کیا ہے، جو یہاں کے ذرہ ذرہ پر ثبت اور چپے چپے سے عیاں ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس ملک میں علمی وثقافتی اور تہذیبی وتمدنی اور تعمیری وتخلیقی کارناموں کا ایک طویل باب وسلسلہ ہے، جو مسلمانانِ ہند کا ایک عظیم ونایاب تحفہ وعطیہ ہے، جس نے اس ملک کو اقوام عالم میں ایک مقام امتیاز دیا اور اس کو علمی وتمدنی لحاظ سے ان کی نظروں میں استناد واعتماد کا درجہ عطا کیا۔ اس کے علاوہ ملک کی آزادی کے لیے اور اس کو

سامراجی طاقتوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے ابتدائی تحریک سے لیکر اس کی آزادی تک کی پوری تاریخ اٹھا کر پڑھ جائیے، تاریخ کی سچائیاں اور صداقتیں علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں کہ ان تمام تر تحریکوں میں از اول تا آخر کوئی پیش پیش رہے، تو وہ مسلمانان ہند ہیں۔

کیا کوئی تاریخی شہادت ایسی بھی پیش کی جاسکتی ہے، جو مسلمانان ہند کو اس میدان میں پیچھے رہ جانے اور کسی موقعے پر غیروں سے ساز باز کر لینے اور اس ملک کی وفاداری کے خلاف کوئی عمل واقدام کی نشاندہی کرتی ہو؟ قسم بہ خدا ایسی کوئی شہادت پیش نہیں کی جاسکتی۔

یہ مسلمانوں کی حب الوطنی کی شہادتیں و گواہیاں ہیں، جن کو کوئی فراموش نہیں کر سکتا ؛ یہاں کے چپے چپے پر مسلمانوں کی تعمیری فکر اور ترقی پسند ذہنیت کی چھاپ دکھائی دیتی ہے اور بقول مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے، یہاں کے مسلمان:

> ’’نہ صرف ملک کے آزاد باعزت شہری اور قدیم باشندے ہیں، بلکہ اس عظیم ملک کے معمار ہیں اور ان قوموں میں جنھوں نے اس ملک کی خدمت کی، اس کا پایہ بلند کیا، اس کے تمدن اور ذہن کو نئی زندگی اور وسعت عطا کی، اس کو نئی دینی واخلاقی قدروں سے روشناس کیا اور اس کے چمن کو نئے سلیقے سے سنوارا، ان کا پایہ سب سے بلند ہے۔ یہاں کی خاک کے ذرے ذرہ پر ان کی عظمت کا نقش اور اس ملک کے چپے چپے پر ان کی ذہانت، ان کے خلوص اور ان کے ذوق تعمیر اور جذبۂ خدمت کی یادگاریں ہیں، یہاں کی زندی اور تہذیب کا ہر گوشہ ان کے ذوق لطیف اور مذاق سلیم کی شہادت دیتا ہے۔
> (ہندوستانی مسلمان-ایک تاریخی جائزہ:۱۴)

مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک طبقہ یہاں مسلسل اس بات کی کوشش میں ہے کہ تاریخ کے ان صفحات کو مٹا دیا جائے اور اس کے لیے منظّم سازش تیار کی جارہی ہے؛ تاکہ یہاں کی جدید نسلوں کو تاریخ کی یہ سچائیاں معلوم ہی نہ ہوسکیں اور ان کو یہ باور کرایا جائے کہ مسلمان یہاں کے غیر ملکی باشندے ہیں، ان کا اس ملک میں کچھ نہیں ہے، انھوں نے یہاں

کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، یہاں کے علمی وثقافتی میدان میں، یا تہذیبی وتمدنی ابواب میں ان کی کوئی قابل ذکر خدمت نہیں، ملک کی تعمیر وترقی میں ان کا کوئی نمایاں حصہ نہیں، ان کو اس ملک کے تحفظ و بقا، اس کی خدمت ومحبت، اس کے تعلیمی وثقافتی سلسلے سے کوئی سروکار نہیں ، ملک کی آزادی کے لیے چلنے والے عظیم وطویل جدوجہد میں ان کی حیثیت محض ایک تماشائی کی ہے۔

ایسے ہی لوگ یہ آواز بھی لگاتے ہیں کہ مسلمان حب الوطنی کا سبق سیکھیں، جب کہ ہندوستانی مسلمانوں کی حب الوطنی اس قدر واضح ہے کہ اس کو واضح کرنے کی کوشش ''سعی لا حاصل'' معلوم ہوتی ہے؛ حتی کہ بعض لوگوں نے کسی کے اس حکیمانہ مقولے: ''حب الوطن من الایمان'' کو حدیث کا عنوان دے دیا؛ حالاں کہ یہ حدیث رسول نہیں ہے؛ بل کہ کسی کا ایک حکیمانہ مقولہ ہے، جس کا حاصل احقر کے نزدیک یہ ہے کہ وطن سے محبت ایمان والوں کا طریقہ ہے؛ لہذا وہ اپنے وطن سے غداری کرے، یہ اس کے ایمان کے خلاف ہے، اس کا ایمان اسے اپنے وطن کی محبت سکھاتا ہے نہ کہ غداری و بغاوت؛ لہذا کوئی بھی شخص صحیح معنی میں مسلمان ہو کر اپنے ملک سے غداری و بغاوت کرے، یہ ناممکن ہے؛ کیوں کہ وہ اپنے ملک سے محبت کو اپنے ایمان کا تقاضا سمجھتا ہے۔

الغرض یہ بات اپنی جگہ واضح و ثابت ہے کہ ہندی مسلمان ہمیشہ سے اس ملک کی وفاداری اور حب الوطنی میں یہاں کی کسی قوم سے پیچھے نہیں؛ بل کہ وہ اس بات کو باعث اعزاز سمجھتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔

ہمارے کرنے کا ایک کام یہ بھی ہے!

اسلام کی تعلیمات وہدایات میں جو وسعت وہمہ گیری پائی جاتی ہے،اس کے لحاظ سے یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام ایک جامع ومکمل نظامِ حیات ہے اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ اسلام نے اس کو نظر انداز کیا ہو یا اس کو غیر اہم قرار دیکر سرد خانے کے حوالے کر دیا ہو؛ بل کہ اسلام نے ہمہ جہتی پروگرام اور ہمہ گیر نظام پیش کیا ہے،جس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو ایک خاص انداز اور خاص ترتیب کے ساتھ ایک لڑی میں پُرو دیا گیا ہے ۔ایمانیات ، عبادات ، معاملات، معاشرات ، اخلاقیات ، سیاسیات اور ان کے ذیلی ابواب اور شعبے تمام کے تمام اسلام کا موضوع بن کر اس کے زیر استعمال لائے گئے ہیں۔

اُنھیں شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ ’’رفاہی وفلاحی خدمات‘‘ کا بھی ہے،جس کو اسلام کے پیش کردہ ’’نظامِ حیات‘‘میں بڑی اہمیت دی گئی ہے اور یہ دراصل تمام آسمانی مذاہب کا متفقہ نظریہ رہا ہے، جو بعد میں دین اسلام کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اسے منزل عروج حاصل ہوئی ؛مگر ایسا لگتا ہے کہ آج اہل اسلام میں سے بیشتر لوگ اس اہم شعبے کو وہ اہمیت نہیں دیتے ، جو فی الواقع اس کو ملنا چاہیے اور اس سے انتہائی بے اعتنائی کا برتاؤ کیا جاتا ہے، گویا ایسا کہ اسلام میں اس کا کوئی مقام ہی نہیں ؛ حالاں کہ اس شعبے کو متعدد وجوہ سے بڑی ہی اہمیت حاصل ہے:

(۱)ایک تو اس وجہ سے کہ یہ شعبہ درحقیقت خدمت انسانیت سے متعلق ہے، جو اسلام کے اندر’’حقوق العباد‘‘ کا شعبہ کہلاتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ اسلام میں ’’حقوق العباد‘‘ کے شعبے کو بڑا درجہ حاصل ہے؛حتی کہ یہ کہا گیا کہ ’’حقوق اللہ‘‘ سے بڑھ کر ’’حقوق العباد‘‘ کا درجہ ہے۔

(۲) دوسرے اس وجہ سے کہ اس شعبے کی خدمات بلا لحاظ مذہب وملت تمام انسانوں کے لیے وقف ہونے کی وجہ سے انسانوں کے مختلف طبقات کے سامنے آتی ہیں، جس سے ان تمام لوگوں کو اہل اسلام کی انسانیت نوازی وانسانیت دوستی، تمام لوگوں سے ہمدردی وغم خواری اور ان کے ساتھ عمدہ وبہتر سلوک ورویہ، اپنے اور پرائے لوگوں کے ساتھ یکساں برتاؤ وغیرہ کا پتہ چلتا ہے، جس سے تمام لوگوں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں سے دوستی پیدا ہوتی اور وہ اسلام کے قریب ہو سکتے ہیں۔

(۳) امت مسلمہ کا ایک اہم اور بہت اہم سبق ''دعوت وتبلیغ'' ہے اور اس کو خیر امت کا خطاب اسی ذمے داری کے نباہنے پر عطا ہوا ہے؛ لہذا سب مسلمانوں کو یہ کام تو کرنا ہی ہے؛ مگر یہ بھی معلوم کیجیے کہ اسلام نے ''دعوت'' سے پہلے ''خدمت'' کو رکھا ہے؛ کیوں کہ خدمت ذریعہ ووسیلہ ہے دعوت کا؛ لہذا اس لحاظ سے بھی یہ شعبہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ان تمام وجوہ سے اسلام میں فلاحی وسماجی ورفاہی خدمات کی اہمیت تسلیم کی گئی اور اس کی متعدد صورتوں اور شکلوں کو ''الاہم فالاہم'' کے اصول پر جاری ونافذ کیا گیا ہے۔

اس کام کی اہمیت اگر چہ کہ ہر دور میں مسلم رہی؛ لیکن موجودہ دور میں اس شعبے کی اہمیت کچھ زیادہ ہو گئی ہے؛ کیوں کہ آج اسلام دشمن طاقتوں نے مختلف ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اسلام کی اور مسلمانوں کی شبیہ کو جس طرح مسخ کرنے کی کوشش کی ہے، اس نے عام لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کو ایک دہشت گردانہ مذہب کا تصور دے دیا ہے اور یہ باور کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے کہ مسلم قوم صرف ملک مخالف کاموں اور تحریکوں کو کمک پہنچا رہی ہے۔ان لوگوں کا جواب یہی ہے کہ ہمارا جو کام ہے، وہ کام ہم پوری قوت کے ساتھ انجام دینا شروع کر دیں اور ہمارا کام جہاں اللہ کی عبادت ہے، وہیں مخلوق خدا کی خدمت بھی ہے ،جس سے ہر کس وناکس کے سامنے مسلمانوں کی صحیح تصویر آئے گی اور وہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ فرقہ پرستوں اور سیاسی عناصر نے جو پروپگنڈہ کیا تھا کہ مسلمان دہشت گرد ہیں، ان

کی کیا حیثیت ہے اور ان کی باتوں میں کہاں تک سچائی ہے؟

الغرض موجودہ دور میں بالخصوص اس کی بڑی اہمیت ہے کہ فلاحی وسماجی خدمات کی رو سے نمایاں سرگرمیاں اہل اسلام کی جانب سے سرانجام دی جائیں۔

قرآن کریم اور سیرت نبویہ کا مطالعہ کیجیے، تو یہ دکھائی دے گا کہ اسلام ان کاموں کو کس قدر اہمیت دیتا ہے؟ یہاں صرف چند اشارات اس سلسلے کے پیش کیے جاتے ہیں:

ایک جگہ اللہ تعالی نے متقی ونیک لوگوں کی صفات کا جو نقشہ بیان کیا ہے، اس میں ایمان وعبادات کے ساتھ ان فلاحی وملی خدمات کا تذکرہ بھی کیا ہے؛ چناں چہ فرمایا:

﴿لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ، وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ، وَ الۡمَلٰٓئِكَةِ، وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ، وَ اٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى، وَالۡيَتٰمٰى، وَالۡمَسٰكِيۡنَ ، وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ، وَ السَّآئِلِيۡنَ ، وَ فِى الرِّقَابِ ، وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ ، وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ، وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا، وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ ، وَ الضَّرَّآءِ ، وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

(بھلائی کا کام یہی نہیں کہ مشرق یا مغرب کی جانب رخ کرلیا کرو؛ بل کہ بھلائی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں پر اور اس کے نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت میں قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سائلوں اور غلاموں کو چھڑانے میں مال خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور زکوۃ دے اور یہ لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں، جب وہ کسی کام کا وعدہ کرلیں اور تنگ دستی، بیماری میں اور جنگ کے موقعے پر مستقل مزاج ہوں، یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو تقوی شعار ہیں۔)

غور کیا جائے کہ اس طویل آیت کریمہ میں بھلائی ونیکی کا ایک جامع و وسیع تصور پیش کیا گیا ہے، جس میں ایمان وعبادات کے ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں کے لیے اور غلاموں کو چھڑانے کے سلسلے میں مال خرچ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے؛ نیز اخلاقی امور میں سے ایفائے عہد اور مصائب وآفات کی پیش آنے پر صبر کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آیت کے اخیر میں ان تمام امور کو صدق وتقوی سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام صرف ایمان وعبادات ہی تک محدود نہیں ہیں؛ بل کہ وہ اس سے وسیع اپنا دائرۂ کار رکھتا ہے، جس میں اخلاقی ومعاشرتی تعلیمات بھی داخل ہیں۔

احادیث شریفہ میں بھی اس کے متعلق ہدایات وتعلیمات موجود ہیں اور کثرت کے ساتھ موجود ہیں؛ اس لیے ان کا احصاء واحاطہ بھی مشکل ہے، بالخصوص اس مختصر سے اداریے میں تو ناممکن ہے؛ لہذا یہاں صرف دو چار احادیث شریفہ پر کفایت کی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ ضروری ہے، عرض کیا گیا کہ اگر وہ کچھ نہ پائے، تو کیا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ: وہ اپنے ہاتھ سے کمائے اور خود کو بھی نفع پہنچائے اور دوسروں کو صدقہ دے۔ کہا گیا کہ اگر اسے اس کی بھی طاقت نہ ہو، تو کیا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ: فریادی یا مظلوم اور حاجت مند کی امداد کرے۔ کسی نے عرض کیا کہ اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے تو؟ آپ نے فرمایا کہ: نیکی و بھلائی کی بات لوگوں کو بتائے۔ عرض کیا گیا کہ اگر یہ بھی نہ کر پائے تو؟ آپ نے فرمایا کہ: دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے باز رہے۔ یہی اس کے حق میں صدقہ ہوگا۔

(بخاری: ۶۰۰۲، سنن بیہقی: ۸۰۷۳، الادب المفرد: ۲۲۵، شعب الایمان: ۳۰۵۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ: بیوہ اور مسکینوں کی حاجت براری کے لیے کوشش کرنے والا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ

میں جہاد کرنے والا یا رات بھر عبادت اور دن بھر روزہ رکھنے والا۔

(بخاری:۶۰۰۶، مسلم:۷۶۵۹)

ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح پاس پاس ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں، یعنی انگوٹھا اور شہادت کی انگلی۔

(بخاری:۶۰۰۵، مسلم:۷۶۶۰)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« الخلق عيال الله ، فأحبهم إلى الله أنفعهم لعياله »

(مسند البزار:۶۹۴۷، مسند ابویعلی:۳۳۱۵، شعب الایمان:۷۰۴۶)

(ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ شخص وہ ہے، جو اللہ کی مخلوق کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو۔)

ان احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے دین کا ایک بڑا حصہ وہ ہے، جس کا تعلق خدمت خلق سے ہے اور یہ کام بڑا بھاری بھرکم اور بڑا اجر و ثواب کا باعث ہے۔

یاد رہے کہ سماجی و فلاحی خدمات کا مقصد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل و تکمیل ہے ، جہاں مختلف ذہنیت کے افراد یا مختلف المذاہب اقوام اور جماعتیں مل جل کر رہتے ہوئے ایک خوشگوار زندگی گزار سکیں اور امداد باہمی، آپسی ہمدردی و غمخواری، ایک دوسرے کے دکھ وسکھ میں شریک ہو کر آپسی نفرتوں و کدورتوں کو دور کرنے کی فضا قائم کی جا سکے۔

اور آج اس کی جس قدر ضرورت ہے، شاید اس سے قبل اس قدر نہ رہی ہو؛ لہذا اس کام کی جانب بڑی دلچسپی کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

بھارت کو ’’ماتا‘‘ کہنے کی حقیقت

فرقہ پرستی کی لہر میں جب کبھی تیزی آتی ہے، تو بعض فرقہ پرست تنظیموں کی جانب سے کچھ بے حقیقت چیزوں میں لوگوں کو الجھانے اور اپنی فرقہ پرستی کو ہوا دینے کی کوشش کی جاتی ہے، کبھی ’’وندے ماترم‘‘ کو لاگو کرنے کا نعرہ لگایا جاتا ہے، تو کبھی دیش بھکتی بننے کی آواز دی جاتی ہے، جیسے اس وقت بعض فرقہ پرست ہندو تنظیموں نے خوامخواہ ہی یہ شوشہ چھوڑا ہوا ہے، کہ ہندوستان مسلمان اگر دیش بھکتی ہیں، تو وہ ہندوستان کو ’’بھارت ماتا‘‘ کہا کریں۔ بھارت ماتا کہنا ان کے ہندوستانی ہونے کی دلیل سمجھی جائے گی اور نہ کہنا ان کے ہندوستانی نہ ہونے کی دلیل مانی جائے گی۔

پھر ایک جانب میڈیا کے ذریعے عام لوگوں کے اندر یہ ذہن پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں، کہ بھارت ماتا کہنے ہی کو دیش بھکتی ہونے کی علامت و دلیل سمجھا جائے اور اس پر زور دیا جائے اور نہ کہنے والوں کے ساتھ نفرت و عداوت کا معاملہ کیا جائے اور ان کو باغی سمجھا جائے اور دوسری جانب مسلمانوں میں اس سلسلے کی بحث و مباحثہ کا بازار گرم کر دیا گیا ہے، کہ یہ حدود جواز میں آتا ہے کہ مسلمان ’’بھارت ماتا‘‘ کہیں یا حدود جواز سے خارج ہے؟ پھر کچھ حضرات تو لفظ ’’ماتا‘‘ کے لغوی معنی کو لیکر اس میں کوئی قباحت نہ ہونے کی بات کر رہے ہیں، تو کچھ حضرات اس کے متعارف مطالب سے بحث کرتے ہوئے اس کے عدم جواز کا فتوی دے رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض ایک الجھاؤ کی خاطر کیا جا رہا ہے اور کیا جاتا ہے؛ تا کہ اقلیتی فرقے ان ہی میں الجھے رہیں اور اپنے اصلی و حقیقی مسائل کی جانب توجہ نہ دے

سکیں اوران بے کار و دوراز کار مباحثات ومناظرات میں ان کی علمی وعقلی صلاحیتیں اور عملی قوتیں و محنتیں اس قدر لگ جائیں کہ وہ دوسری جانب توجہ دینے کے قابل ہی نہ رہیں اور اس سے صرف نظر کرلیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ فرقہ پرستوں کی سوچی سمجھی سازشوں اور ملک کے باشندوں میں آپسی رواداری اوران میں پیار و محبت اور امن وآشتی کے بجائے ناہمواریاں اور دوریاں، نفرتیں وعداوتیں پیدا کرنے کی ناپاک کوششوں کی پیداوار ہے، جن کو کسی حال بھی کامیاب ہونے نہ دینا چاہیے اوراس سلسلے میں تمام سیکولر ذہن رکھنے والے ہندوستانیوں کی جانب سے، خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی بھی مذہب کے پیروکار ہوں، ایک ایسے اقدام کی ضرورت ہے، جو فرقہ پرستی کے اس شجرۂ ناپاک کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکے اور ملک کے سیکولر ڈھانچے کو برقرار رکھے اور سیکولر اقدار کو یہاں زندہ رکھنے اوران کو بارآور بنانے میں مفید ہو۔

رہا مسئلہ ''بھارت ماتا'' کہنے کے جواز وعدم جواز کا تو سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں ایک تو لفظ ''بھارت ماتا'' ہے اور ایک اس لفظ کے پیچھے کارفرما نظریہ ہے۔

جہاں تک لفظ ''بھارت ماتا'' کا تعلق ہے، اس میں دورائے نہیں کہ اس کے معنی ہیں: ''مادر وطن'' یا ''مادرگیتی''، اور جب لفظ ''مادر وطن'' استعمال کیا جاتا ہے، تو اس کی حقیقت صرف اور صرف یہ سمجھی جاتی ہے کہ یہ ہمارا ملک ہے، جہاں ہم پیدا ہوئے اور پرورش پاتے رہے ہیں، جیسے ماں کی گود میں انسان پیدا ہوتا اور پرورش پاتا ہے۔ اوراس معنی کے لحاظ سے یہ لفظ مادر جس طرح وطن کے لیے مستعمل ہے، اسی طرح اسکول و مدرسہ وکالج وغیرہ دانش گاہوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: فلاں اسکول یا مدرسہ میرا ''مادر علمی'' ہے؛ کیوں کہ وہ جگہ ایک انسان کو علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور اپنی قابلیتوں کو نمایاں کرنے میں ماں کی گود کی طرح نفع پہنچاتی ہے؛ لہذا اگر ماتا اسی معنی میں کوئی استعمال کرے، تو کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ حدود جواز میں داخل ہے۔

لیکن بات اسی پر یہاں ختم نہیں ہوجاتی؛ بل کہ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کسی لفظ کا استعمال جس طرح اس کے لغوی معنی کے لحاظ سے ہوتا ہے، اسی طرح اس کا ایک استعمال اس کے مرادی متعارف معنی کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے؛ بل کہ زیادہ تر الفاظ کا استعمال اسی طرح ہوتا ہے اور یہی معنی عوام الناس میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور جب کبھی لفظ استعمال کیا جاتا ہے، تو وہی مرادی معنی لوگوں کے ذہن میں آتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ لفظ ''بھارت ماتا'' کہنے والے اس لفظ کو کیا معنی دیتے ہیں اور ان کی اپنی اصطلاح ومحاورے میں اس لفظ کی کیا حقیقت ہے؟ اور اس لفظ کے استعمال میں کن افکار ونظریات کو پیش نظر رکھا گیا ہے؟ جب ہم اس نقطۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو یہ بات بالکل واضح وعیاں ہوجاتی ہے کہ ہندو لوگوں کے نظریات وعقائد کی رو سے اس موقعے پر ''ماتا'' کا لفظ آقا و مالک وخدا کے تصور کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے، جس طرح وہ لوگ اسی تصور کے ساتھ ''گاؤ ماتا'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے گاؤ ماتا کا مطلب کوئی یہ نہیں لیتا کہ گاؤ اس کی ماں ہے؛ بل کہ یہاں بھی خدا کا معنی لیا جاتا ہے اور اسی لیے ان کے یہاں گائے کی پرستش کی جاتی ہے اور اس کے ذبیحے کو انتہائی برا سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ''بھارت ماتا'' کے معنی بھی ان کے نزدیک یہی ہیں کہ ''ملک بھارت'' ایک خدا ہے، جو پوجنے کے لائق و پرستش کے قابل ہے اور ان کے یہاں جو گیت: ''وندے ماترم'' پڑھا جاتا ہے، اس میں بھی اسی تصور کو پیش کیا گیا ہے کہ یہ سرزمین ماتا یعنی خدا اور لائق پرستش ہے۔

اور اس میں کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ ہندو قوم میں وطن ایک معبود کی حیثیت پا جائے ؛ کیوں کہ ان کے یہاں ایک قدیم دور سے ہر وہ چیز قابل پرستش مانی گئی ہے، جو یا تو نفع بخش ہو یا کسی ضرورت کی تکمیل کرتی ہو۔

اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر گستاولی بان نے ''تمدن ہند'' میں لکھا ہے:

''دنیا کی تمام اقوام میں ہندو کے لیے پرستش میں ظاہری صورت کا ہونا

لازمی ہے، اگرچہ مختلف ازمنہ میں مذہبی اصلاح کرنے والوں نے ہندو مذہب میں توحید کو ثابت کرنا چاہا ہے؛ لیکن یہ کوشش بالکل بے فائدہ ہے۔ ہندو کے نزدیک کیا ویدی زمانہ کیا اس وقت ہر چیز خدا ہے، جو کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہ آئے یا جس سے وہ مقابلہ نہ کرسکے، اس کے نزدیک پرستش کے لائق ہے۔''

(بحوالہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر:۵۹)

نیز یہی مصنف مزید لکھتا ہے:

''ہندوؤں کو مورتوں اور ظاہری علامات سے بے انتہا انس ہے......ان کے مندر پرستش کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں، جن میں سب سے مقدم لنگم اور یونی ہیں، جن سے مراد مادۂ خلقت کے دونوں جزو ہیں....اور اسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے پاس واجب التعظیم ہیں۔''

(بحوالہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج ونزوال کا اثر:۶۱)

حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''چھٹی صدی عیسوی میں بت پرستی پورے عروج پر تھی۔ وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی اور اس زمانے میں ۳۳ کروڑ ہوگئی، اس عہد میں ہر پسندیدہ شی، ہر کشش رکھنے والی اور زندگی کی ضرورت پورا کرنے والی چیز دیوتا بن گئی تھی، جس کی پوجا کی جاتی تھی، اس طرح بتوں اور مجسموں دیوتاؤں اور دیویوں کا کوئی شمار نہ تھا، ان دیوتاؤں اور قابل پرستش اشیا میں معدنیات و جمادات، اشجار ونباتات، پہاڑ اور دریا، حیوانات حتی کہ آلات تناسل سب ہی شامل تھے۔''

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج ونزوال کا اثر:۵۸)

جب ان حقائق کو دیکھا جاتا ہے، تو اس میں کوئی تعجب خیز بات نظر نہیں آتی کہ اس قوم

نے گاؤ کو یا ملک کو یا زمین کو خدا کا درجہ دے دیا ہو اور اس کی عبادت و پرستش کو اپنے لیے فخر سمجھتی ہو۔

الحاصل ''بھارت ماتا'' کا لفظ ہندو قوم کے نقطۂ خیال کے مطابق ایک قابل ''پرستش دیوی'' کے معنی میں لیا جاتا ہے اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اس قوم میں وطن کو دیوی مانا جائے، جب کہ وہ اس سے بھی ادنی اور حقیر اشیاء کو خدائی تصور سے دیکھنے کی عادی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جب ان لوگوں کے نزدیک یہ لفظ ایک خاص ہندو اصطلاح میں مستعمل ہے اور وہ معنی اسلامی نقطۂ نظر سے خالص مشرکانہ ہیں، تو اسلام میں کیا اس کی اجازت ہو سکتی ہے؟

جواب بالکل واضح ہے کہ نہیں ہو سکتی؛ کیوں کہ اس میں ان کے مشرکانہ عقیدے کی تائید و تقویت ہے یا کم از کم اس کی ہمنوائی ہے اور ایسی صورت میں اس کی ہمنوائی بھی شرک ہی کا حکم رکھتی ہے؛ لہذا کسی مسلمان کو بھارت ماتا کہنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر بلا عقیدے کے کسی مجبوری میں زبان پر پہلے معنی کے تصور کے ساتھ یہ لفظ لائے گا، تو معاف سمجھا جا سکتا ہے، لیکن یہ صرف مجبوری کی صورت میں ہے۔

مدارس کا چندہ- چند قابل اصلاح پہلو

رمضان المبارک کی آمد ہوتی ہے، تو اسی کے ساتھ ساتھ؛ بل کہ اس سے بھی کچھ پہلے ہی سے سفرائے مدارس کی بھی چلت پھرت شروع ہو جاتی ہے، کیا شہر اور کیا دیہات؛ ہر جگہ ان کے دورے ہوتے رہتے ہیں اور ماشاء اللہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مدارس کی خدمت کو اپنے لیے سرمایۂ نجات تصور کرتے ہوئے اپنے خون پسینے کی گاڑھی کمائی کا ایک حصہ زکاۃ وصدقات وعطیہ جات کی مد میں ان کو دیتی اور ان مدارس کے تحفظ و بقاء اور ترقی کا سامان پیدا کرتی ہے۔

مگر اس سلسلے میں چند پہلوؤں پر مذاکرے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے: ایک ان لوگوں کے ساتھ جو مدارس کے چندے کو علی الاطلاق معیوب وقابل نکیر سمجھتے ہیں اور اس کی بنا پر مدارس وسفرائے مدارس کی تحقیر وتوہین وتذلیل کرتے ہیں، دوسرے اہل مدارس کے ساتھ ، جو اس نظام کو لے کر چلتے ہیں اور مدارس ومکاتب کا نظام قائم کرتے ہیں۔

جہاں تک اُس طبقے کا تعلق ہے، جو چندے کے اس نظام کو معیوب خیال کرتا اور مدارس اور اس کے سفراء کو حقیر نگاہوں سے دیکھتا ہے، ان کا حال یہ ہے کہ یہ حضرات مدارس کی خدمت کے بجائے اسی کو اپنا نصیبہ بناتے ہیں کہ ان پر تنقید کریں اور ان کی تحقیر کریں، ان کا مذاق اڑائیں اور ان کو اور ان کے علماء کو طعنہ دیں کہ یہ لوگوں کے ٹکڑوں پر پلنے والے ہیں، چندے کے بندے ہیں، وغیرہ، اور اسی پر بس نہیں؛ بل کہ بعض اوقات یہ واقعات بھی سامنے آتے ہیں کہ کسی سفیر کو اپنی دکان سے بھگا دیا، کسی کو پکڑ کر باہر کر دیا، یا کم از کم یہ کہ

جھڑکی دے دی یا ڈانٹ پلا دی، وغیرہ، ان لوگوں سے یہ گزارش ہے کہ اس سلسلے میں چند باتوں پر اپنی توجہ مرکوز فرمائیں:

ایک تو یہ کہ یہ نظام صرف اہل مدارس کے یہاں کی بدعت نہیں ہے؛ بل کہ یہ تو مسجد والوں اور ہر دینی وملی ادارے اور تنظیم کے ذمے داروں کے یہاں بھی جاری ہے۔ہم جانتے ہیں کہ مساجد جہاں بھی بنتی ہیں، اکثر تو اسی چندے کی دین ہوتی ہیں، حتی کہ مال دار علاقوں میں بھی چندے ہی کی مسجد بنائی جاتی ہے۔اسی طرح مختلف ملی تنظیموں اور انجمنوں کا حال ہے کہ وہ بھی اسی چندے کی بنیاد پر قائم ہیں۔ پھر کیا مساجد اور دیگر ملی اداروں اور تنظیموں کو بھی یہی طعنہ دیا جائے گا کہ یہ مسجد چندے کی ہے، یہاں چندے کی نماز پڑھی جاتی ہے اور یہ کہ یہ بھیک کی مسجد ہے، یہ انجمن و ادارہ یا تنظیم بھیک اور چندے پر قائم ہے اور کیا اسی بنا پر ان مسجدوں اور اداروں اور تنظیموں کی تحقیر کرتے ہوئے ان کے سفراء اور وصول کرنے والوں کو دھکے دیے جائیں گے؟

یہ حضرات اس پر بھی غور کریں کہ آخر یہ لوگ نمازیں کہاں پڑھتے ہیں؟ کیا ان ہی چندوں کی مساجد میں نہیں؟ تو کیا ان کو بھی بھیک پر پلنے کا طعنہ دیا جانا چاہیے؟

اصل بات یہ ہے کہ دین وملت کے کام اجتماعیت کی بنیاد پر انجام پاتے ہیں، ان میں فرض علی الکفایہ ہونے کی شان ہوتی ہے، اس لیے ان کاموں کو تمام کے تمام اہل ملت مل کر سرانجام دیتے ہیں اور اپنی ذمے داری کو پورا کرتے ہیں، خواہ وہ مساجد ہوں یا علمی و دینی ادارے یا ملی وقومی تنظیمیں وانجمنیں ہوں؛ اس لیے ان کے لیے چندہ کرنے کو معیوب سمجھنا، چندہ کرنے والوں کو حقیر جاننا اور ان کو طعنے دینا اسی کا کام ہوسکتا ہے، جس نے اپنی عقل وفہم کی صلاحیتوں کو استعمال نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہو۔

اور یہ بھی سنتے چلیں کہ یہ چندہ کا نظام صرف مسلمانوں میں نہیں؛ بل کہ ہر قوم وملت میں جاری ہے، ہندو قوم ہو یا عیسائی قوم ہو یا دوسری اور قومیں سب کے یہاں دینی وملی خدمات کے شعبے اسی طرح قائم ہیں کہ ان کے لیے ایک دوسرے سے تعاون لیا جاتا ہے، حتی

کہ یہ اہل مدارس کو طعنہ دینے والے جن اسکولوں کے پروردہ ہیں اور ان کے بچے جن اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں، وہاں بھی Donation (چندہ وعطیہ) کے نام سے با قاعدہ وصول کیا جاتا ہے اور اسی سے وہاں کی تعمیرات وغیرہ میں کام لیا جاتا ہے۔تو کیا یہ کہا جائے گا کہ ان لوگوں نے اور ان کے بچوں نے بھی چندے پر تعلیم پائی ہے؟

پھر یہ بھی غور کیا جائے کہ دینی وملی ضرورتوں کے لیے چندہ کرنا اور چندے کی ترغیب دینا خود حضرت رسالت مآب ﷺ سے بھی ثابت ہے۔

چناں چہ غزوۂ تبوک کے موقعے پر اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کو جہاد کے لیے چندہ جمع کرنے کی ترغیب دی، جس کا احادیث میں ذکر ہے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن خباب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا، جب کہ آپ جیش العسرۃ (جس کو غزوۂ تبوک کہا جاتا ہے) کی ترغیب دے رہے تھے، پس حضرت عثمان کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! سو اونٹ پالان اور کجاوے کے ساتھ میرے ذمے ہیں، جو اللہ کے لیے وقف ہیں۔آپ ﷺ نے دوبارہ ترغیب دی، تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں دو سو اونٹ پالان وکجاوے کے ساتھ میرے ذمے لیتا ہوں۔آپ ﷺ نے تیسری بار ترغیب دی، تو پھر حضرت عثمان نے عرض کیا کہ میں اپنے ذمے تین سو اونٹ لیتا ہوں۔راوی کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ منبر سے یہ فرماتے ہوئے نیچے آئے کہ آج کے بعد عثمان کچھ بھی کرے، اس کا کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

(ترمذی:۳۷۰۰، مسند احمد:۱۶۷۴۲، معجم اوسط:۵۹۱۵، معجم الصحابہ ابن قانع:۱۴۶/۲، الجہاد لابن ابی عاصم:۷۷)

اسی طرح حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صدقے کا حکم دیا، تو میرے پاس خاصا مال تھا، میں نے سوچا کہ آج میں ابو بکر پر بازی لے جاؤں گا؛ لہذا میں نے اپنا آدھا مال آپ کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔آپ ﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لیے کیا باقی رکھا ہے؟ میں

نے عرض کیا کہ جتنا لایا ہوں، اسی قدر باقی ہے۔ پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنا سارا مال لے کر حاضر ہوئے۔ آپ نے پوچھا کہ ابوبکر! گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے؟ انھوں نے عرض کیا کہ ''ان کے لیے اللہ و رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں ان پر کبھی سبقت نہیں کر سکتا۔

(ابوداود: ۱۶۸۰، ترمذی: ۳۶۷۵، مسند بزار: ۱۵۹، سنن بیہقی: ۸۰۲۶، مستدرک: ۱۵۱۰)

اسی طرح جہاد کے سلسلے میں اللہ کے رسول کا یہ ارشاد احادیث میں وارد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من جهز غازيا فى سبيل الله فقد غزا و من خلف غازيا فى سبيل الله بخير فقد غزا. ''

(بخاری: ۲۶۳۱، مسلم: ۵۰۱۱، ابوداود: ۲۵۱۱، ترمذی: ۱۶۲۸، نسائی: ۳۱۸۰)

(جس نے اللہ کے راستے میں غزوہ کرنے والے کو ساز و سامان مہیا کیا، اس نے بھی گویا غزوہ کیا اور جس نے خیر خواہی غازی فی سبیل اللہ کے گھر بار کی نگرانی کی، وہ بھی جہاد کرنے والا ہے۔)

ان احادیث سے صاف واضح ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دین وملت کی خدمت کے لیے ابھارا اور ترغیب دی اور بعض مواقع پر آپ نے صحابہ سے چندہ جمع کیا؛ تاکہ جہاد و غزوہ میں خرچ کیا جا سکے؛ لہذا دینی وملی ضرورتوں کے لیے چندہ جمع کرنا سنت رسول ہے اور پوری امت ہمیشہ سے اس کام کو کرتی چلی آ رہی ہے۔

نیز احادیث و سیرت کی شہادتیں اس سلسلے میں بہت کافی وشافی موجود ہیں کہ، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف دینی وملی ضرورتوں کی انجام دہی کے لیے لوگوں سے چندہ وصول کرنے اپنے سفراء مقرر فرمائے تھے اور وہ حضرات حسب حکم مختلف لوگوں کے پاس مختلف علاقوں میں جا کر چندہ وصول کر کے لایا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرات خلفائے راشدین کے دور میں بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

لہذا اس کام کو حقیر و ذلیل سمجھنا کیسے درست ہوسکتا ہے، پھر اس کی بنا پر مدارس کی تحقیر واہانت اور سفرائے مدارس کے ساتھ تذلیل وتوہین کا معاملہ کرنا کیوں کر روا و جائز ہوسکتا ہے ؟لہذا جو لوگ چندے سے چڑتے اور اس کو ذلیل سمجھتے ہیں وہ اوپر بیان کردہ حقائق پر خدارا غور کریں۔

اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو مدارس کی اہمیت ہی کا علم نہیں اور یہ نہیں جانتے کہ مدارس کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ ان حضرات کو یہ حقیقت جاننا چاہیے کہ مدارس اسلامیہ دین اسلام کے وہ عظیم مراکز اور قلعے ہیں، جہاں قرآن وسنت کی حفاظت و اشاعت اور دین و شریعت کے احکام کی تحقیق و تبلیغ اور ان کی تحقیق و ترتیب کا کام ہوتا ہے، جہاں سے انسان کو انسان بنانے کی تحریکات و کوششیں چلتی ہیں، جہاں شرافت کی قدروں اور انسانیت کے پیمانوں کو تیار کیا جاتا ہے اور انسانوں کو ان میں ڈھالا جاتا ہے،جس سے وہ ایک جانب اپنے مالک حقیقی کی معرفت سے معمور ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی و غمخواری، عدل و انصاف، پیار و محبت،اس کی خدمت و ادائے حقوق وغیرہ کی صفات سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔

اور اس کا کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ سارے کام ضرورت دینی و شرعی وملی میں داخل ہیں ،اسی اہمیت کے پیش نظر ان مدارس کے تحفظ و بقا کا سامان پیدا کرنا بھی ایک اہم ذمے داری ہے، جو امت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے اور اسی ضمن میں مدارس کے لیے چندہ وصولی وفراہمی کی اہمیت بھی سامنے آجاتی ہے؛ کیوں کہ یہ مدارس عوامی تعاون ہی کے ساتھ چلتے اور چلائے جاتے ہیں، ان کے لیے سرکاری گرانٹ و امداد نہیں لی جاتی اور اسی میں ان کے حق میں خیر سمجھی جاتی ہے۔

چناں چہ بہت سے مدارس کی جانب سے اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ مدرسے کے لیے عوام الناس کو متوجہ کیا جائے اور ان سے ان مدارس کے نظام کے واسطے چندہ لیا جائے؛ تاکہ ان کا وجود اپنے پورے اصلی نظام کے ساتھ قائم و دائم رہے۔اس کے لیے مدارس

اسلامیہ اپنے سفراء مقرر کرتے ہیں اور ان کو مختلف علاقوں میں بھیجا جاتا اور شہروں سے لے کر دیہاتوں تک بھی ان کو دوڑایا جاتا ہے، بالخصوص رمضان المبارک کے موقعے پر اس کا اہتمام بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔

ہماری بحث کا دوسرا پہلو اہل مدارس سے متعلق ہے اور یہ چند امور ہیں:

ایک تو یہ کہ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ مدارس کے نام پر چندہ کرنے والے کچھ عیار و مکار لوگ وہ ہیں، جو مدارس کے نام سے جھوٹی رسیدیں بنوا کر اور جھوٹی دستاویزات و تصدیقات لے کر لوگوں میں گھومتے رہتے ہیں، ان کے کوئی مدرسے ہی نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو برائے نام ہوتے ہیں، وہاں نہ تعلیم ہوتی ہے، نہ تربیت کا کوئی نظام ہوتا ہے؛ بل کہ دو چار طلبہ کو کہیں سے فراہم کر لیتے اور ایک بورڈ مدرسے کا لگا کر مہتمم صاحب صرف چندہ کرنے کے لیے گھومتے رہتے ہیں، کہاں کی تعلیم اور کیسی تربیت! اور اس سے ان کو غرض ہی کیا! ان لوگوں کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں سے چندہ لیا جائے اور خوشامد و چاپلوسی کے ساتھ وصول کیا جائے اور حلال و حرام کسی بھی طرح وصول کیا جائے اور اپنی دنیا بنائی جائے۔ اس سلسلے میں احقر کے سامنے کئی واقعات و حالات آچکے ہیں، ان کو یہاں درج کیا جائے، تو بات کافی طویل ہو جائے گی، لہذا ان کو اس وقت نظر انداز کرتا ہوں۔

ان کی اس ناپاک حرکت نے مدارس کو بدنام کیا اور ان کی حیثیت کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے اور ان لوگوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور پہلے شاید اس قسم کے لوگ آٹے میں نمک کے برابر تھے؛ لیکن اب یہ آٹے میں آٹے کے برابر معلوم ہوتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سلسلہ اور دراز ہو، تو ان کی تعداد آٹے سے بھی بڑھ جائے۔

اسی بنا پر چندے کے سلسلے میں لوگوں میں ایک بے چینی و اضطراب سا دکھائی دیتا ہے اور بیشتر عوام عجیب سی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں، وہ سوچتے ہیں کہ ہم اپنی زکاۃ کس کو دیں، کون سا مدرسہ قابل اعتبار ہے؟ اور یہ بات بھی وجہ ابتلاء و آزمائش بن جاتی ہے کہ یہ لوگ کہاں سے اتنا وقت نکالیں کہ جا جا کر مدارس کی تحقیق کریں کہ کون سا مدرسہ صحیح ہے اور کون

سانا قابل اعتبار؟اس پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ ان کو ایسے لوگ جگہ جگہ نظر آتے ہیں ، جو چندے کو ایک دھندا بنائے ہوئے ہیں اور ان کو مدارس کے نام پر چندہ کرنا ہی مقصود ہے، اس مقصود کا کوئی اور مقصود نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جن کا مقصد حیات ہی چندہ ہو، وہ اس سے کوئی دینی کام بھی مقصود نہ ہو، وہ آخر اس کمائی سے کیا کرتے ہوں گے،سوائے اس کے کہ اپنی جہنم تیار کرتے ہیں۔

واللہ! یہ علماء نہیں ؛بل کہ علماء کے لباس میں یا تو بھکاری ہیں یا دھوکے باز اور علماء کے نام پر ایک داغ کی حیثیت رکھتے ہیں؛لہذا امت کو بھی چاہیے کہ وہ حقیقی علماء اور ان دھوکے بازوں کے مابین فرق و امتیاز کرے اور پہچان پیدا کرے اور خود دھوکہ نہ کھائے اور اس قسم کے لوگوں کی چاپلوسی وتملق کو دیکھ کر حقیقی علماء سے بدظنی میں مبتلا نہ ہو۔

نیز اس قسم کے لوگ چندہ کرنے میں علم دین اور علمائے دین کے وقار کو بھی ٹھیس پہنچاتے اور علم وعلماء کو ذلیل کرتے ہیں ؛ کیوں کہ عام طور پر یہ لوگ چندہ وصول کرنے میں نہایت بے غیرتی کا مظاہرہ کرتے ہیں، مالداروں و دنیا داروں سے تملق و چاپلوسی اور ان کی خوشامد کرتے پھرتے ہیں،حرام کمائی والوں سے بھی وصول کرتے ہیں اور ذلت و دناءت والا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے:

”ایک جگہ ایک مدرسہ تھا،اس کے جلسے میں ایک واعظ صاحب فرمارہے تھے کہ ”افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر اگر ایک کسبی ناچتی ،تو لوگ اس کو کس قدر دیتے،ہمیں ایک کسبی کے برابر بھی نہیں سمجھتے کہ گھنٹے بھر سے ہم مانگ رہے ہیں اور کوئی کچھ نہیں دیتا“،افسوس !اس واعظ کو بیان کرتے ہوئے غیرت بھی نہ آئی۔“ (خطبات حکیم الامت:۸/۴۳۹)

اس طرز عمل کا سب سے بڑا منفی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے مولویوں کو دیکھنے والے، ایک جانب علماء سے بدظنی کا شکار ہوتے ہیں اور دوسری طرف مدارس ؛بل کہ خود علم دین سے

بھی بے زار ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ سارے علماء اور سارے مدارس ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے، جس کو حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

''ایک تحصیلدار صاحب تھے، ایک طالب علم کا کھانا ان کے ہاں مقرر تھا، وہ طالب علم روزانہ کھانا لینے کے واسطے آیا کرتے تھے اور کھانے میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی، تو ان کا خالی وقت بیکار جاتا تھا۔ انھوں نے تحصیلدار صاحب سے ایک دن دل سوزی سے کہا کہ میں روزانہ اتنی دیر بیکار رہتا ہوں اور آپ کا لڑکا بھی کھیلتا پھرتا ہے، اگر آپ کہیں، تو میں اتنی دیر آپ کے لڑکے کو کچھ عربی پڑھا دیا کروں۔ تحصیلدار صاحب نے فرمایا کہ مولانا کیا ہوگا، آپ نے پڑھ کر کیا کیا؟ دروازے پر بھیک مانگنے آتے ہیں اور یہ پڑھ کر آپ کے دروازے پر بھیک مانگنے جائے گا۔''

(خطبات حکیم الامت: ۴۳۸/۸-۴۳۹)

یہاں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے اس سلسلے میں ایک دو ملفوظات نقل کر دینا مناسب ہے، آپ نے اپنے وعظ ''شفاء العی'' میں فرمایا:

''اسی طرح احکام کی تحقیق نہ ہونے سے چندہ جمع کرنے میں اس کی رعایت بالکل نہیں ہوتی کہ خوشی سے دے رہا ہے یا بغیر خوشی، .... دین کے لیے چندہ کی غرض رضائے خداوندی ہے اور وہ جب نصیب ہوتی ہے کہ قواعد شرعیہ کے موافق کام کیا جائے ورنہ بجائے رضائے باری تعالی کے غضب الٰہی کا اندیشہ ہے۔''

خطبات حکیم الامت: ۱۶۷/۲۱)

آپ نے ایک وعظ ''تاسیس البنیان'' میں فرمایا:

”پس یاد رکھو کہ بڑی چیز دین کی محبت اور عزت ہے، علماء کو دین کی عزت کا لحاظ رکھنا چاہیے، جس میں ان کی بھی عزت ہوگی اور دین کی عزت استغناء میں ہے، علماء دنیا داروں سے جب تک استغناء نہ کریں، اس وقت تک ان کی عزت نہ ہوگی، اور جب علماء استغناء کریں گے، اسی وقت عزت وعظمت رونما ہوگی؛ مگر آج کل تو علماء نے اپنی قدر کھودی ہے کہ دنیا داروں کے دروازوں پر جاتے اور کھانا لاتے ہیں۔

(خطبات حکیم الامت: ۴۳۸/۸)

ان غلط کار سفراء سے ایک نقصان یہ ہے کہ لوگ تمام علماء و مدراس سے بدظنی کی وجہ سے مدارس و علماء سے دور بھاگتے ہیں، ان سے نفرت کرتے ہیں اور بالآخر مدارس کی خدمت سے بھی جی چراتے ہیں۔ اگر چہ کہ ان لوگوں کی یہ غلطی ہے اور سخت قسم کی غلطی ہے؛ کیوں کہ اس قسم کے چند لوگوں کو دیکھ کر سارے علماء اور سارے مدارس سے بدظن ہونا ایسا ہی ہے جیسے بعض دھوکے باز ڈاکٹروں یا وکیلوں کو دیکھ کر سارے ڈاکٹروں اور وکیلوں کو غلط کار و دھوکہ باز سمجھا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بے وقوفی ہے؛ لیکن یہاں روئے سخن ہمارا ان علماء و مولویوں یا صحیح لفظوں میں مولوی نما لوگوں سے ہے، جن کی ان بے جا حرکتوں و بے اعتدالیوں کے نتیجے میں علم و علماء کی توہین و تذلیل ہو رہی ہے۔

الغرض چندے کے بارے میں اس قسم کے لوگوں کا تدارک نہایت ضروری ہے؛ تا کہ عوام الناس علم دین و دین سے اور علمائے امت اور مدارس سے دور و نفور نہ ہوں اور اس کا خمیازہ کہیں اگلی نسلوں کو بھگتنا پڑے۔

اکابر حضرات اور معتمد و معتبر دینی مدارس و جامعات کی ذمے داروں کی جانب سے اگر ایک ایسا قدم اٹھایا جائے کہ جس سے جھوٹے مدارس اور دھوکہ باز و مکار سفراء کو ناکامی کا سامنا ہوتا رہے اور عوام الناس بھی ان لوگوں سے واقف ہو جائیں، تو یہ ایک مستحسن اقدام ہوگا اور اس کے بہت مفید و بار آور نتائج مرتب ہوں گے۔

چندے کے سلسلے میں ایک پہلو یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ بہت سے مدارس جو ماشاء اللہ اپنی جگہ پر دین وعلم دین کی اچھی وبہتر خدمات انجام دے رہے ہیں، جب اپنے یہاں کوئی سفیر مقرر کرتے ہیں، تو اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ سفیر کہاں تک دیندار ہے؟ نمازوں کا پابند بھی ہے یا نہیں؟ اور دینی امور میں محتاط ہے یا نہیں؟ بل کہ جو ملا اسی کو سفیر بنا کر روانہ کردیتے ہیں اور بعض اوقات ان لوگوں کی جانب سے ایسے افعال صادر ہو جاتے ہیں، جو تمام مدارس وعلماء کی بدنامی کا باعث بن جاتے ہیں۔

جیسے نمازوں میں کوتاہی، حلیہ ووضع قطع کا غیر شرعی ہونا، سگیریٹ پھونکتے پھرنا، ٹخنوں سے نیچے پاجامہ لٹکالینا وغیرہ، اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کو دیکھ کر مدرسے کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں یا سبھی علماء کے سلسلے میں رائے بنالیتے ہیں کہ مدارس وعلماء کا یہ کردار ہے۔

احقر کے یہاں ایک زمانے میں رمضان میں مختلف جگہ کے سفیر لوگ قیام کرتے تھے، اور میں خود ان کو دیکھتا تھا کہ نمازوں تک میں بے پناہ کوتاہی کرتے ہیں، بہت سے سفیر کو دیکھا کہ سحری کھائے اور سو گئے اور فجر غائب، اس کا کیا اثر عوام الناس پر ہوگا؟

ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ مدرسہ چھوٹے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اس کا چندہ بھی بڑے بڑے شہروں میں سفیروں سے کرایا جاتا ہے یا خود مہتمم بھی اس میں کوشاں ہوتا ہے اور بعض وقت اس قدر وصول ہوتا ہے کہ آنے جانے کا خرچ نکل جائے یا اتنا کہ وصول کرنے والے کا کمیشن نکل آئے؛ چناں چہ ایک سفیر ابھی اسی رمضان میں ایک نئے مدرسے سے آئے، جو ابھی ابھی قائم ہوا ہے اور انھوں نے جب چندہ وصول کیا، تو بس ان کا خرچہ نکل آیا اور واپس ہونے لگے، میں نے پوچھا کہ کیا وصول ہوا؟ تو کہنے لگے کہ میرا خرچہ وصول ہو گیا۔ سوچا جائے کہ کیا مدرسے کے نام پر یہ وصولی مدرسے کے حق میں ہے یا۔۔۔؟

ایک بات اس سلسلے میں یہ بھی لائق توجہ ہے کہ اہل مدارس رمضان میں چندہ وصول کرتے ہیں اور اس لیے اپنے سفراء بھی رمضان میں روانہ کرتے ہیں؛ مگر اس کی وجہ سے یہ

بات دیکھنے میں آئی کہ بعض (بعض کا لفظ احتیاط کی وجہ سے لکھ رہا ہوں ورنہ بہت کا لفظ بھی لکھا جا سکتا ہے) سفیر لوگ رمضان میں سفارت کی ذمے داری پورا کرنے کی خاطر روزہ نہیں رکھتے، اسی طرح تراویح بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں؛ کیوں کہ یہ لوگ ان ایام میں سفر پر ہوتے ہیں اور قرآن کی رو سے مسافر کو روزہ نہ رکھنے کی گنجائش ہے۔

یہ بات اگر چہ کہ صحیح ہے؛ مگر سوال یہ ہے کہ جب ہر سال ان کو سفارت پر نکلنا ہے، تو کیا ان کو ہمیشہ ہی روزے کی قضاء کرتے رہنا ہوگا اور جو رمضان کا اصل لطف و کیف ہے، اس سے ان کو ہمیشہ ہی محروم رہنا ہے؟ میں بعض سفراء کو جانتا ہوں جو میرے پاس رمضان میں دس دس، پندرہ پندرہ سال سے لگاتار آتے ہیں، ان کو آخر کب رمضان کے روزوں کو پانے کی سعادت ملے گی؟

لہذا اہل مدارس کو اس سلسلے میں غور کرنا چاہیے کہ سفیر حضرات کو وہ کیا رمضان کے علاوہ کسی اور ماہ میں روانہ کر سکتے ہیں اور یہ کہ اس وقت لوگوں کا تعاون بھی جاری رہے گا؟

اخیر میں ایک اور بات کی جانب اہل مدارس کو توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عموماً یہ دیکھنے میں آیا کہ جب مدارس اسلامیہ کے چندے کا اعلان ہوتا ہے، تو اس طرح اعلان کیا جاتا ہے:

> ''مدرسے میں اتنے غریب و یتیم بچے پڑھتے ہیں، اوران کے لیے کھانے پینے وغیرہ ضروریات کو پورا کرنا ہے، جو آپ لوگوں کے چندوں سے پورا کیا جاتا ہے؛ لہذا اس مدرسے کی امداد کریں''

یعنی مدرسے کا اعلان غربت کے حوالے سے کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مدرسے کا اعلان دین و علم دین کے تحفظ و بقاء کے حوالے سے کیا جاتا اور لوگوں کو یہ بتایا جاتا کہ یہ دینی مدارس دنیا میں علوم اسلامیہ کے سرچشمے، دین و علم دین کے بقاء کا سامان، مسلمانوں کی دینی و شرعی ضرورتوں کے مراکز اور سب سے بڑھ کر ملت اسلامیہ کی شان و بان و آن ہیں؛ لہذا ان کا تحفظ و بقا اور ان کی ترقی و تطویر میں حصہ لینا اہل اسلام کی ایک اجتماعی ذمہ داری ہے۔ اعلان تو اس طرح ہونا چاہیے؛ مگر جو اعلان غربت کے حوالے سے کیا

جاتا ہے غور یہ کیجیے کہ اس طرز اعلان کا کیا اثر رونما ہوتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اعلان کا یہ انداز لوگوں کی نظر میں مدرسے کو ایک غریب خانے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور عوام الناس یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مدارس دراصل غریب خانے ہیں، جس کی حیثیت یتیم خانے کی ہے، جس کو کھانا میسر نہ ہو، جس کو کپڑے میسر نہ ہوں، جس کو دنیا کمانا نہ آتا ہو، اس کے لیے اس کے پاس اسباب نہ ہوں، وہ مدرسے میں آئے گا اور ہمارے دیے ہوئے صدقات و خیرات سے اپنی غربت کا علاج کرے گا، پھر اسی تصور وخیال سے ایک اور ذہنیت پیدا ہوتی ہے، وہ یہ کہ مدارس صرف غریبوں اور محتاجوں، یتیموں کے لیے ہوتے ہیں، یہاں مال داروں اور رئیسوں کے بچوں کے لیے کچھ نہیں؛ اسی لیے آج مدارس صرف غربت زدہ لوگوں کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں اور مال دار و رئیسوں کا طبقہ کبھی اپنے بچوں کے لیے مدارس میں بھیجنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ کیوں؟ اس کی بہت سی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ علمائے مدارس نے خود لوگوں کے سامنے وہ انداز اختیار کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھنے لگے کہ مدارس غریبوں کے ٹھکانے اور یتیم خانوں کے ہمدوش ہیں۔

غور کیا جائے کہ اس انداز وطریقے نے صرف یہ نہیں کہ مدارس کی حیثیت عرفی وشرعی کو ٹھیس پہنچایا؛ بل کہ درحقیقت خود دین کی حیثیت کو بھی مجروح کردیا؛ حالاں کہ یہ انداز ایک بھیک منگے کا تو ہوسکتا ہے؛ مگر مدارس اسلامیہ جو دین اسلام کے عظیم قلعے کہلاتے ہیں، ان کے لیے کیا یہ انداز مناسب ہے؟ کیا اس سے لوگوں کے ذہنوں میں مدارس کی عظمت پیدا ہوگی یا ان کی حقارت؟ الغرض مدارس کی عظمت وجلالت، ان کے عظیم ترین کام وخدمت کے پیشِ نظر حضرات علماء کو مدارس اسلامیہ کے چندے کے سلسلے میں انتہائی استغناء کی شان کے ساتھ لوگوں کو متوجہ کرنا چاہیے۔

الغرض اگر ایک جانب بعض عوام الناس میں اس سلسلے میں کوتاہی ہورہی ہے، تو دوسری جانب ان لوگوں میں بھی قابل اصلاح پہلو نظر آتے ہیں، جو مدارس کے قیام وتحفظ کے لیے کھڑے ہوئے ہیں، لہذا دونوں پہلوؤں پر غور وفکر ہونا چاہیے۔

آہ! حضرت مولانا قاسم قریشی

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی

آہ حضرت مولانا قاسم قریشی علیہ الرحمۃ آج ہم میں نہیں رہے، وہ لاکھوں عقیدت کیشوں کو داغ مفارقت دے گئے، بے شمار علاقوں میں اور لاکھوں انسانوں کے قلوب میں ہدایت کا چراغ جلا کر راہی ملک بقا ہوئے۔

یہ حقیقت کس سے پوشیدہ ہے کہ دنیا کی مثال ایک سرائے جیسی ہے، جہاں ایک جانب انسانوں کا سلسلۂ ورود ونزول ہر دم و ہر آن جاری رہتا ہے، تو دوسری جانب ہر دم سلسلۂ خروج وذہاب بھی اسی طور پر چلتا رہتا ہے؛ لہذا یہ تو کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ کسی انسان کا انتقال ہو جائے، یہ تو روز کا تماشا ہے کہ دنیا میں لوگ آتے اور جاتے رہتے ہیں، کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں، اس میں شاہ وگدا، امیر وغریب، جاہل وعالم، بڑا وچھوٹا سب برابر ہیں؛ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر آنے وجانے والا یکساں نہیں ہوتا، کوئی آتا اور جاتا ہے، تو اس کے آنے وجانے سے نہ کسی کو نقصان پہنچتا ہے نہ نفع، انسانوں کی یہ قسم وہ ہے، جس کے وجود وظہور کا نہ کوئی نفع نہ نقصان، ان کا آنا اور نہ آنا دونوں برابر ہوتے ہیں، دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کا وجود وظہور قوموں وملکوں، یا افراد واشخاص کے حق میں نہایت نقصان دہ ہوتا ہے، اس قسم کے لوگوں کا وجود قوم وملک کے حق میں خطرہ ہی خطرہ ہوتا ہے، اور ایک قسم اس دنیا میں آنے والوں کی وہ ہے، جس کا وجود قوموں، ملکوں، افراد واشخاص کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ، ایک مژدۂ جاں فزا اور ایک پیغامِ ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے، ان اللہ کے

بندوں کا وجود وعدم دونوں کا اس کائنات کے ذرے ذرے پر اثر رونما ہوتا ہے، ان کا وجود دنیا کی بہار، لوگوں کے لیے ذریعۂ ہدایت، قلوب کے لیے سامان تسلی، ایمان ویقین اور اعمال و اخلاق کے لیے باعث طاقت وقوت، خدا کی پہچان کا راستہ، نیکیوں کے پھیلنے کا ذریعہ اور برائیوں کے مٹنے کا سبب ہوتا ہے، ان کے اقوال واعمال، ان کا اخلاق وکردار، ان کا طرز زندگی وطریق معاشرت سب میں ہدایت کا نور، ایمان ویقین کی خوشبو، صلاح وتقوی کی پاکیزگی محسوس ہوتی ہے اور اگر وہ نہ رہیں، تو دنیا میں اندھیرا، قلوب میں بے نوری وبے چینی، انسانوں کے اعمال واخلاق میں گراوٹ اور دنیا کے نظام میں فساد پیدا ہونے لگتا ہے۔

ایسے ہی مقدس بندوں میں سے ایک قابل فخر ولائق تقلید شخصیت کا نام حضرت مولانا قاسم قریشی ہے، جن سے لوگ ہدایت پاتے تھے، ایمان واعمال کی چاشنی حاصل کرتے تھے، اخلاق وکردار کی باتیں لیتے تھے، خدا کی پہچان اور نبی سے تعلق کا سبق سیکھتے تھے، دین و شریعت کا پیغام سنتے تھے اور راہ حق کے متلاشی راہ حق پر پڑ جاتے تھے۔ آپ کی زندگی اپنے لیے نہیں؛ بل کہ اللہ کے لیے اور اس کے دین کے تحفظ وبقا کے لیے، اس کی نشر واشاعت اور دعوت وتبلیغ کے لیے وقف تھی اور آپ گویا اس شعر کا مصداق تھے:

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ مقولہ معروف ہے کہ ''**موتُ العَالِمِ موتُ العَالَمِ**'' (عالم کی موت عالم کی موت ہے) مولانا قاسم قریشی صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت بھی اس کا ایک واضح مصداق ہے؛ کیوں کہ عالم کی بہار علمائے کرام کے وجود سے ہے، جن کی زندگیاں اللہ کے دین وشریعت کی ترویج واشاعت کے لیے وقف ہوتی ہیں اور وہ لوگوں کی ہدایت کا بڑا ذریعہ بنتے ہیں اور اس طرح گویا علمائے کرام عالم کی زندگی کا سبب بن جاتے ہیں اور جب وہ چلے جاتے ہیں، تو لوگوں کی یہ حالت بھی بدل جاتی اور اس میں غیر

صالح انقلاب آجاتا ہے اور عالم میں زندگی کے آثار بھی مضمحل ہونے لگتے ہیں، اس طرح ایک عالم کی ایک موت عالم کی موت بن جاتی ہے۔

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کب سے میں مولانا کی شخصیت سے واقف ہوا؟ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اپنی طالب العلمی کے دور ہی سے برابر مولانا کا نام نامی ایک داعی و مبلغ ہونے کی حیثیت سے سنتا رہتا تھا اور آپ کے خطابات و بیانات کا چرچا بھی سنتا رہتا تھا؛ لیکن یاد ایسا پڑتا ہے کہ آپ کی ملاقات وزیارت کا موقعہ پہلی دفعہ کمہار پیٹ میں ایک تبلیغی اجتماع کے موقعہ پر ہوا اور وہاں آپ کا بیان وخطاب بھی بہت دیر تک سننے کا اتفاق ہوا۔اس کے بعد پھر متعدد مجالس میں اور تقاریر میں مولانا سے ملاقات کے مواقع پیش آتے رہے اور آپ کی شخصیت بندے کے حق میں مسحور کن ثابت ہوتی رہی۔

احقر جب بھی کسی سلسلے میں مسجد سلطان شاہ حاضر ہوتا، تو یہ بھی کوشش کرتا کہ اگر حضرت مولانا وہاں موجود ہوں، تو ان سے ملاقات کروں؛ لہٰذا بار بار ایسے مواقع پیش آتے تھے کہ وہاں مولانا موصوف سے ملاقات ہو جاتی اور جب بھی ملاقات ہوتی، تو بہت ہی محبت وشفقت کے ساتھ پیش آتے، مسرت وانبساط کا اظہار کرتے، خندہ پیشانی اور اخلاق کے ساتھ عنایاتِ بزرگانہ کا ثبوت دیتے، خاطر داری اور کرم فرمائی کا معاملہ فرماتے اور حسن کلام سے محظوظ کرتے تھے۔

آپ کو اللہ تعالی نے گوناگوں خوبیوں سے ممتاز فرمایا تھا، آپ جہاں عالم دین تھے، وہیں اس دین کے پُر جوش مبلغ وداعی بھی تھے؛ لہٰذا آپ نے ایک جانب متعدد جگہ مدارس اسلامیہ کی بنا ڈالی اور ان کو پروان چڑھایا، نیز اپنی تمام اولاد کو بھی اس میدان میں اُتارا اور سب کو علم دین سے آراستہ وپیراستہ کر کے اس کی خدمت میں بھی ان کو لگایا، تو دوسری جانب آپ نے دین اسلام کے پرجوش داعی ومبلغ کی حیثیت سے اپنی زندگی اس کے لیے لگادی اور اپنی اولاد کو اس میں بھی اسی طرح لگایا، جس طرح علم کی لائن میں لگایا۔

آپ دین اسلام کی دعوت وتبلیغ کو اپنا مشن بناتے ہوئے شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جاری فرمودہ عالم اسلام کی سب سے زیادہ وسیع ومقبول، عالمگیر اور انقلاب آفریں تحریک ''دعوت وتبلیغ''(جس نے لاکھوں انسانوں میں دینی شعور اور اصلاحی اثرات پیدا کردیے) سے مکمل طور وابستہ ہو گئے اور آپ نے اپنی زندگی اسی ''تحریک دعوت وتبلیغ'' کے لیے وقف کردی تھی اور تمام کاموں سے یکسو ہو کر اسی میں لگ گئے تھے۔

آپ کو اس تحریک سے نظریاتی وعملی دونوں طرح سے شغف رہا اور اس میں والہیت و انہماک اور جذب واستغراق کی کیفیت اس حد تک تھی کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ جائیں، آپ کو اس تحریک سے عشق کی حد تک تعلق خاطر تھا اور دینی محنت و دعوت کی خاطر جینے و مرنے کی خواہش وتمنا آپ کا سب سے بڑا سرمایۂ زندگی تھا؛ بل کہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ آپ اسی کی خاطر مرنے کو اپنی زندگی سمجھتے تھے، جیسے حضرت مولانا احمد صاحب پرتاب گڑھی نے کہا ہے:

آتش عشق نے جلا ڈالا　　زندگی ہم نے مر کے پائی ہے

آپ ہی کا یہ بھی شعر ہے:

مر کے ہوتی ہے زندگی حاصل　　ایسے مرنے کی تم دعا کرنا

آپ کی ذات تبلیغی اجتماعات کی جان ہوتی تھی، اس لیے آپ برابر قریب اور دور کے اجتماعات میں شامل ہوتے اور ان کی نگرانی وسرپرستی فرماتے، آپ کے خطاب و بیان سے مجمع میں ایک قوت و طاقت کی لہر دوڑ جاتی اور لوگ بڑے متأثر ہوتے، آپ کی دعا بھی پرتاثیر ہوتی اور اس لیے لوگ آپ کی دعا میں شمولیت کے لیے دور دراز مقامات سے آکر شرکت کرتے تھے۔

اسی طرح آپ نے اس تحریک دعوت وتبلیغ کے اصولوں اور طریق کار کے مطابق ملک

و بیرون ملک کے کثرت کے ساتھ اسفار کیے، لوگوں کی ہدایت و اصلاح کی خاطر محنت و مجاہدہ اختیار کیا اور راہ حق میں صعوبتیں اور مشکلات برداشت کیں اور یہ سلسلہ برابر جاری و ساری رہا۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے جن خوبیوں سے نوازا تھا، ان میں ایک یہ کہ آپ کو زبان با تاثیر عطا ہوئی تھی اور قدرت علی الکلام کا وہ ملکہ کاملہ بخشا گیا تھا کہ سننے والوں کے قلوب میں ایک عجیب روحانی و ایمانی رنگ پیدا ہو جاتا، آپ کا خطاب ''اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا'' کا مصداق لگتا تھا، حضرات صحابہ کی تاریخ، ان کے نقوش حیات، ان کی دین کے لیے قربانیاں، وہ اس انداز سے بیان فرماتے تھے کہ پتھر دل بھی پانی ہو جاتا اور اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا؛ چناں چہ اللہ کے بے شمار بندوں نے آپ کے وعظ و بیان اور تقریر و خطاب سے استفادہ کیا اور ہزاروں نے راہ ہدایت پائی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ ایمان و یقین، توکل و اعتماد علی اللہ، انابت و خشوع، خوف و خشیت، تقوی و طہارت اور دین کی خاطر مجاہدات و قربانیاں وغیرہ وغیرہ خصوصیات سے ممتاز کیے گئے تھے؛ مگر اس کے باوجود ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ آپ نہایت سادہ طبیعت اور انتہائی متواضع و منکسر المزاج بھی واقع ہوئے تھے۔ سبھی کے ساتھ اسی سادگی و تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ خوشی و خوشدلی کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔

آپ کئی سالوں سے مختلف امراض و عوارض کا شکار ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے متعدد بار ہسپتالوں میں بھی آپ کو داخل کرنے کی نوبت آتی رہی، ایک دو بار شفا ہسپتال میں ایسے موقعے پر عیادت کے لیے احقر حاضر ہوا اور محسوس کیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ بے پناہ صبر کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے، صحت کی کمزوری اور مختلف امراض و عوارض کے باوجود آپ کی زبان پر کوئی شکوہ شکایت نہیں؛ بل کہ اس کی جگہ شکر ہی شکر ہے۔

آخری سالوں میں متعدد امراض و عوارض کی وجہ سے آپ ضعف و اضمحلال سے دوچار رہتے تھے؛ مگر اس کے باوجود جب بھی صحت نے ذرا بحالی پائی اور کچھ بھی افاقہ محسوس ہوا، تو

دعوت وتبلیغ کی خاطر وہی اسفار ومجاہدات کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ یہ دراصل اس تحریک ''دعوت وتبلیغ'' کے ساتھ آپ کے بے پناہ اشتغال وانہماک اور شغف واستغراق کی بنا پر تھا، جس کو آپ نے اپنی زندگی کا مشن بنالیا تھا۔

آخرکار وہ گھڑی آ ہی گئی، جس سے کسی کو مفر نہیں اور علم وعمل ہو یا مال ودولت، عزت و شہرت ہو، یا طاقت وحکومت کوئی چیز اس کو ٹال نہیں سکتی، اللہ تعالی کے اس قانون واصول ''کل نفس ذائقۃ الموت'' سے کوئی مستثنیٰ نہیں؛ چناں چہ آپ ایک طویل بیماری کے بعد بروز سنیچر بعد عصر ۱۶؍شوال ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۳؍جولائی ۲۰۱۶ء اس دار فانی سے کوچ کر کے راہی ملک بقاء ہوئے۔ **إنا لله و انا اليه راجعون .**

احقر جامعہ مسیح العلوم میں تھا کہ اس کی اطلاع پہنچی اور دل ودماغ کو اس سے صدمہ پہنچا اور بعد مغرب مسجد ہی میں برائے ایصال ثواب ایک مختصر مجلس کا انعقاد کیا گیا اور دعا کی گئی اور پھر بعد عشا مکمل قرآن شریف پڑھ کر ایصال ثواب کیا گیا۔

پھر احقر اور بعض اساتذۂ جامعہ کا ارادہ ہوا کہ گھر پہنچ کر زیارت بھی کرلیں گے اور آپ کے صاحبزادوں وغیرہ رشتہ داروں سے تعزیت بھی ادا کر دیں گے، مگر معلوم ہوا کہ جنازہ گھر سے سلطان شاہ کی جانب لے جایا جا رہا ہے؛ لہذا ہم نے زیارت کے لیے سلطان شاہ کا ہی ارادہ کیا اور وہاں پہنچے، تو معلوم ہوا کہ ارادت مندوں اور عقیدت کیشوں کا بے پناہ اور نا تھمنے والا ایک ہجوم ہے، جو اپنی عقیدت ومحبت کا ثبوت دیتے ہوئے چہار طرف سے امنڈتا چلا آ رہا ہے اور ساری سڑکیں ازدحام کی وجہ سے بند ہیں۔ ہم نے کار کچھ فاصلے ہی پر کھڑی کر دی اور پیدل چلتے ہوئے سلطان شاہ گئے اور وہاں کی حالت تو اور بھی عجیب وغریب تھی کہ لوگ عقیدت ومحبت کے جوش میں ہوش کھوئے جا رہے تھے، سارا مجمع بے قابو تھا، کوئی کسی کی سننے کا روادار نہیں تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ مسجد ہے، اس کا ادب واحترام لازم ہے۔

وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مولانا مرحوم کے وارثین اور ذمے دارانِ سلطان شاہ تجہیز و تکفین اور نماز وتدفین کے سلسلے میں مشورے میں مشغول ہیں ؛ لہذا وہیں پہنچ کر مولانا کے صاحبزادوں اور بعض دیگر رشتہ داروں سے تعزیت ادا کی اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر مشورے میں شمولیت کی اور پھر بڑی مشکلوں کے ساتھ بعض احباب نے چین بنا کر ہمیں زیارت کرائی ، اگر چہ میں کہہ رہا تھا کہ اس ہجوم کو دیکھ کر ہمت نہیں ہورہی ہے ؛ مگر اللہ جزائے خیر دے ان احباب کو کہ انھوں نے بڑی محبت کے ساتھ اپنے اوپر یہ بار اٹھایا اور چین بنا کر زیارت کرنے کا موقعہ فراہم کیا ، مگر لوگوں کا ہجوم اس چین پر بھی بھاری ہورہا تھا ؛ تاہم اللہ اللہ کر کے حضرت والا کی دیدوزیارت سے مشرف ہوئے اور چلے آئے ۔

نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کے لیے شہر اور اطراف وجوانب کے دیگر شہروں اور علاقوں سے عوام وخواص کا بے پناہ ہجوم امنڈتا چلا آرہا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جارہا تھا ، جس سے تمام راستے اور سڑکیں بند ہوگئی تھیں اور دوسرے دن صبح آٹھ بجے چھوٹے میدان میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور دارالعلوم شاہ ولی اللہ کے احاطے میں جو قبرستان ہے ، وہاں تدفین عمل میں آئی ۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالی مرحوم کو اپنے شایان شان جزاء عطا کرے اور ان کی خدمات کو شرف قبول کرے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کے نقوش زندگی کو اپنانے کی توفیق سے نوازے ۔ آمین یارب العالمین ۔

ایک افسوس ناک صورت حال
دینی تعلیم اور مدارس کے سلسلے میں امت کا رول

عالم اسلام میں اور بالخصوص برصغیر ہند و پاک میں ''مدارس اسلامیہ'' کا ایک جال بچھا ہوا ہے، جو اہلِ دین واہلِ علم حضرات کی فکروں وجذبوں اور کاوشوں ومحنتوں کا ثمرہ ونتیجہ ہے اور الحمدللہ! یہ مدارس اسلامیہ اگر ایک جانب علوم دینیہ وشرعیہ کی حفاظت کا کام اپنی اپنی بساط کے موافق سرانجام دینے میں لگے ہوئے ہیں، تو دوسری جانب احکام اسلام وشرائع دین کی تبلیغ ودعوت اور نشر واشاعت کا فریضہ بھی بحسن وخوبی بجالاتے ہیں؛ مگر اہل دل ودانش غرق حیرت واستعجاب ہو جاتے ہیں، جب وہ امت اسلامیہ کا دینی تعلیم اور مدارس کے بارے میں حال وخیال دیکھتے ہیں: کیوں کہ امت کا ایک بڑا طبقہ اسلامی مدارس اور دینی تعلیم کے بارے میں جو رویہ وسلوک روا رکھے ہوئے ہے، وہ انتہائی افسوس ناک ونا قابل فہم ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ بیشتر لوگوں کو یہی نہیں معلوم کہ مدارس میں کیا تعلیم ہوتی ہے اور یہ کہ ان کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ اکثر لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ''مدارس میں بچوں کو قرآن پڑھایا جاتا ہے یعنی ناظرہ خواں یا زیادہ سے زیادہ حافظ بنایا جاتا ہے اور نماز روزہ سکھایا جاتا ہے''۔ یہ جواب اگرچہ صحیح ہے، مگر نہایت ناقص ہے؛ کیوں کہ مدارس میں نماز روزہ ہی نہیں؛ بل کہ تمام ہی دینی حقائق کی اور اسلامی احکامات کی تعلیم ہوتی ہے اور صرف قرآن ہی نہیں، بل کہ ان کے علاوہ تمام اسلامی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور صرف ناظرہ خواں یا حافظ قرآن نہیں؛ بل کہ پڑھنے والوں کو قرآن و حدیث کے معانی و مطالب، ان کی تفسیرات

وتشریحات ، ان سے مستنبط حقائق و معارف اور مسائل و احکام ، ان کا زمانے سے تعلق اور اس پر انطباق کی بھی تعلیم و تفہیم ہوتی ہے اور حافظ قرآن بنانے کے ساتھ ساتھ مفسرین قرآن ، شارحین حدیث ، فقہا و مفتیان ، اُدبا و خطبا ، مؤرخین و مفکرین ، واعظینِ و داعیان اسلام، مصنفین و مؤلفین ، ائمہ مساجد وغیرہ وغیرہ پیدا کیے جاتے ہیں۔

کیا خبر نہیں کہ ان ہی مدارس اور ان کے ان فضلا و علما کا طفیل ہے کہ آج ہزار ہا مخالفتوں اور بے پناہ سازشی چالوں کے باوجود اسلام بھی زندہ ہے اور مسلمان بھی بہ حیثیت ملت زندہ ہیں، معاشرے میں دینی احکامات اور قرآن و سنت کی تعلیمات کا چرچا ہے ، انصاف وحق کی آواز لگائی جارہی ہے ، عفت و عصمت کا درس ہو رہا ہے ، حلال وحرام کی تمیز کی جارہی ہے ، باطل سے نبرد آزمائی ہو رہی ہے اور دین اسلام کو خون کی ضرورت پڑے ، تو خون اور صلاحیتوں کی ضرورت پڑے ، تو صلاحیتوں کی قربانی دی جارہی ہے ، ملت اسلامیہ پر جب جب بھی کوئی آزمائش و امتحان کا موقعہ آیا ، سخت حالات سے وہ دوچار ہوئی ، اسلام مخالف تحریکات و عناصر کی معاندانہ سرگرمیوں کا اس کو ھدف بننا پڑا ، تب یہی بوریہ نشین اور قدیم نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ علما و فضلا میدان میں نظر آئے اور صبر و استقامت ، ہمت و شجاعت ، پامردی و عزیمت کے جوہر دکھاتے ہوئے ملت کی رہبری و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے ۔ اور یہ جماعت یہ سب کچھ انتہائی معمولی تنخواہوں پر انجام دیتی ہے کہ اگر امت ان سارے کاموں کی انجام دہی پر مال و دولت کے خرچ کرنے کی مکلّف قرار دی جائے ، تو شاید ہی وہ اس قدر خرچ کرتی اور وہ کام انجام پاتے ۔

الغرض لوگ عام طور پر مدارس کی اہمیت و ضرورت اور ان کا کام و مقصد کچھ نہیں جانتے ، نتیجہ یہ کہ لوگوں کا مدارس کے بارے میں یہ ناقص تصور مدارس کی ضرورت و افادیت کے بارے میں ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ صرف قرآن پڑھانے اور نماز وروزہ کے لیے مدارس قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور یہ کہ جو لوگ روزہ نماز کے سیکھنے کے لیے مدارس میں داخل ہو جاتے اور وہیں رہ کر اس کو سیکھتے ہیں ، وہ کیوں اپنا اتنا سارا وقت

اس کے لیے لگا کر ضائع کرتے ہیں؟ کیوں کہ اتنے سے کام کے لیے تھوڑا وقت کافی ہے اور انسان اس کے بعد اپنے مختلف معاشی و کاروباری و دنیوی معاملات کی انجام دہی میں لگ سکتا ہے۔

دوسرے اس لیے کہ عام طور پر لوگ مدارس اسلامیہ کو صرف غریب بچوں کے لیے تعلیمی ادارہ سمجھتے ہیں، یہ بھی خلاف واقعہ ہے؛ کیوں کہ یہاں سبھی طبقات کے لیے تعلیم و تربیت کا نظم ہوتا ہے، کیا امیر، کیا غریب اور کیا شاہ، کیا گدا، سب دینی تعلیم کے محتاج اور سب کے سب اس کے مکلّف ہیں؛ لہٰذا مدارس سبھی کی خدمت کرتے ہیں۔ کیا امیر و رئیس کو دین اور دینی علوم کی ضرورت نہیں ہے، کیا وہ اس سے مستغنی ہیں؟

مدارس کے بارے میں اس ناقص تصور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ امیر و رئیس ہیں، یا کھاتے پیتے گھرانے کے ہیں، وہ مدارس میں اپنے بچوں کو داخل نہیں کراتے ہیں، نہ اس کو اپنے شایانِ شان سمجھتے ہیں؛ کیوں کہ ان کا ذہن تو یہ مانتا ہے کہ مدارس غریب خانے یا یتیم خانے ہیں، جہاں وہ شخص داخل ہو، جس کے پاس کھانے کو نہ ہو، جو اسکول کی تعلیم اور وہاں کے اخراجات ولوازمات کو پورا کرنے کے لیے اپنے پاس سامان نہ رکھتا ہو اور وہاں کی فیس و ڈونیشن ادا نہ کر سکتا ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ تصور مدارس کی حیثیت واقعی کے کس قدر خلاف ہے؟ اور اس ناقص اور غیر واقعی تصور کا نتیجہ بھی واضح طور پر آج مشاہد ہوتا رہتا ہے کہ مدارس کی جانب رخ کرنے والے عموماً غریب لوگ اور ان ہی لوگوں کے بچے ہوا کرتے ہیں، امیروں، رئیسوں اور مال داروں کے بچے عام طور پر مدارس میں آتے ہیں، نہ انھیں ان کے ذمے داروں اور سرپرستوں کی جانب سے آنے دیا جاتا ہے۔

اس پر مجھے یاد آ رہا ہے کہ ہمارے جامعہ میں داخلے چل رہے تھے، ایک صاحب اپنے بچے کو لے کر آئے اور داخلے کے لیے درخواست دی، بچہ چھوٹا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بچہ نے اب تک کیا پڑھا ہے؟ تو کہا کہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ میں نے کہا کہ بچہ تو ابھی

چھوٹا ہے، اس لیے آپ بچے کو ابھی اسکول میں مزید پڑھائیں اور ساتھ ساتھ کسی مکتب میں ناظرہ قرآن اور ضروری دینیات بھی پڑھائیں، جب وہ ناظرہ پڑھ چکے، تو لا کر یہاں داخل کردیں۔ اس پر ان صاحب نے کہا کہ مجھے اس لیے اس کو یہاں لانا پڑا کہ اسکول میں پڑھانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے، فیس اور دیگر اخراجات میں سنبھال نہیں سکتا؛ اس لیے یہاں داخل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کی پریشانی دور ہوجائے اور اسکول میں پڑھانے کا کوئی سامان ہوجائے، تو کیا کروگے، اسکول میں دوبارہ ڈال دیں گے؟ اس کا کوئی معقول جواب ان سے بن نہ پڑا تو خاموش ہوگئے۔

اس واقعے سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ امت میں ایسے لوگوں کی بہتات ہے، جو مال پیسہ ہو، تو بچوں کو اسکول میں پڑھائیں گے اور اگر مال پیسہ نہیں ہے، تو مدارس میں داخل کرائیں گے؛ کیوں کہ مدارس کو یتیم خانہ یا غریب خانہ سمجھ لیا گیا ہے یا بعض لوگوں نے ان کو سمجھا دیا ہے۔

تیسرے اس وجہ سے کہ امت مسلمہ کا ایک طبقہ علم دین اور مدارس دینیہ کے بارے میں یہ تصور رکھتا ہے، کہ اس کے لیے کسی عقل وشعور، سمجھ بوجھ کی ضرورت ہی نہیں؛ بل کہ کوئی عقل کا دشمن بھی بڑی آسانی کے ساتھ اس کو حاصل کرسکتا ہے اور یہ کہ مدارس ان بچوں کے لیے ہوتے ہیں، جو اپنی جسمانی کمزوری اور عقلی بے مائیگی کی وجہ سے اسکولوں اور کالجوں کی دنیوی تعلیم حاصل کرنے سے عاجز و درماندہ ہیں اور دنیا میں کوئی اور کام کرنے کی استطاعت وصلاحیت سے بھی محروم ہیں۔

اس بودہ خیال اور انتہائی جاہلانہ تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اپنے بچوں میں سے جو عقل وسمجھ میں ممتاز ہیں، ان کو اسکولوں کے حوالے کرتے ہیں اور دینی تعلیم اور مدرسے کے لیے اُس بچے کا انتخاب کرتے ہیں، جو عقل ودانش سے کوسوں دور ہو اور عقل وفہم کی صلاحیتوں اور خوبیوں سے خالی وعاری ہو۔

چند سال قبل ایک نوجوان لڑکا اپنے ایک چھوٹے بھائی کو لے کر میرے پاس آیا اور

کہنے لگا کہ یہ لڑکا میرا بھائی ہے، میری والدہ نے یہ پوچھا ہے کہ کیا اس کا مدرسے میں داخلہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ مدرسہ تو بچوں کی تعلیم کے لیے ہی قائم کیا گیا ہے؛ لہذا داخلہ تو ہوسکتا ہے۔ کہنے لگا کہ ابھی نہیں؛ بل کہ امی نے کہا ہے کہ یہ ساتویں کلاس میں تین سال سے فیل ہوتا آرہا ہے اور اس سال بھی امتحان دیا ہے، اگر اس سال بھی فیل ہو گیا تو مدرسے میں داخل کر دینا ہے۔

حالاں کہ ذرا سی عقل بھی استعمال کی جائے ،تو یہ بات آشکارا ہے کہ علوم قرآن و حدیث کے لیے نہایت اونچے درجے کی عقل و بصیرت اور فہم و فراست چاہیے اور اعلی درجے کی علمی مہارت و قابلیت درکار ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ علوم تمام انسانوں کے فوز و فلاح ، کامیابی و کامرانی کے لیے بیش قیمت سامان ہدایت اور بیمار و بھٹکتی انسانیت کے تمام روحانی امراض اور عوارض کے لیے نہایت معتبر نسخہ شفا ہیں۔

اب ذرا غور کیجیے کہ کیا دین و شریعت اور قرآن و حدیث پر اس سے بڑا کوئی ظلم ہوسکتا ہے کہ ان کو سمجھنے اور ان کا عالم اور داعی بنانے کے لیے ناسمجھ بچوں اور عقل و دانش کی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے محروم افراد کا انتخاب کیا جائے؟ کیا یہ دین و شریعت کا مذاق نہیں، قرآن و حدیث سے کھلواڑ نہیں اور کیا کلام خداوندی و کلام نبوی کی توہین نہیں؟

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ امت میں مدارس اور وہاں کی تعلیم کے بارے میں اس قسم کے رجحانات و خیالات پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب یہ تصور مدارس کے بارے میں قائم ہوگا، تو لوگ کیوں کہ مدارس کی ضرورت و اہمیت و افادیت کے قائل ہوں گے؟ اور یہ صورتِ حال فی الواقع عوام الناس کی مدارس اسلامیہ سے بعد و دوری اور اہل علم سے توحش و تنگ دلی کا سبب و باعث ہے۔

کہاں تو وہ دور تھا کہ اس علم کی تحصیل میں ملت اسلامیہ کے وہ منتخب و ممتاز افراد حصہ لیتے تھے، جن کی عقل و بصیرت ، جن کا حافظہ و ذہنیت ، جن کی استعداد و صلاحیت اور جن کا تقوی و طہارت کمال و عروج کی منزل پر ہوا کرتے تھے، جو ایک جانب صلاحیتوں کے حامل

ہوتے، تو دوسری جانب صالحیت کے عنصر سے متصف ہوا کرتے تھے۔

غور تو کرو کہ امت نے اُس دور میں اس علم کے لیے جن کو پیش کیا، وہ کون اور کیسے لوگ تھے؟ ان میں ہمیں کہیں مالک وابوحنیفہ دکھائی دیتے ہیں، کہیں حسن بصری وابراہیم نخعی کی زیارت ہوتی ہے، کہیں سعید بن المسیب اور مجاہد بن جبیر قابل غور ہیں، کہیں شافعی واحمد نظر آتے ہیں، کہیں ابو یوسف ومحمد کے چہرے دکھائی دیتے ہیں، کہیں بخاری ومسلم پر نظر جاتی ہے، کہیں ترمذی اور ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ بیٹھے دکھائی دیتے ہیں، کہیں رازی وغزالی کی چلت پھرت کا نظارہ ہوتا ہے، کہیں ابن رشد وابن سینا سامنے آجاتے ہیں، کہیں ابن الصلاح، ابن حبان، نووی اور ابن حجر کے محنتی چہرے بھی نظر آتے ہیں۔

پھر بعد کے ادوار میں بھی ان ہی طلاب کی فہرست میں ہمیں کوئی شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالحق دہلوی، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ اسحاق وشاہ اسماعیل شہید دکھائی دیتے ہیں، ان ہی میں ہم قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، یعقوب نانوتوی، شیخ الہند محمود حسن دیوبندی، انور شاہ کشمیری، اشرف علی تھانوی، شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع دیوبندی جیسی شخصیات بھی صف بستہ نظر آتی ہیں۔

اے ملت اسلامیہ کے روشن ضمیرو! اے دین وملت کے پاسدارو! کیا کبھی اس پر بھی نگاہ ڈالی ہے کہ یہ تو ہے ہمارے روشن ماضی کی تابناک تاریخ؛ مگر اب کا حال کس قدر یاس انگیز ہے کہ علم دین کے لیے ملت اسلامیہ آج ناکاروں اور سست رفتاری کے شکار لوگوں اور غفلت شعاری کے مریضوں کو تلاش کرتی ہے۔ کیا یہ حیرت انگیز اور یاس افزا صورت حال نہیں کہ علم دین کے ساتھ یہ ناروا اور ظالمانہ سلوک کیا جائے اور اس کا حق اس کو نہ دیا جائے؟

میں یہ نہیں کہتا کہ سب کے سب اسی ظالمانہ ویاس انگیز روش کے خوگر ہیں، نہیں اور ہر گز نہیں؛ کیوں کہ بعض لوگ اپنے بچوں میں سے ایسے بچوں کا بھی اس کے لیے انتخاب کرتے ہیں، جو واقعی اس کے لائق ہوتے ہیں اور اس کے لیے جن صفات خاصہ کی ضرورت ہے، ان میں وہ بہتر طور پر پائی جاتی ہیں، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب نہیں، تو بہت بڑا طبقہ

ایسا ہے، جو اسی ظالمانہ کردار اور رویے کا عادی وخوگر ہو چکا ہے؛ لہذا اس بات کی ایک زبر دست تحریک اور مہم امت اسلامیہ میں چلانے کی شدید ضرورت ہے کہ وہ علم دین کی حقیقت کو سمجھ کر اور دین کی عظمت وجلالت کو جان کر اس کے لیے عمدہ سے عمدہ صلاحیت کے بچوں اور قابل وفائق طلبہ کا انتخاب کریں اور اہل مدارس کے حوالے کریں کہ وہ ان کو بنائیں۔

اگر اس طرح انتخاب ہو اور علم دین ایسے لوگوں کو پڑھایا جائے، تو آزمائیے اور دیکھیے کہ رازی وغزالی اب بھی ان مدارس سے پیدا ہوں گے؛ چناں چہ عقل و دانش اور تفقہ وبصیرت کے حامل جو طلبہ اس راہ میں داخل ہوتے ہیں اور مدارس کا رخ کرتے ہیں اور محنت ومجاہدات کے ساتھ پڑھتے ہیں، وہ آج بھی ماشاء اللہ بہت کچھ بنتے ہیں اور اپنے اسلاف کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کے حضرات سے علم کی یہ دنیا آباد ہے اور یہ کاروان علم وہدایت اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔

لوگ یہ اعتراض تو کرتے ہیں کہ مدارس سے اب پہلے جیسے علما کیوں پیدا نہیں ہوتے، مگر یہ نہیں دیکھتے کہ پہلے لوگ اس کام کے لیے کن لوگوں کا انتخاب کیا کرتے تھے اور آج کن کا انتخاب ہوتا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ایک جگہ بیان کیا ہے:

”ہم نے آج تک کسی ہمدردِ قوم کو نہیں دیکھا کہ اس نے قومی ہمدردی میں اپنی اولاد کو پڑھایا ہو؛ کیوں کہ سمجھتے ہیں کہ علم دین پڑھ کر ہماری اولاد کو یہ بڑے بڑے عہدے کہاں مل سکیں گے؟ اور اگر کسی نے اپنی اولاد میں سے کسی کو علم دین کے لیے تجویز بھی کیا، تو اس کو جو سب میں احمق اور کودن ہے، سبحان اللہ! کیا علومِ شریعت کی قدر کی ہے صاحبو! غور کیجیے کہ جب سارے الو ہی پڑھیں گے، تو وہ الو ہی رہیں گے۔ مولوی منفعت علی صاحب سلمہ سے ایک شخص نے کہا ہے کہ کیا وجہ علماء میں اب رازی وغزالی پیدا نہیں ہوتے؟ انھوں نے کہا کہ اس وقت انتخاب کا قاعدہ یہ تھا کہ قوم میں جو سب سے ذہین اور ذکی

ہو، وہ علوم دین کے لیے منتخب ہوتا اور اب قاعدہ یہ ہے کہ جو سب میں احمق اور غبی ہو، اس کے لیے تجویز ہوتا ہے۔''

(خطبات حکیم الامت:۳/ ۲۵۰-۲۵۱)

الغرض آج امت کے اس رویہ وروش کو یکسر بدلنے اور ان کے دلوں میں ایک بات اُتارنے کی شدید ضرورت ہے کہ علم دین خود دین ہے، جیسا کہ امام ابن المبارک نے فرمایا کہ:''**إن هذا العلم دين**'' اور یہ ظاہر ہے کہ دین ہماری اور تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک لابدی چیز ہے، جس کے بغیر کسی مسلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور اس دین اور اس کے متعلقہ علوم کا بقا و دوام اس پر موقوف ہے کہ اس علم کے علما و فقہا پیدا ہوں، اس کے واعظ و داعی پیدا ہوں، اس کی حفاظت و بقا کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے والے افراد تیار ہوں؛ لہٰذا ایسے افراد کو پیدا کرنے اور تیار کرنے کے لیے بہترین صلاحیتوں کے مالک اور عمدہ سے عمدہ قوت حافظہ و ذہن اور طاقت عقل و بصیرت سے لیس طلبہ کو اس میدان میں اتارنا چاہیے۔

مؤمن کی زندگی پر استحضار آخرت کے اثرات

اسلام نے مؤمنانہ زندگی کی اساس و بنیاد کے لیے جن نظریات وعقائد کو بڑی اہمیت دی ہے، ان میں جہاں توحید و رسالت کو بڑا مقام دیا گیا ہے، وہیں عقیدۂ آخرت بھی ایک عظیم مقام کا حامل ہے؛ کیوں کہ یہ عقیدہ ایک ایسا محور ہے، جس کے ارد گرد تمام اعمال و عبادات گردش کرتی ہیں؛ وجہ یہ ہے کہ جب ایک انسان اس عقیدے کا پابند ہوتا ہے کہ اسے اپنے ہر عمل کی جزاوسزا کے لیے آخرت میں اٹھایا جائے گا اور اللہ رب العزت کے دربار عالی میں پیش کیا جائے گا اور حساب وکتاب کے مراحل سے اس کو گزارا جائے گا، پھر اپنے عمل کے مطابق جزاوسزا کا فیصلہ ہوگا اور جنت یا دوزخ کو ٹھکانہ بنایا جائے گا،تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی زندگی کا منہج و انداز اس شخص کے منہج و انداز سے کلی طور پر مختلف بنائے گا، جو اس عقیدے کا پابند نہیں اور اس کا منکر یا اس سے غافل ہے۔

کیا آخرت پر یقین رکھنے والا نماز و روزہ و دیگر فرائض اسلامی سے غفلت کرتے ہوئے زندگی گذار سکتا ہے؟ کیا آخرت پر ایمان و یقین اس کو نمازوں اور عبادتوں سے غفلت میں پڑے رہنے کی کوئی گنجائش دے سکتا ہے؟

کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اس عقیدۂ آخرت پر ایمان و یقین اور اس کا استحضار رکھتا ہو اور وہ منکر آخرت یا اس سے غافل انسان کی طرح دنیا ہی کو مقصود بنا لے؟ حلال وحرام کی تمیز کھو دے، لوگوں کا مال لوٹ لے، لوگوں کو دھوکہ دہی وفریب میں مبتلا کرتا پھرے ؟ ظاہر ہے کہ ایک مؤمن جو آخرت کو مانتا ہو اور اس سے غافل بھی نہ ہو، وہ ایسا نہیں کرسکتا۔

اسی طرح ایک مؤمن جس نے آخرت کے بارے میں یہ جان لیا ہو، کہ وہاں کی جزا

وسزا کیا ہے اور کیسی؟ اور یہ کہ اس سے کسی کو رستگاری کی کوئی سبیل نہیں، وہ کسی کا کوئی حق دبا سکتا ہے کسی کو کوئی تکلیف دے سکتا ہے، کسی سے بدسلوکی کر سکتا ہے؟ کسی کی آبرو وعزت یا جان و مال کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں، یہ کام اسی کا ہو سکتا ہے، جس کو آخرت یاد نہ رہی ہو اور وہ اس سے غفلت میں مبتلا ہو گیا ہو۔

ظاہر کہ یہ عقیدہ اس کی زندگی کے ہر کام پر اثر انداز ہوتا ہے؛ اس لیے اس عقیدے کے حامل کی زندگی یکسر مختلف ہوتی ہے، جب اس کا تقابل ایک غیر مؤمن اور آخرت سے غافل انسان کی زندگی سے کیا جاتا ہے۔

مگر آج اسلام کے دعوے داروں میں بیشتر لوگ وہ ہیں، جن کی زندگیاں استحضار آخرت سے خالی نظر آتی ہیں اور اس کے نتیجے میں لوگ ہر قسم کی برائیوں وکوتاہیوں میں مبتلا ہیں، خواہ وہ عبادت کی قبیل سے ہوں یا معاملات کی، یا معاشرت سے متعلق ہوں یا اخلاقیات سے، ظلم وزیادتی، لوٹ کھسوٹ، شراب وکباب، زنا کاری وبے حیائی سودخوری و رشوت بازی وغیرہ جرائم کی بھرمار مسلم معاشرے میں جو دکھائی دیتی ہے، آخر اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ آخرت کا تصور انتہائی کمزور پڑ گیا ہے اور جب یہ استحضار ہی نہیں رہا، تو قبر و حشر اور حساب وکتاب سب سے غافل ہو گئے۔

اس انقلابی عقیدے کا اثر انسانی زندگی پر کیا ہوتا ہے؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ حضرت فضل بن عباس کہتے ہیں کہ میرے پاس اللہ کے رسول ﷺ تشریف لائے اور میں آپ کے ساتھ نکلا، میں دیکھا کہ آپ کو سخت بخار ہے اور آپ نے اپنے سر پر پٹی باندھ رکھی ہے، آپ نے فرمایا کہ: اے فضل! میرا ہاتھ پکڑ لو، میں نے آپ کا ہاتھ تھام لیا اور آپ منبر کے پاس پہنچے اور اس پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ لوگوں میں آواز لگا دو، میں نے ایک آواز لگائی۔ لوگ جمع ہو گئے، آپ نے اللہ کی حمد وثنا کی پھر فرمایا:

''اے لوگو! تمہارے درمیان سے میرے چلے جانے کا وقت آ گیا ہے اور

دوبارہ تم مجھے اس مقام میں نہ دیکھ سکو گے۔اور دیکھو، میں بھی تم جیسا ایک بشر ہوں، اگر میں نے کسی کی پیٹھ پر کوڑے لگائے ہوں، تو یہ میری پیٹھ حاضر ہے، وہ مجھ سے اس کا بدلہ لے لے۔اور جس کا میں نے مال لے لیا ہو، تو یہ میرا مال رکھا ہے، وہ مجھ سے اپنا مال وصول کر لے اور جس کو میں نے گالی دی ہے، بے عزت کیا ہے، وہ بھی مجھ سے بدلہ لے لے اور تم میں سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ رسول اللہ ﷺ کے دل میں اس کی وجہ سے برائی آ جائے گی، خبردار ! دل میں برائی رکھنا میری فطرت وطبیعت نہیں ہے۔اور خبردار! میرے نزدیک وہ سب سے بہترین انسان ہے، جو آج مجھ سے اپنی چیز وصول کر لے یا مجھے معاف کر دے؛ تاکہ میں اللہ سے ملاقات اس حال میں کروں کہ مجھ پر کس کا کوئی حق باقی نہ رہے۔ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ بات اس وقت تک کافی نہ ہوگی کہ میں بار بار اس کا اعلان نہ کروں، پھر آپ منبر سے اترے اور ظہر کی نماز پڑھی، پھر منبر پر آئے اور وہی اعلان کیا، پھر فرمایا کہ جس کے پاس کسی کا کوئی حق ہو وہ لوٹا دے، یہ نہ کہے کہ اس سے دنیا کی رسوائی ہوگی، بلاشبہ دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی کے مقابلے میں معمولی سی ہے۔ایک شخص کھڑے ہوئے اور کہا کہ میرے تین درہم آپ کے پاس ہیں۔آپ نے فرمایا کہ میں کسی کی تکذیب نہیں کرتا اور نہ اس سے کوئی قسم لوں گا؛ لیکن یہ بتاؤ کہ یہ تین درہم میرے پاس کیسے آ گئے؟ انھوں نے کہا کہ آپ یاد کریں، اس دن کو کہ ایک مسکین گزر رہا تھا، آپ نے اس کو دے دینے کا مجھے حکم فرمایا تھا۔آپ ﷺ نے حضرت فضل سے کہا کہ ان کو تین درہم دے دو۔ پھر ایک اور صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ میرے ذمے میں تین درہم ہیں۔آپ نے پوچھا کی کیسے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے مال غنیمت سے لے لیا تھا۔آپ نے پوچھا کی کیوں لیے تھے؟ انھوں نے

عرض کیا کہ میں محتاج تھا۔ آپ نے فضل سے کہا کہ ان سے تین درہم وصول کرلو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم میں سے جس کو خوف ہو، وہ کھڑا ہو، میں اس کے حق میں دعا کرتا ہوں۔ ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ میں کذاب ہوں، میں منافق ہوں اور بہت سوتا ہوں۔ آپ نے ان کے حق میں دعاء کی کہ اے اللہ! ان کو سچائی اور ایمان عطا فرما اور جب یہ بیدار ہونا چاہیں، تو ان کی نیند کو دور فرما۔ پھر ایک اور شخص کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں بڑا جھوٹا ہوں، منافق ہوں اور کوئی گناہ ایسا نہیں کہ میں نے نہ کیا ہو۔ حضرت عمر نے ان سے کہا کہ تم نے اپنے آپ کو رسوا کرلیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عمر! چھوڑو، دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی کے لحاظ سے بہت ہلکی و معمولی ہے۔ پھر آپ نے ان صحابی کو بھی دعا دی کہ اے اللہ! ان کو صدق و ایمان عطا فرما اور ان کے معاملے کو خیر کی جانب موڑ دے۔

(مسند ابو یعلی: ۶۸۲۴، سنن بیہقی: ۱۱۷۳۶، معجم کبیر: ۱۵۱۱۹، معجم اوسط: ۲۶۲۹، دلائل النبوۃ للبیہقی: ۱۷۹/۷، مختصر تاریخ دمشق: ۲۳۰/۱)

اسی قبیل کا یہ واقعہ بھی تاریخ کی شہادت نے محفوظ کیا ہے کہ امام مغازی محمد بن اسحاق رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ بدر کے دن اللہ کے رسول ﷺ لوگوں کی صفوں کو درست کررہے تھے اور آپ کے ہاتھ میں لکڑی تھی، آپ نے صفوں کو درست کرتے ہوئے ایک صحابی حضرت سواد بن غزیہ کو دیکھا کہ وہ صف سے باہر نکلے ہوئے ہیں، تو آپ نے لکڑی سے ان کے پیٹ کو مارا اور کہا کہ اے سواد! ٹھیک کھڑے ہوجاؤ۔ اس پر حضرت سواد بن غزیہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کو اللہ نے حق و عدل کے ساتھ بھیجا ہے اور آپ نے مجھے تکلیف دے دی؛ لہذا میں آپ سے اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنے پیٹ کو دکھا کر کہا کہ آجاؤ، بدلہ لے لو۔ ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے عرض کیا کہ میرے پیٹ سے اس وقت کپڑا ہٹا ہوا تھا؛ لہذا آپ اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹالیں۔ آپ نے پیٹ

سے کپڑا ہٹالیا اور انھوں نے لپٹ کر آپ کو بوسہ لے لیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا کہ اے سواد! کس بات نے تم کو اس پر ابھارا تھا؟ انھوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے دیکھا کہ جنگ کرنے جا رہا ہوں؛ اور مجھے بچنے کی امید نہ تھی، میں نے سوچا کہ آپ سے جدا ہوتے ہوئے سب سے آخری یہ کام ہو کہ میرا جسم آپ کے جسم سے مس ہو جائے۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر ان کو دعا دی۔

(معرفۃ الصحابہ لابی نعیم: ۱۰/۱۷، سیرت ابن ہشام: ۳/۴/۱۷۴، الروض الانف: ۳/۶۷، الاکتفاء بما تضمنہ من مغازی رسول اللہ: ۲/۲۰، عیون الاثر: ۱/۳۳۶)

یہی نہیں؛ بل کہ اگر کبھی اتفاق سے کسی کو تکلیف پہنچی، تو آپ ﷺ نے اس کو خوش کرنے کی بھی فکر کی ہے، جیسا کہ دارمی وغیرہ میں ابن اسحاق سے روایت ہے کہ ایک صحابی نے بیان کیا کہ غزوۂ حنین کے موقعے پر میں سخت قسم کے جوتے پہنا ہوا تھا، میں نے انھیں جوتوں سے بھیڑ کی وجہ سے آپ ﷺ کے پیروں کو روند دیا، جس سے آپ کو سخت تکلیف ہوئی۔ آپ نے اپنے کوڑے سے مجھے دفع کیا اور فرمایا کہ بسم اللہ، تو نے مجھے بڑی تکلیف دی۔ وہ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رات بڑی بے چینی سے گزاری، یہ سوچتے ہوئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب صبح ہوئی، تو ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ فلاں شخص کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ وہ میں ہوں جس سے کل ایسا ہو گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمت میں ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ کل تم نے اپنے جوتوں سے میرا پیر روند دیا تھا اور میں نے تم کو اپنے کوڑے سے دفع کر دیا تھا۔ یہ لو، اسی (۸۰) بھیڑیں ہیں۔

(سنن دارمی: ۷۲)

یہ ہے وہ حیرت انگیز اثر عقیدۂ آخرت کا، جس کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ نے باوجود معصوم ہونے کے چاہتے ہیں کہ کسی کا کوئی حق نہ رہ جائے

اور دنیا ہی میں معاملہ صاف ہو جائے۔

حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک بار ارشاد فرمایا:

” لو ماتت شاة على شط الفرات ضائعة لظننت أن الله عز و جل سائلي عنها يوم القيامة.

(حلیۃ الاولیاء: ۱/۵۳)

ایک دفعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ اپنے کجاوے پر بیٹھے دوڑ رہے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ امیر المؤمنین! کہاں جا رہے ہیں؟ تو فرمایا کہ صدقے کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ بھاگ گیا ہے، اس کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ حضرت علی نے فرمایا کہ: حضرت! آپ نے تو اپنے بعد کے خلفا کو ذلیل کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ اے ابو الحسن! مجھے ملامت نہ کرو، اس خدا کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت دے کر بھیجا ہے، اگر ایک اونٹنی کا بچہ بھی فرات کے کنارے پکڑ لیا گیا، تو اس کی وجہ سے قیامت کے دن عمر کی بھی پکڑ ہو گی۔

(مناقب عمر لابن الجوزی: ۱۶۱، محض الصواب فی فضائل عمر بن الخطاب: ۲/۶۲۱)

حضرت ابو سلامہ سلمی کہتے ہیں کہ ایک بار میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا، جب کہ آپ حرم میں مردوں اور عورتوں کی پٹائی کر رہے تھے، جو ایک ہی حوض سے وضو کر رہے تھے۔ پھر ان کو چھوڑ کر اچانک نکلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور فرمایا کہ ”**إني أخاف أن أكون هلكت**“ (مجھے اندیشہ ہے کہ میں کہیں ہلاک تو نہ ہو گیا) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیوں؟ تو فرمایا کہ میں نے کچھ مردوں اور عورتوں کو حرم میں مارا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! آپ ایک ذمے دار ہیں؛ لہذا اگر آپ نے ان کو بہ طور عبرت و نصیحت مارا ہے، تو اللہ آپ سے بدلہ نہیں لے گا اور اگر آپ نے ان کو دھوکے سے مارا ہے، تو آپ ظالم و مجرم ہیں۔

(مناقب عمر: ۱۶۱، محض الصواب: ۲/۶۲۲)

ایک صحابی ابوعبداللہ نامی کا واقعہ احادیث میں مذکور ہے، جوان کے فکر آخرت اور اس کے استحضار کی واضح دلیل ہے؛ چناں چہ حضرت ابونظرہ کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے ایک شخص جن کو ابوعبداللہ کہا جاتا تھا، لوگ ان کی عیادت و تیمارداری کے لیے ان کے پاس گئے اور یہ صحابی رو رہے تھے، لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ کہنے لگے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اللہ تعالی نے ایک مٹھی (انسانوں کی روحوں کی) اپنے داہنے ہاتھ سے لی اور ایک مٹھی دوسرے ہاتھ سے، پھر فرمایا کہ یہ (مٹھی کی روحیں) اس (جنت) کے لیے اور یہ (دوسری مٹھی کی روحیں) اس (جہنم) کے لیے ہیں اور مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں۔ وہ صحابی کہنے لگے کہ مجھے خبر نہیں کہ میں کس مٹھی میں تھا (اس لیے رو رہا ہوں۔)

(مشکاۃ المصابیح: ۱۲۰)

اپنے عاقبت وانجام کیا ہوگا؟ اس فکر نے ان کو اپنی بیماری میں رونے پر مجبور کر دیا اور وہ بے قرار ہو گئے کہ معلوم نہیں کہ مجھے اللہ نے کس مٹھی میں شمار کیا ہوگا، اہل جنت کی مٹھی میں یا اہل جہنم کی مٹھی میں؟ جب کہ ہمارا ایمان و یقین ہے کہ وہ صحابی اپنی زندگی میں طاعات و عبادات میں کوئی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے ہوں گے اور شرعی و اخلاقی ذمے داریوں میں کسی نامناسب کام کا ارتکاب نہیں کیا ہوگا؛ مگر پھر بھی یہ گھبرانا اور پریشان ہونا فکر آخرت ہی کا نتیجہ ہے۔

ایک واقعہ یہ بھی سنتے چلیے کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ جن کی زندگی نیکی و طاعت اور اصلاح خلق و دعوت و تبلیغ دین میں گزری، انھوں نے جو وصیت لکھی ہے، اس میں ایک بات یہ بھی تحریر کی:

> ''میرے بعض اخلاق سیئہ کے سبب بعض بندگان خدا کو حاضرانہ یا غائبانہ میری زبان و ہاتھ سے کچھ کلفتیں پہنچی ہیں اور کچھ حقوق ضائع ہوئے ہیں، خواہ اہل حقوق کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، میں نہایت عاجزی سے سب چھوٹوں بڑوں سے استدعا کرتا ہوں کہ للہ دل سے ان کو معاف فرما دیویں،

اللہ تعالی ان کی تقصیرات سے درگزر فرماویں گے، میں بھی ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ان کو دارین میں عفو وعافیت عطا فرماویں۔ معذرت کرنے والے کی تقصیر سے درگذر کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اگر معاف کرنے کی ہمت نہ ہو، تو حسب فتوی شرعی مجھ سے عوض لے لیں، خدا کے لیے قیامت پر مواخذہ نہ رکھیں کہ اس کا کسی طرح تحمل نہیں۔

(حیات اشرف:۲۱۱، اشرف السوانح:۱۲۵/۳)

یہ سارے واقعات ہمارے اسلاف و بزرگان دین کے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ان حضرات کو آخرت کا فکر و استحضار کس قدر تھا اور آج ہمارے اندر اسی بات کی کمی ہے ،جس نے ہماری زندگیوں کو روحانیت سے خالی اور خوبیوں سے عاری اور تمام قسم کی برائیوں اور قبائح میں ملوث کر دیا ہے۔

آج ضرورت اسی بات کی ہے کہ امت میں آخرت کی فکر اور اس عقیدے کا استحضار پیدا کیا جائے ،جس سے امت میں صلاح وتقوی، نیکی و طاعت، انابت وخشوع ،خوف و خشیت کی صفات پیدا ہوں گی۔

یکساں سول کوڈ
اور
مسلمانوں کا نقطۂ نظر

سول کوڈ (Uniform civil code) کی آواز ایک بار پھر ماحول میں گونج اٹھی ہے، جب کہ اس سے قبل بھی متعدد مواقع پر وقفے وقفے سے بڑی شد و مد کے ساتھ یہ آواز اٹھائی گئی تھی اور بالآخر دب بھی گئی تھی؛ مگر کچھ سیاسی وانتخابی مصالح ومقاصد اور بعض لوگوں کے ذاتی اغراض ومفادات کی تحریک پر اس طرح کی آواز بار بار اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

چناں چہ اب پھر اس آواز کو بلند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے؛ حالاں کہ ایک کھلی حقیقت کے طور پر سب جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے، جو ایک طویل وقدیم زمانے سے مختلف مذاہب، متعدد تہذیبوں، متنوع زبانوں اور کئی ایک معاشرتی و عائلی نظاموں کا گہوارا چلا آ رہا ہے اور اس کا ایک فطری نتیجہ یہ ہے اور ہونا چاہیے کہ یہاں کی مختلف اقوام وملل کو ان کی تہذیب وتمدن اور ان کے عائلی ومعاشرتی نظام کے ساتھ ان کو رہنے کا حق دیا جائے، اسی وجہ سے ہندوستانی آئین نے ملک کے تمام باشندگان کو جو بنیادی حقوق دئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر قوم وملت کو اس کے مذہبی قوانین پر عمل کی آزادی ہے اور اس میں کسی کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔

چناں چہ اس قانونی دفعہ کی عبارت ملاحظہ کیجیے:

Morality and health Subject to public order

and to the other provisions of this part , all persons are equally entitled to freedom of conscience and the right freely to profess, practise and propagate religion.

(The Constitution of India: Article:251)

(امن عامہ، اخلاق اور صحت اور نیز اس حصے میں مندرج دوسرے دفعات کوملحوظ رکھتے ہوئے تمام اشخاص کوضمیر کی آزادی اور آزادانہ طور پر مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور تبلیغ واشاعت کا یکساں حق ہوگا۔).

دستور ہند کی یہ دفعہ یوں ہی شامل نہیں کر دی گئی؛ بل کہ اس کے پیچھے ملک کے قابل دستور سازوں اور ماہر قانون دانوں کا دل و دماغ خرچ ہوا ہے، ان کی بہترین قوتیں و صلاحیتیں اس پر لگی ہیں، اس کے ایک ایک نقطے پر طویل مباحثے اور عمیق تبصرے کا ایک سلسلہ چلا ہے اور بال کی کھال نکالی گئی ہے، ان سارے مراحل سے گزرنے کے بعد یہ قانون بنا اور اس کا نفاذ عمل میں آیا ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان ماہرین قانون اور دستور ساز حضرات کے پیش نظر ضرور یہ رہا ہوگا کہ کوئی ایسا قانون نہ بنے، جس میں ملک کی سلمیت کو خطرات در پیش ہوں اور یہاں کے باشندوں کے درمیان بالخصوص اقلیتوں کے مابین نفرت و کدورت کا بیج پڑ جائے۔ اور ان حضرات کی دیانت داری، ملک سے وفاداری اور ان کی بے لوث حب الوطنی سے یہی امید ہے اور ہونا چاہیے کہ ان لوگوں نے اس نقطے کو ہرگز فراموش نہیں کیا ہوگا کہ یہاں کا قانون اس دیش کی سبھی اقوام و ملل اور یہاں کے سبھی باشندوں کے لیے باعث اطمینان وسکون ہو اور وہ سب اس ملی جلی تہذیب وتمدن اور متعدد مذاہب وعقائد رکھنے والے ملک میں خود کو اور اپنے دین و مذہب اور تہذیب وتشخص کو محفوظ تصور کریں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ دفعہ اسی حقیقت پسندی، روشن ضمیری، بلند نگاہی، اصول پسندی اور جمہوریت کے حقیقی تصور کی آبیاری کے نیک جذبات وخواہشات کی بنا پر دستور

میں شامل کی گئی ہے، جو بلا شبہ ملک کی تعمیر وترقی، اس کی سلمیت وتحفظ اوراس کے بقاء واستحکام کی ضامن ہے۔

اس قانون کی رو سے یہاں کا ہر باشندہ یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے پسند کے مذہب کو اختیار کرے اوراس پرعمل کرے اوراس کی اشاعت کرے۔

اور یہ ''مذہبی آزادی'' کا حق جو ہندوستانی آئین نے یہاں کے باشندوں کو دیا ہے، یہ قانون کے اس حصے میں شامل ہے، جو آئین ہند کا بنیادی ڈھانچہ کہلاتا ہے اور یہ حصہ ہے، جس کے بارے میں آرٹیکل:۱۳(۲) میں یہ کہا گیا ہے کہ:

> The state shall not make any law which takes away or bridges the rights conferred by this part and any law made in contravention of this clause shall, to the extent of the contravention, be void.

(The Constitution of India: Article:13(2))

(اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مملکت کوئی قانون ایسا نہیں بنائے گی، جو اس حصے میں عطا کیے ہوئے قانون کو چھین لے یا کم کردے اور جو قانون اس کے خلاف بنے گا، وہ خلاف ورزی کی حد تک باطل ہوگا۔)

اوراس کے برخلاف یکساں سول کوڈ کا ذکر آئین ہند کی ان دفعات میں شامل کیا گیا ہے، جو (Directive Principles) ''رہنما اصول'' کا درجہ رکھتے ہیں اور بنیادی حقوق میں داخل نہیں۔

مگراس کے باوجود بعض لوگ یکساں سول کوڈ کو پوری شدومد کے ساتھ اٹھاتے ہیں اور اس میں ایک جانب ''یکساں سول کوڈ''(Uniform civil code) کی اہمیت جتاتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ ملک کی وحدت وسلمیت اوراس کے مشترک وطنی مقاصد کے حصول

کے لیے لازم ہے کہ ایک ''مشترک عائلی قانون'' نافذ کیا جائے ؛ کیوں کہ جب ایک ملک کے باشندگان میں مختلف نظریات وقوانین کا نفاذ ہوگا، تو ان کی وحدت پارہ پارہ ہوگی اور ملک کی سلمیت کو خطرات درپیش ہوں گے۔

اور دوسری جانب اس بات کی بھی بھرپور کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام کے ''عائلی قانون'' اور ''مسلم پرسنل لاء'' کو طبقۂ نسوان کے حق میں ناانصافی پر مبنی قرار دیا جائے، اس کو موجودہ زمانے کے لحاظ سے فرسودہ اور دقیانوسی اور قدیم تہذیب ومعاشرت کی یادگار ٹھہرایا جائے اور اس کو ناقص اور ظالمانہ اور موجودہ احوال وکوائف کا ساتھ دینے سے عاجز ولاچار اور معاصر احوال میں ناکام ٹھہرایا جائے ؛ اس لیے کبھی اس قانون کو عورتوں کی حق تلفی کا ذمے دار کہا جاتا ہے اور کبھی ان کے حق میں ظالمانہ ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ اور اس تاثر دینے اور قائم کرنے میں اسلام دشمن عناصر مختلف ذرائع ابلاغ کو کام میں لاتے اور پروپگنڈہ مہم چلاتے رہتے ہیں۔

اس طرح ان لوگوں کی یہ کوشش دو محاذوں پر ہوتی ہے: اگر ایک جانب یکساں سول کوڈ کی اہمیت وضرورت، اس کی افادیت وعظمت کے ثابت کرنے کے لیے ہے، تو دوسری جانب مسلم پرسنل لاء میں اصلاح وترمیم کی ضرورت کو ابھارنے کے لیے ہے۔

لہذا ہم یہاں دونوں ہی زاویوں سے اس موضوع پر کلام کرنا چاہتے ہیں: جہاں تک یکساں سول کوڈ کی اہمیت کا تعلق ہے، اس کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے آپسی نفرتیں دور ہوتی ہیں اور اتحاد کی فضا قائم ہوتی ہے، ہم اس سلسلے میں اوپر اشارے دیتے آئے ہیں کہ دستور کے بنیادی حقوق والے حصے میں یکساں سول کوڈ کی دفعہ شامل نہیں ہے ؛ بل کہ اس کو رہنما اصول کے تحت لایا گیا ہے۔ اور یہ بھی ہم نے واضح کیا ہے کہ دستور سازوں اور ماہر قانون دانوں کے طویل وعمیق بحث ومباحثے کے بعد ہندوستان کے مجموعی احوال وکوائف اور یہاں کے باشندگان کی فطرت وطبیعت کے پیش نظر ہی یہ دفعہ شامل قانون کی گئی اور ان کے پیش نظر ملک کی سلمیت واستحکام اور اس کا تحفظ وبقا ضرور رہا ہوگا ؛

لہذا اگر یہ مانا جائے کہ ملک کی سلمیت واستحکام یکساں سول کوڈ ہی میں مضمر ہے، تو ایک بڑا سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ کیا قانون سازوں نے بنیادی حقوق میں مذہب کی آزادی کا قانون بنا کر ملک کی سلمیت کو خطرے میں ڈال دیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو پھر ملک کی سلمیت واستحکام کو اس سے جوڑنے کی کیا ضرورت پیش آرہی ہے؟

دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ کیا مختلف تہذیبیں اور مختلف عائلی ومعاشرتی قوانین نے کبھی باہمی نفرت وعداوت، آپسی ٹکراؤ اور نزاع اور بین ملی تناؤ وانتشار پیدا کیا ہے؟ جس کی وجہ سے یہ علاج تجویز کیا جائے کہ یکساں سول کوڈ نافذ ہو؟ واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی فساد و نزاع، باہمی نفرت وعداوت اور انتشار وافتراق کی فضا پیدا ہوئی اور قائم ہے، تو اس کی کوئی ذمے داری یہاں کے مختلف عائلی ومعاشرتی نظامات اور ان کے مسائل پر قطعاً عائد نہیں ہوتی؛ بل کہ اس افتراق وانتشار اور اس نفرت وکدورت کا اصل محرک وسبب ان سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کی جانب سے کی جانے والی وہ مجرمانہ جدوجہد ہے، جو لوگوں میں نفرت و عداوت کا بیج ڈال کر اپنے حقیر وذلیل سیاسی مفادات ومقاصد کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔

اگر ''عائلی قانون کی یکسانیت'' آپسی اتحاد واتفاق کی ضامن ہوتی، تو متعدد ممالک میں جہاں کا عائلی قانون؛ بل کہ دین ومذہب سب کا سب یکساں ہے، وہاں کبھی آپسی ٹکراؤ اور اختلاف اور باہمی نفرت وکدورت کی فضا کبھی قائم نہ ہونا چاہیے تھا؛ لیکن یہ حقیقت کس سے پوشیدہ ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم جو ابتداء برطانیہ وجرمنی کے مابین ہوئی اور پھر ان کے شعلوں نے بھڑک کر مشرق تا مغرب متعدد ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، یہ دونوں ملک دین ومذہب اور عائلی ومعاشرت قوانین کے لحاظ سے مکمل طور پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور متحد ومتفق ہیں، دونوں دین عیسائیت کے علمبردار، اور اس میں بھی دونوں ایک ہی طبقے ''پروٹسٹنٹ'' سے متعلق اور تمام قوانین ومسائل میں ایک ہیں، مگر اس کے باوجود ان دونوں میں یہ عظیم جنگ کیوں برپا ہوئی اور اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں کہ نفسانی تقاضوں کی تکمیل کا مجرمانہ جذبہ، مال ودولت

کی حرص و ہوس اور دنیا پرستی و مادہ پرستی کے نشہ و جنون نے ان میں یہ نفرت و عداوت اور یہ افتراق و انتشار قائم کر کے جنگ بر پا کردی، پھر اسی کے ساتھ انسانیت و اخلاق کا فقدان ،قانون خداوندی سے بغاوت ،اپنی موت و آخرت سے غفلت نے اس کو مزید تقویت پہنچادی اور وہ سب کچھ ہوا جو ہوا اور دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور حیرت زدہ ہوئی۔

یہی نہیں، دینا کے مختلف حصوں میں بل کہ خود ہندوستان کے بعض علاقوں میں پانی کے مسئلے پر یا زبان کے مسئلے پر کیا کیا نہیں ہوا اور ہو رہا ہے؟ کیا ان مسائل پر لڑنے والوں کا دین و مذہب ایک نہیں؟ کیا ان کے عائلی قوانین و مسائل ایک نہیں؟ پھر ان میں یہ خانہ جنگی اور قتل و غارت گری کے واقعات کیوں پیش آرہے ہیں؟ اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جاسکتی کہ عائلی قانون یا دین و مذہب کا اختلاف نہیں ؛ بل کہ دلوں کا بغض و فساد ہے، جس نے یہ انتشار و افتراق پیدا کیا ہے اور لوگوں کو لڑانے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

لہٰذا اگر ملک کی سالمیت کو کوئی خطرہ ہے، تو دراصل مادہ پرستی، مال و دولت کی حرص اور ذاتی مفاد کو ملکی و ملی مفاد پر ترجیح دینے جیسے اخلاق رذیلہ کی وجہ سے ہے اور اس خطرناک صورتِ حال کا علاج یہی ہے کہ تمام سرکاری ذرائع سے کام لیتے ہوئے حکومت اس بات پر اپنی توجہ کو مرکوز کردے کہ باشندگان ملک میں ملک سے سچی وفاداری، حب الوطنی، انسانیت نوازی، ہمدردی و غم خواری، انسانی تقدس کی بحالی کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ اس کے بجائے اگر ایک طرف ان ہی خطرناک عناصر کو ہوا دی جائے، جو ملک و قوم کو کبھی بھی تہس نہس کر سکتے ہیں اور دوسری جانب ان عناصر کے پیدا کرنے کا کوئی نظام نہ کیا جائے، جو ملک و قوم کی سالمیت و استحکام کا باعث بنتے ہیں، تو کسی بھی قسم کا قانون ملک کے استحکام کا ضامن نہیں ہوسکتا، خواہ وہ عائلی نظام سے متعلق ہو یا کسی اور نظام سے جڑا ہوا ہو۔

رہا ان لوگوں کا یہ پروپگنڈہ کہ: ’’اسلام کا عائلی نظام و قانون‘‘ اور ’’مسلم پرسنل لاء‘‘ میں عورتوں کا حق مساویانہ نہیں دیا گیا ہے اور یہ کہ اس میں قدامت و فرسودگی ہے اور یہ کہ موجودہ دور میں چلنے کے قابل نہیں، اور اس کی وجہ سے اس میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت

ہے‘‘، تو عرض ہے کہ ان کا یہ خیال دراصل مسلم پرسنل لاء کے مسائل کی نوعیت وحقیقت نہ سمجھنے اور اس کے اسرار و حقائق سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔

یہاں سب سے پہلے اس نکتے کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ: ’’مسلم پرسنل لاء‘‘ فی الواقع شریعت اسلامیہ کا ایک جزء ہے، جو خاندانی وعائلی احوال و کوائف سے متعلق ہے، جس میں نکاح، طلاق، خلع، فسخ، میراث، اوقاف کے مسائل سے بحث کی جاتی ہے اور تمام مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں- اور اس پر ان کے پاس محکم دلائل موجود ہیں- کہ یہ ’’قانون شریعت‘‘ وہ ہے، جس کی بنا و وضع بہت سے دنیوی قوانین کی طرح قانون سازوں اور قانون دانوں، دانشوروں، قومی وسماجی خدمت گاروں، سلطنت وحکومت کے بانیوں نے نہیں کی، جن سے ہر وقت خطا ونسیان ممکن ہے؛ بل کہ اس قانون اسلامی کو ان سب کے خالق و مالک اللہ تعالی نے وضع کیا ہے، جس سے خطا ونسیان کا صدور ناممکن، جس کا علم تمام احوال واشخاص، تمام ادوار و ازمان کو محیط ہے اور جو حاکم ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت اسلامی قانون کو ایک ایسی سند (AUTHORITY) فراہم کرتی ہے، جس سے اس کا درجۂ اعتبار بحث وجدال کی تمام معرکہ آرائیوں سے بہت بلند و بالا ہو جاتا ہے۔

اور اس لیے ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اس قانون شریعت میں انسانوں کی ہدایت وفلاح و بہبود کے وہ عجیب وغریب نسخے موجود ہیں، کہ کسی انسان کے بنائے ہوئے یا کسی اسمبلی یا قانون ساز ادارے کے تیار کردہ قانون میں ان کا تلاش کرنا ایک بے فائدہ کام ہے، اس میں تمام طبقات انسانی کے حق میں نہایت عدل وانصاف کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دیا گیا ہے، خواہ مرد ہو کہ عورت، امیر ہو کہ غریب، بادشاہ ہو کہ رعایا، اس میں کسی سے کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے۔ اور اس سے بہتر کوئی قانون جو انسانوں کی صلاح و فلاح کا ضامن ہو اور ان کے تمام مسائل کا مداوا اس میں ہو اور یکساں طور پر سب کے لیے نفع بخش ہو، ہماری نظر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہوسکتا۔

رہا ان لوگوں کا اسلام کے عائلی نظام کے بارے میں یہ خیال وتصور کہ اس میں عورتوں

کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے، طلاق یا طلاق ثلاثہ، حلالہ اور میراث کے مسائل میں اس کی حق تلفی کی گئی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلامی قوانین پر سراسر الزام ہے، یا کسی کم فہم کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور ہم دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی شریعت نے عورتوں کے ساتھ عدل وانصاف سے کام لینے میں سب سے زیادہ نمایاں رول انجام دیا ہے اور اس کی ایک لمبی تاریخ ہے اور جنھوں نے اسلام کی تعلیمات کو اور اس کے عائلی نظام کو تحقیق کے ساتھ اور انصاف کی نگاہوں سے دیکھا اور سمجھا اور اس کے بارے میں اپنی رائے دی، اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلام کیا عورتوں کے حق کمی و نا انصافی کرنے کا روادار ہے یا اس کے ساتھ انصاف ہی نہیں؛ بل کہ فیاضی سے کام لیتا ہے، یہاں صرف ایک حوالہ پیش کرتا ہوں؛ تا کہ حقیقت حال لوگوں کے سامنے آجائے۔

مغربی ادیبہ وفاضلہ مسز اینی بیسنٹ (Annei Besant) نے اپنے لکچر: The life and teachings of Muhammad میں بیان کیا ہے کہ:

”آپ لوگ انگلینڈ میں اچھے اچھے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنیں گے کہ اسلام عورتوں کو بلند مقام دینے سے انکار کرتا ہے اور بعض لوگوں کو یہ بتاتے ہوئے پائیں گے کہ اسلام ایک برائی ہے؛ کیوں کہ اسلام ایک محدود (چار تک) تعدد ازواج کی اجازت دیتا ہے، میں نے ایک دن انگلینڈ ہال میں لوگوں کے سامنے یہ نکتہ پیش کیا جہاں کہ ”زنا کاری کے مخلوط ماحول میں یک زوجگی کی بات محض ایک دکھاوا ہے اور محدود تعدد ازدواج سے زیادہ عورتوں کی حق تلفی ہے۔“

پھر آگے لکھتی ہیں:

”یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ عورتوں کے تعلق سے اسلامی قوانین ابھی قریب زمانے تک انگلینڈ میں اپنائے جا رہے تھے، یہ سب عورتوں کے حق میں دنیا میں پائے جانے والے قوانین میں سب سے زیادہ منصفانہ تھے

۔جائیداد اور وراثت کے حقوق اور طلاق کے متعلق یہ اسلامی قانون خاص طور پر عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لحاظ سے مغرب کے قانون سے بہت آگے تھا۔ یہ ساری باتیں بھلا دی گئیں جب لوگ ''یک زوجگی'' اور'' تعدد ازواج'' کے الفاظ نے ان کو مسحور کر دیا اور وہ مغرب اس کے پیچھے مغرب میں کیا ہو رہا ہے، اس کو دیکھنا نہیں چاہتے ، یعنی ہزاروں عورتوں کی وحشت ناک ذلت و رسوائی؛ جنھیں سڑکوں پر پھینک دیا جاتا ہے، جن کو ان کے اولین محافظ انھیں کسی قسم کی مدد نہیں کرتے۔

)The life and teachings of Muha‼mmad : 2-3(

الغرض اسلام کا نظام وقانون ہر پہلو سے منصفانہ وعادلانہ اور نہایت معقول وفطرت سے ہم آہنگ ہے اور مسلمان اسی کو اپنے لیے بہترین سمجھتے ہیں اور کسی بھی قیمت پر اس کی کسی چیز سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے۔

مسلم پرسنل لاء یا یونیفارم سول کوڈ؟

’’مسلم پرسنل لاء‘‘ جس کا تعلق مسلمانوں کے عائلی و خاندانی مسائل سے ہے، فی الواقع اُسی اسلامی شریعت وقانون کا ایک حصہ ہے، جس کے بارے میں تمام کے تمام اہل اسلام یہ عقیدہ اور یقین رکھتے ہیں اور بجا طور پر عقیدہ رکھتے ہیں، کہ یہ خالق کائنات پروردگار دوعالم کی جانب سے نازل ہونے والا مقدس ولازوال اور تمام عالم انسانیت کے لیے صلاح وفلاح کا حامل قانون ہے، جس میں کسی قسم کی ترمیم واصلاح، تبدیلی وتغییر کا حق کسی کو نہیں؛ حتی کہ خود اس ذات والا صفات ﷺ کو بھی نہیں، جس پر یہ مقدس قانون نازل ہوا۔

چناں چہ جب کفار ومشرکین کی طرف سے پیغمبر اسلام سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ آپ کوئی اور طرح کا قرآن لائیں یا اس میں کوئی تبدیلی کردیں، تو آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کو یہ جواب دے دیں کہ میں اپنی جانب سے اس میں کوئی تبدیلی کا مجاز نہیں ہوں، میں تو بس اس کی اتباع کا مکلّف ہوں۔

قرآن کریم اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ﴾

(اور جب انھیں ہماری کھلی ہوئی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، تو جن لوگوں کو ہماری ملاقات کی امید نہیں، وہ کہنے لگے کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اسی میں کوئی ترمیم کردو، آپ کہہ دیجیے میں یہ نہیں کرسکتا کہ اس میں اپنے جی سے ترمیم کردوں، میں تو بس اسی کی اتباع کا کروں گا، جو میرے پاس وحی سے بھیجا گیا ہے، اگر میں میرے پروردگار کی نافرمانی کروں، تو میں بڑے دن کے عذاب کا خوف رکھتا ہوں۔)

یہ جاہلیت قدیمہ کے ''روشن خیالوں'' کا مطالبہ تھا کہ قرآن ان کی مرضی کے مطابق کردیا جائے، تو ان کو اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا، جس طرح آج کی جاہلیت جدیدہ کے ''روشن دماغوں'' کا بھی یہی مطالبہ ہے کہ قرآن میں ترمیم واصلاح کردی جائے اور اس کو ان روشن خیالوں کے خیالات وجذبات اور ان کی عقل وسمجھ کے موافق کردیا جائے؛ مگر قرآنِ مجید نے آپ ﷺ ہی کی زبان فیض ترجمان سے اس کا جواب یہ کہلوادیا کہ یہ بات میری بساط سے باہر ہے کہ میں اس میں کوئی ترمیم یا اصلاح کروں، میں نبی ہونے کے باوجود اسی دین وشریعت کا پابند ہوں اور اسی پر چلنا اور دوسروں کو چلانا میری ذمے داری ہے۔

اس زمانے کے روشن خیالوں کی طرح آج کے روشن دماغ بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ یہ قانون شریعت خود محمد ﷺ کی دماغی کاوش کا نتیجہ اور آپ کی تصنیف ہے، اس لیے یہ فرمائش بھی کرتے ہیں کہ شریعت میں ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق ترمیم واصلاح کردیجیے؛ مگر سب سے پہلے یہی تو ان روشن خیالوں کو سمجھنا ہے کہ یہ شریعت مقدسہ کسی انسان کی تصنیف یا تحقیق کا نتیجہ نہیں ؛بل کہ یہ خالق ارض وسماء، پروردگار عالم اللہ رب العزت کا قانون ہے، جس میں کسی اصلاح وترمیم کی ضرورت ہے نہ کوئی گنجائش۔

وجہ یہ ہے کہ کسی بھی قانون میں ترمیم واصلاح کے لیے وجہ جواز اس وقت فراہم ہوتی

ہے، جب پہلے سے یہ حقیقت تسلیم شدہ ہو کہ اس قانون میں قانون سازوں اور مقننین کی جانب سے غلطی وکوتاہی، ناانصافی وحق تلفی راہ پا سکتی ہے اور اس کا امکان صرف وہاں ہوتا ہے، جہاں قانون انسانوں کی فکری و دماغی کاوشوں کے نتیجے میں اور ان کی اپنی تحقیق و تصنیف کی صلاحیتوں سے وجود میں آیا ہو؛ کیوں کہ انسان بڑے سے بڑا عقیل وفہیم، پڑھا لکھا اور تجربہ کار ہونے کے باوجود خطا ونسیان کا پتلا ہے، اس کے اندر ناانصافی اور حق تلفی کے جراثیم کا ہونا ممکن ہے اور اس کا علم وعقل اور تجربہ سب کے سب محدود وناقص ہیں اور یہ بات اگر ایک انسان کے لحاظ سے صحیح ہے، تو ان کی ایک جماعت کے بارے میں بھی درست ہے، اگر فرق ہو سکتا ہے، تو کم وبیش کا ہو سکتا ہے؛ مگر اس سے انکار نہیں کہ ایک جماعت سے بھی غلطی وکوتاہی، ناانصافی وحق تلفی ممکن ہے۔

لیکن اگر اس کے برعکس یہ بات طے ہو کہ اس قانون میں کسی غلطی وخطا کا، ناانصافی و حق تلفی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے؛ بل کہ ان کا کوئی امکان بھی نہیں ہے، تو اس قسم کے قانون میں ترمیم کی بات کرنا یا اس کا مطالبہ کرنا عقل وانصاف کی کسی منطق سے بھی حق بہ جانب نہیں ہو سکتا اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا غلطیوں اور خطاؤں سے پاک اور ناانصافیوں اور حق تلفیوں سے مبرا قانون تو صرف ''خدائی قانون'' ہو سکتا ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالی کی ذات خطاء وغلطی سے متصف ہو سکتی ہے، نہ بھول ونسیان سے، ظلم وعدوان سے موصوف ہو سکتی ہے، نہ کسی کی طرف داری سے۔ پھر اس کا علم بھی کامل اور عدل بھی لامحدود، تو اس کے قانون میں کہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں اصلاح یا ترمیم کی جائے؟

جب یہ اصول معلوم ومسلم ہے، تو قابل غور بات یہ ہے کہ اہل اسلام قانون شریعت کو جب اللہ کا قانون مانتے ہیں، تو اس میں وہ کس طرح غلطی یا خطا مان سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ شریعت کو اللہ کا قانون ماننے والا کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس میں کسی ترمیم واصلاح کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس دنیا کا کوئی بھی قانون ہو، وہ چوں کہ انسانوں کا بنایا ہوا ہوگا، خواہ وہ کوئی ملکی وشہری قانون ہو یا کسی ادارے یا انجمن یا اسکول وکالج اور یونیورسٹی کا قانون

ہو؛ اس لیے اس میں خطا و غلطی کا پورا پورا امکان موجود ہے اور اس لیے اس قانون کو چیلنج بھی کیا جا سکتا ہے اور اس میں اصلاح و ترمیم کا مطالبہ بھی عین حق و صواب ہے، اسی لیے اہل اسلام کا مزاج و مسلک، ان کا عقیدہ و فکر یہ ہے کہ کسی قانون میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہو تو ہو؛ مگر اللہ کے قانون میں اصلاح و ترمیم کی بات کبھی بھی، کہیں بھی اور کسی کی بھی قابل قبول نہیں ہے۔

جہاں تک دیگر مذاہب کا تعلق ہے، ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ بھی چوں کہ اپنے اپنے مذہبی قانون کو سب سے برتر و اعلیٰ سمجھتے اور اس کو آسمانی خیال کرتے ہیں، اس لیے وہ بھی اپنے اپنے پرسنل لاء کو بہ نظر تقدس دیکھتے اور اسی میں اپنی فلاح و کامرانی کا یقین رکھتے اور اپنے اپنے مذہبی قانون کے ساتھ ایک جذباتی تعلق خاطر رکھتے ہیں؛ لہذا اس کو چھوڑنے کا مطالبہ اور اس کے بالمقابل کسی دوسرے قانون کو لاگو کرنا ان سب کے جذبات سے کھیلنے کے مترادف ہوگا۔

اسی لیے اسلام نے غیر مسلم رعایا کو ان کے دیگر حقوق کے ساتھ مذہبی حقوق بھی مکمل طور پر دیے اور اس کا اہتمام کیا کہ ان کے مذہبی جذبات سے نہ کھیلا جائے؛ چناں چہ اسلام نے شروع ہی سے اس کا اعلان کیا کہ غیر مسلم رعایا کو ان کے مذہبی طور و طریقوں پر چلنے کا حق ہوگا اور کوئی مسلمان حکومت اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرے گی۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے ”کتاب الخراج“ میں نصاریٰ نجران کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے جو معاہدہ نامہ لکھ کر عطا کیا، اس میں ان کی ”مذہبی آزادی“ کا بھی بالخصوص تذکرہ کیا، اس معاہدے کے الفاظ میں یہ بھی لکھا تھا:

”و لنجران و حاشيتها جوار الله و ذمة محمد النبی رَسُوْل اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أموالهم وأنفسهم وأرضهم وملتهم وغائبهم وشاهدهم وعشيرتهم وبيعهم وكل ما تحت أيديهم من قليل أو كثير“.

(نجرانیوں اوران کے حلیفوں کے لیے اللہ اور رسول محمد؟ کا ذمہ ہے، ان کے مالوں، ان کی جانوں، ان کی زمینوں اوران کی ملت و مذہب اوران کے غائب و حاضر لوگوں اوران کے خاندانوں اوران کی کنیساؤں پر اور ہر اس چیز پر جوان کے ماتحت ہے، خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر ہو۔)

(کتاب الخراج لابی یوسف:۷۲)

اسی طرح حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے اپنے دور خلافت میں نجران کے عیسائیوں کے لیے اسی طرح کا معاہدہ لکھ کر دیا اوران خلفائے اربعہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدے کے حوالے سے اپنے معاہدات لکھے۔

(دیکھو کتاب الخراج لابی یوسف:۷۳-۷۴)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جب حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے نصاری الیس کے صلح کی درخواست پر صلح کی، تو جو عہد نامہ لکھ کر دیا، اس میں یہ لکھا:

''ان کے کنیسہ اور عبادت خانے منہدم نہ کیے جائیں گے اور نہ ان کے محلات میں سے کسی محل کو منہدم کیا جائے گا، جن میں کہ یہ لوگ پناہ لیتے ہیں، جب ان کا کوئی دشمن ان پر حملہ آور ہوتا ہے اوران کو ناقوس بجانے سے منع نہیں کیا جائے گا اور نہ عید کے دن میں صلیب نکالنے سے منع کیا جائے گا''۔

(کتاب الخراج: ۱۴۳)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب ملک شام فتح ہوا، تو آپ نے وہاں ایلیاء وغیرہ کے لوگوں کو عہد نامے لکھ کر دیے، آپ نے جو عہد نامہ اہل ایلیاء اوراہل لد کولکھ کر دیا تھا، اس میں یہ بھی تحریر تھا کہ:

''هذا ما أعطى عبد الله عمر أمير المؤمنين أهل إيلياء من الأمان أعطاهم أمانا لأنفسهم وأموالهم ولكنائسهم وصلبانهم

وسقيمها وبريئها وسائر ملتها : أنه لا تسكن كنائسهم ولا تهدم ولا ينتقص منها ولا من حيزها ولا من صليبهم ولا من شيء من أموالهم ولا يكرهون على دينهم"

(یہ وہ امان نامہ ہے، جو اللہ کے بندے عمر امیر المؤمنین نے اہل ایلیاء کو عطاء کیا، امیر المؤمنین نے ان کو جان، مال، عبادت خانوں، صلیبوں کے متعلق امن دیا، خواہ وہ صحیح سالم ہوں یا شکستہ اور ان کے سارے مذہبی مراسم اور طریقوں کے بارے میں بھی امن دیا کہ (مسلمان کو) ان کے عبادت خانوں میں رہائش نہ دی جائے گی، نہ ان کو گرایا جائے گا اور نہ ان میں کمی بیشی کی جائے گی اور نہ ان کے عبادت خانوں کی متعلقہ عمارتوں اور صلیبوں میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کے مالوں میں سے بغیر حق کے کچھ لیا جائے گا اور نہ انھیں مذہب کے بارے، میں کوئی جبر واکراہ کیا جائے گا۔)

(تاریخ الامم والملوک للطبری:۲/۵۳۰)

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور امارت میں سنہ ۱۹ ہجری میں شہر نہاوند فتح ہوا اور اہل ماہین کو حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ نے عہد نامہ لکھ کر دیا، اس میں منجملہ اور امور کے یہ عبارت بھی تھی:

" هذا ما أعطى النعمان بن مقرن أهل ماه بهراذان أعطاهم الأمان على أنفسهم وأموالهم وأراضيهم لا يغيرون على ملة ولا يحال بينهم وبين شرائعهم" . (تاریخ الامم والملوک:۲/۵۳۰)

(یہ وہ عہد نامہ ہے، جو اہل ماہ بھرذان کو نعمان بن مقرن نے دیا، انھوں نے ان کو ان کی جانوں، مالوں اور اراضی کے متعلق امان دیا ہے؛ لہذا ان کو ان کے مذہب سے نہیں بدلا جائے گا اور نہ ان کے مذہبی مراسم اور طریقوں میں مداخلت کی جائے گی۔)

اسی طرح اسی سنہ کے ماہ محرم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اہل ماہ دینار کو جو عہد نامہ دیا، اس میں بھی یہی امور لکھے تھے اور خاص طور پر یہ جملہ بھی لکھا کہ ان کی دینی و مذہبی امور میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ (حوالہ سابق)

نیز جب شہر بعلبک مفتوح ہوا، تو حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے وہاں کے غیر مسلم لوگوں کو ان کے مذہبی امور میں آزادی کا عہد دیا اور یہ لکھ کر دیا کہ:

"وأنهم على نسكهم ، لا يكرهون عليه" (مختصر تاریخ دمشق لابن منظور: ۴/۱۸۲)

(یہ لوگ اپنے مذہب وطریقے پر رہیں گے، ان کو ان کے مذہب کے خلاف جبر نہیں کیا جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس کو فتح کیا اور اس میں فاتحانہ داخل ہوئے، تو وہاں عصر کا وقت ہو گیا، تو آپ نے اندر اس لیے نماز نہ پڑھی کہ بعد میں کوئی مسلمان اس حوالے سے کہیں یہ مطالبہ نہ کرے، کہ ہم اس کو مسجد بنائیں گے۔

جب مصر فتح ہوا اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ وہاں کے گورنر مقرر ہوئے، تو ان کو وہاں ایک بڑی مسجد بنانے کی ضرورت پیش آئی، جس کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا، اس کے متصل ایک عیسائی عورت کا مکان تھا، جسے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے خرید کر مسجد میں شامل کرنا چاہا؛ مگر عورت نے اس مکان کو بیچنے سے انکار کر دیا، تو حضرت عمرو بن العاص نے اس مکان کو بہ جبر لے لیا اور اس مکان کی قیمت بیت المال میں جمع کر دی؛ تا کہ جب وہ عورت چاہے اپنے مکان کی قیمت وصول کر لے؛ مگر اس عورت نے اس کی شکایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دی، آپ نے حضرت عمرو کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا؛ بل کہ آپ نے حکم دیا کہ جدید تعمیر کو منہدم کر کے، اس عورت کا مکان جیسا تھا بنا کر دیا جائے۔
(من روائع حضارتنا از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی: ۱۳۶)

یہ ہزارہا مثالوں میں سے گنی چنی چند ہیں، جن سے اسلام اور اہل اسلام کا غیر مسلمین کے مذہبی امور کے حوالے سے رواداری نہ معاملہ اور ان کو اس سلسلے میں آزادی دیے جانے کا

واضح ثبوت ملتا ہے۔

اسی تاریخی ریکارڈ کے حوالے سے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی لکھتے ہیں:

''شاید ہم میں سے کوئی نہیں بھولا ہوگا کہ سلطان محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ پر فتح پائی، جہاں عیسائی بطارقوں کا قیام تھا،تو سلطان نے وہاں کے سکان کے لیے جو سب کے سب عیسائی تھے، ان کی جانوں ، مالوں اور چرچوں اور صلیبوں کے لیے امان کا اعلان کیا اور ان کو فوج میں بھرتی ہونے سے معاف رکھا اور ان کے رئیسوں کو ان کے آپسی معاملات وخصومات میں حکومت کی مداخلت کے بغیر فیصلہ کرنے کا اختیار دیا۔وہاں کے باشندوں نے بڑا فرق محسوس کیا،اس میں جو بیزنطینی دور میں ان کے ساتھ معاملہ کیا جاتا تھا اور اس معاملے میں جو سلطان محمد فاتح کے دور میں ان کے ساتھ کیا جاتا تھا؛ کیوں کہ بیزنطینی حکومت ان کے مذہبی اختلافات میں بھی مداخلت کرتی اور ان کے کنیسہ والوں کو دوسرے کنیسا کے لوگوں پر فوقیت دیتی تھی؛ لہذا اس نئ حکومت سے ان کو راحت میسر آئی اور اس مذہبی رواداری سے جس کی کوئی نظیر خود ان کے اپنے مذہب کے حکمرانوں سے نہیں دیکھی گئی،ان کے دل خوشی ومسرت محسوس کرنے لگے''۔

(من روائع حضارتنا: ۱۷۳)

ان سطور میں ہم نے دیکھا کہ اسلام اگر ایک جانب یہ کہتا ہے کہ قانون شریعت قانون الٰہی ہونے کی وجہ سے اس میں تبدیلی وتغیر ہوسکتا ہے، نہ کسی قسم کی ترمیم واصلاح اور اس وجہ سے کسی مسلمان کو اس کی جرات نہیں ہوسکتی کہ وہ اس میں اصلاح وترمیم تغیر وتبدیلی کی بات کرے یا سوچے یا کسی کو اس کے لیے راہ فراہم کرے،تو دوسری جانب وہ دیگر مذاہب کے ساتھ روادارانہ برتاؤ اور سلوک کا قائل ہے۔

ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں شروع ہی سے مذہبی رواداری کو اپنایا گیا اور یہاں

کے آئین میں مستقل دفعات کے ذریعے یہاں کے باشندوں کو اس کی مذہبی آزادی اور رواداری کی یقین دہانی کی گئی، خواہ وہ باشندے اکثریتی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں یا اقلیتی طبقے سے متعلق ہوں؛ مگر بعض مریض ذہنیتوں کی جانب سے بار بار یہ کوشش ہوتی ہے کہ یہاں سے اس روادارانہ نظام و قانون کو ہٹا کر متعصّبانہ قانون نافذ کیا جائے اور اپنے اس فاسد نظریے کو ''یکساں سول کوڈ'' کے الفاظ میں چھپایا جاتا ہے، جب کہ مشترکہ سول قانون ہندوستان کی فطرت ہی سے ہم آہنگ نہیں ہے، کیوں کہ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کی روایت کسی ایسے قانون کے حق میں نہیں ہوسکتی، جس میں یہ ملی جلی تہذیبیں اپنا وجود یا تشخص کھو بیٹھیں اور ان روایات اور تہذیبوں کا کوئی وجود باقی نہ رہے۔

یہ معلوم ہے کہ ہندوؤں کے یہاں ذات پات کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس کی وجہ سے ان کے یہاں خود ہندوؤں کی کئی ذاتیں ہیں اور ان میں خود متعدد رسومات اور طریقوں میں بڑے بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں، نکاح کی انجام دہی کے طریقے میں ان کے مختلف طبقات میں فرق ہے، کن سے نکاح ہوسکتا ہے اور کن سے نہیں، اس بارے میں ان میں اختلاف ہے، ماموں بھانجی کا آپسی رشتہ متعدد ہندو اقوام میں رائج ہے، جب کہ بہت سے لوگوں میں اس کا کوئی رواج نہیں ہے، تعدد ازدواج کے قائل و فاعل بھی ان میں ہیں ،جس طرح اس کے مخالف بھی پائے جاتے ہیں، نیز متعدد قبائل میں ایک عورت کے متعدد مرد ہوسکتے ہیں، جب کہ عام طور پر ہندو اس کے قائل نہیں ہیں۔ اور اتنا ہی نہیں؛ بل کہ ہندوؤں میں خود عقائد کے اندر بھی مختلف فرقے پائے جاتے ہیں، جیسے مورتی پوجا کے جواز و عدم جواز کے لحاظ سے ان میں فرقے ہیں، پھر ان میں کوئی رام کی پوجا کا قائل ہے اور راون کا منکر تو کوئی راون کی پوجا کا قائل ہے اور رام کا منکر۔ قابل غور یہ ہے کہ ہندوستان جیسے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے گہوارے میں ایک سول قانون کا نفاذ کیا ممکن ہے اور اگر ممکن ہے، تو کیا مناسب ہے؟

''یکساں سول کوڈ'' کی بات کرنے والے عموماً مسلم پرسنل لاء کی خامیاں بیان کرتے

ہیں اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ’’مسلم پرسنل لاء‘‘ کو موجودحالات کے تناظر میں ناقابل عمل ثابت کیا جائے اور اس کو ظالمانہ اور غیر عادلانہ قرار دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قوانین پر یہ پھبتیاں کسنے کا سلسلہ سب سے پہلے عیسائی اور یہودی تنظیموں اور تحریکوں سے شروع ہوا، جنھوں نے اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کی طاقت وشوکت کو دیکھا اور یہ دیکھا کہ لوگ اسلام کے حلقہ بہ گوش ہوتے جارہے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیری وجامعیت، ان کی افادیت ومعقولیت اور زمانے کے ساتھ چلنے کی صلاحیت نے ہر طبقے کے لوگوں کو اپنی جانب مائل کرلیا ہے اور اس کی وجہ سے عیسائیت اور یہودیت کی مقبولیت کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے، تو انھوں نے اپنی ذہانت وطباعی سے کام لیتے ہوئے اسلام کے خلاف ایک سازش رچی کہ کسی طرح چہرۂ اسلام کو بدنما ثابت کیا جائے اور اس کی نیک نامی کو کسی طرح مخدوش کیا جائے، پھر کیا تھا؟ اسلام کی تعلیمات میں کیڑے نکالنے اور ان کو ظالمانہ اور غیر معقول ثابت کرنے کی ناکام کوششوں میں لگ گئے۔

ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کے قانون حیات کے سرچشموں، ان کی محترم شخصیات، ان کی تاریخ، ان کے ادب وثقافت اور ان کی تہذیب وتمدن میں خامیوں اور غلطیوں کی تلاش وجستجو کریں، لہذا کبھی قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں تشکیک پیدا کرنے لگے، کبھی سیرت محمدی کو داغ دار کرنے لگے، کبھی اسلامی تعلیمات کو ہدف ملامت بنایا اور کبھی اسلام کی وسعت وگیرائی کو تلوار اور اکراہ کا نتیجہ قرار دینے کی کوشش کی، اس طرح ان کی جانب سے اسلام اور اس کی تعلیمات کو بدنام کرنے کا ایک ناپاک سلسلہ ان کی جانب سے جو جاری ہوا، وہ آج تک رکنے کو نہیں آیا۔

ان متعصب عناصر نے اسلام کے متعلق اپنے ان خیالات کا ذرائع ابلاغ کی قوت و طاقت اور وسعت سے کام لیتے ہوئے اس قدر پرچار کیا کہ لوگوں کو یقین آ گیا کہ اسلام کے بارے میں سچائیاں یہی ہیں؛ حالاں کہ یہ سچائیاں نہیں؛ بل کہ سراسر کذب وجھوٹ پر مبنی خیالات تھے اور ہیں۔

ان کے اس پروپگنڈے کا اثر یہ ہوا کہ دیگر متعصب لوگوں نے بھی اسلام کے بارے میں اسی طرح کی باتیں پھیلانے کا بیڑا اٹھا لیا اور آج بیشتر متعصب لوگوں نے اسی سازشی طرز عمل کو اختیار کیا ہے اور ان کی ساری محنت و کوشش اس بات پر خرچ ہو رہی ہے کہ کسی طرح اسلام کو بدنام کیا جائے اور جھوٹ و سچ جو ممکن ہو، اس سلسلے میں کام میں لایا جائے۔

ہندوستان کی ہندو احیاء پرست تنظیموں نے بھی اسی کو اپنا مقصد حیات بنا لیا ہے اور اسی کا ایک حصہ یہ ہے کہ بار بار مسلم پرسنل لاء کے مقابلے میں یکساں سول کوڈ کی مانگ کی جاتی ہے اور اسلامی قانون کو فرسودہ و ناقابل عمل اور ظالمانہ قرار دینے کی ناپاک کوشش کی جاتی ہے۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالی اس اشاعت کو قبولیت سے نوازے اور امت مسلمہ کی رہبری و ہدایت کے لیے اس کو قبول فرمائے۔

عہد حاضر کی ’’لا دینیت‘‘ کا علاج
دینی ماحول میں عصری تعلیم کا نظام

یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ موجودہ عہد میں ’’لا دینیت‘‘ کی طوفانی موجوں نے عالم اسلام کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں اور اہل اسلام ایک نہایت نازک صورتِ حال سے دوچار ہوتے جا رہے ہیں اور ایمانی و روحانی اعتبار سے ان کے سروں پر خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں، اور اس ’’لا دینیت‘‘ کی وجہ سے اہل اسلام کے اعمال و عبادات سے لے کر ان کے عقائد و اساسیات تک میں اضمحلال و کمزوری پیدا ہوگئی ہے اور اتنا ہی نہیں ؛ بل کہ اضطراب و ارتیاب کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور بالخصوص ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس لا دینی سے بے حد متأثر و مرعوب نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام اور دینی حقائق کے سلسلے میں وہ فکری و ذہنی طور پر بالکل مطمئن نہیں ہے اور اس کو اسلام اور اس کے نظام پر وہ اعتماد و اعتبار نہیں ہے، جو ایک مسلمان کی شان ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ بے عملی و بد عملی کا بھی شکار رہتا ہے۔

اس ’’لا دینیت‘‘ کے فروغ پانے میں جہاں اور بہت سے اسباب و عوامل کام کر رہے ہیں، وہیں ایک اہم سبب اسکول و کالج کا وہ لا دینی و الحاد زدہ نظام و ماحول ہے، جس کو عیسائی و یہودی اقوام کی سرپرستی حاصل ہے، جہاں جانے کے بعد انسان تشکیک و ارتیاب کا شکار ہو جاتا ہے، مادہ پرستانہ و مفاد پرستانہ ذہنیت کو قبول کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی نظر میں اب صرف دنیا، یہاں کی تعلیم و ڈگریاں، یہاں کی دولت و ثروت، یہاں کا عیش و تنعم، یہاں کی

عزت وتفوق اور یہاں کے عہدے ومناصب ہی آتے ہیں اور وہ ان ہی کی طلب وجستجو اور ان ہی کی فکر وتحصیل میں منہمک نظر آتا ہے اور وہ خود کو اور اپنی اولاد کو اسی دنیوی شان وشوکت اور عیش وراحت میں رکھنا چاہتا ہے۔

وہ اسلام کو بہ ظاہر مانتا ہے اور بعض اوقات اس کی عظمت وجلالت کا اعتراف بھی کرتا ہے؛ مگر اس کے باوجود اس کا دل اسلام پر قانع ومطمئن نہیں نظر آتا، ایسا لگتا ہے کہ وہ نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہو چکا ہے اور اس کے دل ودماغ پر جاہلیت کے افکار ونظریات کا تسلط قائم ہو چکا ہے؛ اس لیے وہ موقعہ بہ موقعہ اسلام کی تعلیمات پر اعتراض واشکال بھی کرنے لگتا ہے، کبھی دبے دبے الفاظ میں، تو کبھی واضح اور کھلے انداز سے، کوئی مبہم وکنائی طریقے پر، تو کوئی واضح وصریح عنوان سے؛ کیوں کہ ان لوگوں کو کہیں قرآنی تعلیمات میں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، کہیں احادیث میں ترمیم کی حاجت معلوم ہوتی ہے، کبھی انھیں عورتوں کے متعلق اسلامی احکامات میں عدل کا اعلیٰ معیار دکھائی نہیں دیتا تو کبھی اسلامی اقتصادی نظام میں خلل دکھائی دیتا ہے۔اس طرح مغربی طرز تعلیم کی ان دانش گاہوں اور عصری علوم کے ان اداروں سے بڑے زبردست پیمانے پر الحاد وزندقیت اور جاہلیت ولادینیت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور اس میں کوئی تعجب خیز بات بھی نہیں، کیوں کہ اس لادینیت کو فروغ دینے ہی کے لیے ان کا اجرا کیا گیا ہے۔

مگر یہاں اہم ترین سوال یہ ہے کہ اس لادینیت اور الحاد پر کس طرح قابو پایا جائے اور اس کی طوفانی موجوں کا رخ کس طرح دوسری جانب کو پھیرا جائے؟

یہ تو ظاہر ہے کہ اگر اس دور میں کوئی یہ کہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو اسکول اور کالج نہ بھیجیں، تو یہ آواز نہ صرف صدا بہ صحرا ثابت ہوگی؛ بل کہ اس آواز کے خلاف آواز لگانے خود اہل اسلام کی صفوں میں سے بے شمار لوگ کھڑے ہو جائیں گے اور اس آواز لگانے والے اور اس کے پورے طبقے کے بارے میں یہ رائے پورے اخلاص کے ساتھ قائم کر لی جائے گی، کہ یہ لوگ دنیوی تقاضوں اور موجودہ عہد کے مطالبات سے مجرمانہ غفلت واعراض کے

مرتکب ہیں اور حالات زمانہ سے یکسر نابلد و جاہل ہیں اور قیادت ملی کے کسی طرح بھی اہل نہیں ہیں۔

لہذا یہ آواز اس کا کوئی علاج نہیں؛ بل کہ اس بیماری کو مزید بڑھاوا دینے والی اور اس کو خطرناک حد تک لاعلاج بنا دینے والی ہے؛ لہذا اس کا معقول اور صحیح علاج یہ لگتا ہے کہ اہل علم و دانش ایسے اسکولوں کو قیام میں لانے کی جد و جہد اور محنت کریں، جہاں ایک جانب اگر عصری علوم کی تعلیم کا بہترین و معقول نظام ہو، تو دوسری طرف ان اسکولوں میں دینی تعلیم کے ساتھ دینی ماحول بھی بچوں کو فراہم کیا جائے، جس کے نتیجے میں وہاں پڑھنے والوں میں دنیوی علوم وفنون کی مہارت بھی پیدا ہو اور اسلامی عقائد ونظریات، اسلامی اعمال وعبادات، اسلامی تہذیب وتمدن سے مضبوط رشتہ بھی قائم ہو اور یہ پڑھنے والے مکمل طور پر اساسیات و عقائد اسلام پر مطمئن ہوں، اسلامی نظریات کی سچائیاں اور ان کی معقولیت ان پر واضح ہو اور وہ نہ صرف یہ کہ یہاں سے پڑھنے کے بعد اسلام اور اس کی تعلیمات کی صداقت ومعقولیت پر کامل یقین رکھتے ہوں؛ بل کہ اس کے سب سے بڑے علمبردار اور مبلغ وداعی ہوں۔

اگر اس طرح کے اسکول جگہ جگہ قائم ہو جائیں اور ان کا نظام مرتب و معقول ہو اور دنیوی علوم کے ساتھ اسلام کے بنیادی عقائد و مسائل کا مکمل و جامع تعلیمی منہج قائم ہو، تو کیا بعید ہے کہ جو طبقہ آج اسکول کے نام سے یا کالج کے عنوان سے عیسائی مشنری اسکولوں اور کالجوں میں یا دیگر غیر لوگوں کے پاس جا رہا ہے اور اپنے بچوں کو اس میں داخل کر کے لادینیت کے سیلاب بلا خیز میں غوطہ زن بل کہ غرق ہوتا جا رہا ہے، وہی ان اسلامی منہج کی تعلیم گاہوں اور دانش گاہوں کو اپنے بچوں کے لیے منتخب کر کے ان کو عصری علوم کے ساتھ اسلامی تعلیم سے بھی روشناس کرانے کی فکر کرے اور یہ بچے لادینیت اور الحاد کی طوفانی موجوں سے محفوظ رہیں۔

لیکن اس کے لیے ایک بات نہایت ضروری ہے کہ ''اسلامی منہج کے اسکول اور کالج ان لوگوں کی سرپرستی میں قائم ہوں، جو ایک جانب ملت کے تئیں مخلصانہ جذبات کے حامل ہوں

،ملت کا غم و درد رکھتے ہوں اور خود اس فکر کے علمبر دار ہوں اور دوسری جانب دینی علوم میں مہارت رکھتے ہوں اور اسلامی فکر میں بھی پختہ کار ہوں اور سب سے بہتر یہ ہے کہ بالغ نظر علماء کی سر پرستی میں اسے عمل میں لایا جائے ؛ تا کہ جو اصل ہدف اور مقصد اعظم ہے ان اسکولوں اور کالجوں کے قیام کا کہ لا دینیت کے سیلاب کو روجائے اور اس کی طوفانی موجوں کا مقابلہ کیا جائے اور امت کے نونہالوں کو اس کے تھپیڑوں سے بچایا جائے ، یہ مقصد پورا ہو، ورنہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اسلامی لیبل کے ساتھ قائم اسکول میں وہ سب کچھ روا رکھا گیا ہے، جو مغربی افکار و نظریات اور یہودی و عیسائی تہذیب و تمدن کے علمبر دار اسکولوں میں ہوتا ہے، وہی ثقافت اور فنون لطیفہ کے نام پر ناچ و گانا اور فحش و بے حیائی، آزادی و آزادروی اور غیروں کو خوش کرنے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے اپنے ضمیر اور اپنے دین و ایمان کی سودے بازی، وغیرہ۔

کس قدر عجیب اور حیرت زا ہے یہ بات کہ نام اسلام کا اور کام وہ جو اسلام کے باغیوں اور سرکشوں کا! لہذا صرف اسلامی نام سے کام نہیں چلے گا؛ بل کہ صرف نام رکھ کر اگر کام وہی لا دینیت کا کیا جائے ،تو یہ اسلامی معاشرے کے لیے اور زیادہ خطرناک اور لا دینیت کے سیلابی دھارے کو مسلم معاشرے کی جانب موڑنے میں مزید معاون بن جائے گا؛ اس لیے ضروری ہے کہ بالغ نظر علماء کی سر پرستی میں یہ کام کیا جائے ؛ تا کہ مقصد کی تکمیل ہو سکے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس دور کی ’’ لا دینیت ‘‘ کا موجودہ حالات کے تناظر میں یہی ایک علاج ہے، جو اس سیلاب بلا خیز کا دھارا موڑ دے گا اور ایک ایسی نئی نسل کے وجود میں لانے کا سبب بنے گا، جو عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ ایمان میں پختگی اور دین کے لیے سرگرمی اور دینی فکر و نظر کی علمبر دار ہوگی۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

عہد حاضر میں دنیا کا نقشہ کچھ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی فساد کی آماجگاہ ہو، جہاں وقفے وقفے سے ظلم وسفاکی اور سختی وزیادتی کے لرزہ خیز واقعات کا ایک خوفناک طوفان اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جس کی زد میں اگرچہ کہ پوری انسانیت ہے؛ مگر سب سے زیادہ اس کا نشانہ وہ ہیں، جن کو اسلام وایمان کا دعویٰ ہے اور جو خود کو خدا اور رسول سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ بالخصوص ہندوستان کی سرزمین مسلمانوں کے حق میں جس طرح تنگ ہوتی جارہی ہے اور روز روز اس میں اضافے شکلیں بنتی جارہی ہیں اور ظلم وزبردستی کی فضا بنائی جارہی ہے، ان کی اقتصادی ومعاشی حالت کو کمزور کرنے کی جو کوششیں ہورہی ہیں اور ملکی وسیاسی منظر نامے سے ان کو ہٹا دینے ؛ بل کہ مٹا دینے کی جو سازشیں ہورہی ہیں ، یہ سب ایک ایسی حقیقت ہے کہ خود اہل اسلام تو کیا، کوئی بھی منصف مزاج مؤرخ اس سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہورہا ہے؟ آخر مسلمانوں کے خلاف اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کی کیا وجہ ہے؟ کیا اسلام سے وابستگی اس کی وجہ ہے یا اسلام سے روگردانی؟

میں یہاں اسی سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں، مگر جواب سے پہلے ایک مختصر سا واقعہ سنا دینا مناسب ہے، وہ یہ کہ ایک طالب علم نے ایک اخبار میں چھپا ''تاج محل'' دکھاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا کہ تم نے ''تاج محل'' نہیں دیکھا ہے نا! یہ دیکھو ''تاج محل''۔ اس ساتھی نے اس ''تاج محل'' کو دیکھ کر کہا کہ نہیں ، یہ تو تاج محل نہیں ہے۔ طالب علم نے کہا کہ تم نے تاج محل نہیں دیکھا ہے نا، اس لیے انکار کررہے ہو، تم یقین کرو کہ یہی ''تاج محل'' ہے؛

مگر وہ ساتھی برابر انکار کرتا رہا یہاں تک کہ اس کی قسم بھی کھالی اور کہا کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ ہرگز ''تاج محل'' نہیں ہے۔ پہلا طالب علم کہنے لگا کہ آخر سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس واضح بات کا کیوں انکار کر رہے ہو! ان دونوں کی اس بحث میں دیگر ساتھی میں شامل ہو گئے اور سب نے کہا کہ یہی تاج محل ہے؛ مگر وہ برابر انکار کرتا جا رہا تھا۔ سب نے کہا کہ بھائی ! یہ تو بتاؤ کہ تم انکار کس بنیاد پر کر رہے ہو؟ وہ انکار کرنے والا ساتھی کہنے لگا کہ میری بات تو بہت صاف و واضح ہے کہ اخبار میں جو تم دکھا رہے ہو، یہ ''تاج محل'' نہیں؛ بل کہ ''تاج محل'' کی تصویر ہے۔ کیا تاج محل اور تاج محل کی تصویر دونوں ایک ہی چیز ہیں؟

یہ کہتے ہی سب کی سمجھ میں آ گیا اور سب نے اس سے کہا کہ تم نے عجیب طرح ہمارا دماغ الجھایا اور پھر سلجھا بھی دیا اور ایک بڑی حقیقت بھی سمجھا دی کہ کسی چیز کی تصویر خود وہ شی نہیں ہوا کرتی اور ان دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

یہ واقعہ میں نے اس لیے پیش کیا کہ ہماری سمجھ میں یہ آ جائے کہ جس طرح ''تاج محل '' کی تصویر ''تاج محل'' نہیں، اسی طرح امت مسلمہ کی تصویر امت مسلمہ نہیں ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے؛ آج امت مسلمہ کا حال یہ ہے کہ وہ امت مسلمہ کی ایک تصویر محض ہے، اس میں وہ خوبیاں اور کمالات جو ایک جیتی جاگتی امت میں ہوتی ہیں، وہ سب کی سب یا اکثر مفقود ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تصویر چاہے شیر ہی کی کیوں نہ ہو، اس کی حیثیت واقعی ایک کاغذ کے ٹکڑے اور پرزے سے زیادہ کچھ نہیں ہے، سب جانتے ہیں کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں، اس کا کوئی مقام نہیں، اس کی کوئی قیمت نہیں، اس میں کوئی قوت نہیں اور اس کے بر عکس حقیقی اور واقعی چیز خواہ وہ کتنی بھی حقیر اور معمولی ہی کیوں نہ ہو، اس کی ایک حقیقت بھی ہے اور قیمت بھی اور قوت بھی۔

مثال کے طور پر اگر کسی چوہے کو کسی شیر کی تصویر کے مقابلے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو ظاہر ہے کہ جیت ہر حال میں چوہے کی ہوگی، چوہا، اس شیر کی تصویر کے پرخچے اڑا کر رکھ دے گا؛ اور اس میں اسے کوئی قدرت و پریشانی بھی پیش نہ آئے گی؛ کیوں کہ چوہا اصلی و حقیقی

ہے، اس کو کچھ نہ کچھ قوت حاصل ہے، اس میں جان ہے، اس میں نمو وحرکت ہے، اس میں کچھ نہ کچھ کرنے کی طاقت وصلاحیت موجود ہے اور اس کے بالمقابل شیر کی تصویر میں نہ کوئی روح وحیات ہے، نہ اس میں کوئی قوت وطاقت ہے، نہ حرکت ونمو ہے؛ لہٰذا شیر کی تصویر کبھی کسی چوہے کے مقابلے میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتی اور چوہا اس کے مقابلے میں ضرور کامیاب ہوجائے گا۔

یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ تعالی نے اس کائنات میں اپنے جو محکم واٹل اصول وسنن جاری کیے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اگر حقیقی اور واقعی چیز کا مقابلہ کسی دوسری حقیقی وواقعی چیز سے ہوتا ہے، تو ان میں تنافس وتسابق ہوتا ہے؛ لیکن اگر کسی حقیقی چیز کا مقابلہ کسی فرضی چیز سے ہو، تو ان میں کوئی تنافس وتسابق کی صورت حال کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ حقیقی گھوڑے کا مقابلہ دوسرے حقیقی گھوڑے سے ہوتا ہے اور ان میں ہار جیت کا کھیل کھیلا جاتا ہے، ایک حقیقی انسان کا تقابل دوسرے انسان سے ہوتا ہے اور ان میں استباق ہوتا ہے؛ لیکن کیا آپ نے کبھی یہ بھی سنا یا دیکھا ہے کہ ایک گھوڑے کا مقابلہ ایک گھوڑے کی تصویر سے ہوا اور ان میں بھی تنافس وتسابق ہوا؟ کیا کبھی کسی انسانی تصویر سے کسی انسان کی لڑائی کا تماشا کسی نے دیکھا ہے اور ان میں بھی تقابل کا نظارہ کیا ہے؟ ہرگز نہیں؛ بل کہ یہاں ہر صورت میں واقعی وحقیقی چیز کا غلبہ متعین ومقرر ہے، اس اصول میں کبھی کوئی تخلف نہیں ہوتا۔

اسی اصول کے پیش نظر سمجھنا چاہیے کہ آج امت مسلمہ کی اعتقادی و دعوتی مشن کا ضعف وکمزوری، اس کی تہذیبی وتمدنی بے حالی وبدحالی، اس کی معاشی واقتصادی اعتبار سے ناکامی ونامرادی، اس کی سیاسی لحاظ سے ذلت وخواری اور اس کے فکری ونظریاتی اضمحلال کی جو صورت سامنے آرہی ہے، اس سے اس بات اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس وقت امت مسلمہ اپنے تیئں ایسے ضعف وکمزوری کے دور سے گزر رہی ہے، جس میں وہ کسی معمولی سے معمولی چیز کا بھی مقابلہ کرنے کی بھی سکت نہیں رکھتی، ایسا لگتا ہے کہ اس کو ہر معمولی سے معمولی چیز اپنے پیچھے ڈھکیلتی جا رہی ہے؛ ہر دنیوی تمدن وتہذیب اس کو دباتی جا رہی ہے؛ ہر

فکرونظریہ اس کو روندتا جارہا ہے اور یہ امت ان میں سے کسی کا جواب دینے اور اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز و درماندہ نظر آرہی ہے، جب کہ ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے اسلاف نے ہر دور میں دنیا والوں کو یہ دکھایا کہ ان کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت و طاقت، کوئی تہذیب وتمدن، کوئی سیاسی وملکی نظام، کوئی معاشی و اقتصادی نظریہ، کوئی فکری و ثقافتی تحریک کے بس میں نہیں ؛ بل کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے سامنے کوئی تہذیب وتمدن ٹھہر نہیں سکتا، اسلامی نظامِ سیاست ایک ایسا روادارانہ، عادلانہ ومنصفانہ نظام ہے، جس کے سامنے دنیا کا کوئی سیاسی نظام چل نہیں سکتا، اسلام کا اقتصادی ومعاشی نظام وہ مبارک ومسعود نظام ہے ،جس میں ہرایک کا حق دیا گیا ہے،خواہ وہ جاگیردار ہو یا مزدور،اس کا ہر جز عدل وانصاف کی کسوٹی پر جانچا ہوا ہے،اس کے سامنے کوئی اور نظام معیشت آئے گا،تو خود ہی اپنی ناکامی کا اعلان کر جائے گا۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر اسلاف کے پاس ایمان تھا،تو ہمارے پاس بھی تو ایمان ہے، پھر وہاں کے ایمان کا نتیجہ اگر یہ تھا،تو ہمارے ایمان کا نتیجہ وہ کیوں نہیں؟ آخر فرق ہے،تو کیا ہے؟ وہ فرق یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کے پاس ایمان اصلی وحقیقی تھا،اس میں حیات وقوت تھی ،اس میں نمو وحرکت تھی ،ان کا ایمان کمالات وامتیازات کا حامل تھا، وہ لوگ اسی ایمان کامل کی وجہ سے عشق ومحبت ،خوف وخشیت ،اخلاص وللّٰہیت ،توکل واعتماد علی اللہ ،توبہ و انابت،عبادت واطاعت، خشوع وخضوع ،تقوی وطہارت جیسے عظیم صفات وکمالات سے آراستہ وپیراستہ تھے ؛لہذا جس طرف رخ کیا اور جہاں گئے ، وہاں کامیابی ہی کامیابی ان کے قدم چومتی تھی اوران کے مقابلے کی ہر چیز ان کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ؛ کیوں کہ ان کے ایمانی قوت وطاقت کے سامنے،ان کے روحانی کمالات وامتیازات کے سامنے اوران کی زندۂ جاوید ایمانی ہستیوں کے سامنے کسی چیز کے ٹھہرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم محض ایمان کی ایک تصویر ہیں ،جس میں ایمانی کمالات و امتیازات کا کوئی نام ونشان نہیں ، اس میں نہ نمو ہے نہ حیات ، اس میں نہ قوت ہے نہ

قیمت، اس میں نہ ترقی ہے نہ بلندی، اسی لیے عشق ومحبت سے قلوب خالی ہیں، اخلاص و للّٰہیت کا فقدان ہے، دل خوف وخشیت سے عاری و خالی ہیں، اطاعت وعبادت کے جذبات سے تہی دامن ہیں، توکل واعتماد سے محروم ہیں، توبہ وانابت کی حلاوت سے غافل ہیں، خشوع وخضوع سے کوسوں دور ہیں اور تقوی وطہارت سے نفور ہیں۔ جس ایمان کی یہ حالت ہو، وہ کس کا کیا مقابلہ کر سکے اور کہاں سے کامیابی کی منزل پا سکے، کیسے مراد کو پہنچ سکے اور کس طرح اپنی بات منوا سکے اور کیوں کر کسی کو رام کر سکے؟ ظاہر ہے کہ یہ محض تصویر کا کام نہیں ہے؛ بل کہ اس کا کام ہے، جو حقیقت سے لبریز ہو، واقعیت سے معمور ہو اور قوت و قیمت رکھتی ہو۔

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگِ لاتَخَف

یہی نہیں؛ بل کہ ہم میں سے ایک طبقہ وہ بھی ہے، جس کو اسلام کی سچائیوں وصداقتوں پر وہ یقین ہی نہیں ہے، جو ایک مؤمن کو ہونا چاہیے، وہ شک وارتیاب کی دہلیز پر پہنچا ہوا ہے، اور کفر والحاد کی چوکھٹ پر بیٹھا دکھائی دے رہا ہے، اس کو کبھی قرآنی احکامات میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ اسلام اور اس کی تعلیمات پر حملے کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔

بقول علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ:

"سینکڑوں تعلیم یافتہ مذہبی مسائل کو تقویم پارینہ سمجھتے ہیں، اخباروں میں آرٹیکل نکلتے ہیں کہ اسلام کا قانون وراثت خاندان کو تباہ کر دینے والا ہے، اس لیے اس میں ترمیم ہونی چاہیے، ایک صاحب نے مضمون لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکے میں تھے، پیغمبر تھے، مدینے جا کر بادشاہ ہو گئے اور اس لیے قرآن مجید میں جو مدنی سورتیں ہیں، وہ خدائی احکام نہیں؛ بل کہ شاہانہ قوانین ہیں، ایک موقعے پر مجھ سے لوگوں نے لکچر دینے کی

درخواست کی، میں نے پوچھا کس مضمون پر لکچر دوں؟ ایک گریجویٹ مسلمان نے فرمایا کہ اور جو چاہیے جس مضمون پر تقریر کیجیے؛ لیکن مذہب پر نہ کیجیے ،ہم لوگوں کو مذہب نام سے گھن آتی ہے (نقل کفر کفر نہ باشد) یہ صرف دو چار شخص کے خیالات نہیں، مذہبی بے پروائی کی عام وبا چل رہی ہے،فرق یہ ہے کہ اکثر لوگ دل کے خیالات دل ہی میں رکھتے ہیں اور بعض دلیر طبع لوگ ان کو ظاہر بھی کر دیتے ہیں۔''

(خطبات شبلی:۵۸-۵۹)

اور مفکر اسلام حضرت ابوالحسن علی ندوی نے رحمہ اللہ اپنے رسالے''نیا طوفان'' میں جو در اصل آپ کے عربی رسالے''ردۃ ولا أبا بکر لھا'' کا ترجمہ ہے،اس میں اہل اسلام کے اس طبقے کی تشویشناک صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کامل ایک صدی گزرتی ہے کہ یورپ ہمارے نوجوان اور ذہین طبقے پر چھاپے مار رہا ہے،شک والحاد،نفاق وارتیاب کا ایک طوفان ہے، جو اس نے ہمارے دل ودماغ میں برپا کر رہا ہے،غیبی وایمانی حقائق پر اعتماد متزلزل ہو رہا ہے اور سیاست اور اقتصاد کے مادہ پرستانہ نظریات اس جگہ قابض ہو رہے ہیں .....کامل ایک صدی سے اس شکست وریخت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

(نیا طوفان:۲۹)

نیز اسی رسالے میں آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

''قول کا حال یہ ہے کہ ایمان میں ضعف اور اخلاق میں انحطاط آچکا ہے؛ لیکن اس کا نہ ہمیں پتہ چلا، نہ خود قوم کو شعور ہوا،تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے کا حال یہ ہے کہ مغربی فلسفوں اور سیاست واقتدار کے اثر سے بیشتر افراد میں عقیدہ گویا پگھل چکا ہے؛ بل کہ بہت سوں کا حال تو یہ ہو چکا ہے کہ اسلامی عقیدے سے کھلے باغی اور مغربی فلسفوں اور ان فلسفوں کے لائے ہوئے افکار وعقائد پر دل کی گہرائیوں سے ایمان، ان کے لیے دنیا سے لڑ جانے کا

جوش وولولہ اوران کی نشر واشاعت کا جنون ، یہ فکر کہ زندگی کا نظام، ان فلسفوں کی روشنی اوران کی دی ہوئی بنیادوں پر استوار کیا جائے اور یہ کوشش کہ پوری قوم کو اس لا دینیت سے مانوس کیا جائے ، یہ ہے کہ اس طبقے کے بہت سے افراد کا ذہنی حال۔‘‘

(نیا طوفان:۳۳-۳۴)

غرض یہ کہ اس طبقے میں کفر وشرک اور بغاوت وطغیانی اور الحاد ودہریت کے جذبات وخیالات جنم لیتے اور پرورش پاتے نظر آتے ہیں ؛ کیوں کہ ان کا مزاج مغربی ثقافت و تہذیب کے مزاج وخصوصیات سے تشکیل پایا ہوا ہے اوران فکری وفلسفیانہ رجحانات کا آئینہ دار ہے،جن سے مغربی ثقافت وتہذیب پروان چڑھی ہے۔

چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

امت مسلمہ کہلانے والی اس امت کے لوگوں میں اگر ایسے لوگ بھی ایک کثیر تعداد میں موجود ہوں، جو اپنے عقائد وافکار، اپنے عمل وکردار، اپنی ثقافت وتہذیب ، اپنے تمدن و معاشرت ،اپنے تشخص وامتیاز کو اس طرح کھودیں یا اس سے بیزار ہوں کہ ان کو دوسروں کی تہذیب وتمدن میں، غیروں کے افکار ونظریات میں،ملحدوں وباغیوں کی معاشرت وثقافت میں، ان کے طرز زندگی اور نظام حیات میں خوبی وبھلائی نظر آئے اور وہ مغربی فلسفوں اور اہل باطل کی طرز فکر کو ترجیح دیتے ہوں،تو خیال کیا جا سکتا ہے کہ امت کس طرح کامیابی کی وہ منزل طے کرسکتی ہے، جو ایمان کامل کا امتیاز اور خاصہ ہے؟ ؎

لہذا امت کو اپنے ماضی کی جانب لوٹنے اوراپنے اسلاف کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرنا چاہیے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے ایمان کو کامل بنایا جائے ، اسلام کے اساسیات وعقائد پر ایمان کو بحال کیا جائے ،اسلام کی تعلیمات وتلقینات کو علی وجہ الاتم قبول کیا جائے ،اس کے نظام وحقائق پر کلی اعتماد پیدا کیا جائے ، رسالت محمدی پر اعتماد کو واپس لا یا جائے ،اسلامی حقائق کی خوبی وکمال پر یقین اوران کے عادلانہ ومنصفانہ ہونے پر اطمینان

ہوجائے اور دنیا کے کسی فلسفے ونظریے، کسی تہذیب وثقافت، کسی سیاسی وملکی نظام، کسی اقتصادی ومعاشی نظام کو اسلام کے دیے ہوئے نظام وفکر کے مقابلے میں کوئی ترجیح نہ دی جائے۔

دوسرے یہ کہ اپنے اعمال کا محاسبہ کیا جائے، اخلاق کی نگرانی کی جائے، معاشرت و تہذیب کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان میں کہاں کہاں اور کیا کیا اور کیسی کیسی کمی و کوتاہی ہورہی ہے،؟ اور اسلام کی اصلی وحقیقی تعلیمات سے کس جگہ انحراف واعراض پیدا ہو رہا ہے؟ اور پھر ان کوتاہیوں اور کمیوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے اور اسی کے ساتھ اپنے لگے بندھے لوگوں کو بھی اس جانب پوری ہمدردی وسنجیدگی کے ساتھ متوجہ کیا جائے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز

کون نہیں جانتا کہ دنیا میں قوموں اور ملکوں کا عروج وزوال اور ان میں سیاسی وتمدنی، معاشرتی وتہذیبی کشمکش کا سلسلہ ایک بار نہیں، بلکہ اس کا مشاہدہ آنکھوں نے بار بار کیا ہے اور بڑے بڑے تمدنی وسیاسی ڈھانچے کبھی کبھی آناً فاناً ڈھیر ہوتے نظر آئے ہیں۔ انسانوں کے ایک طبقے نے دوسرے طبقے کے خلاف محاذ آرائی کی اور ایک دوسرے کو نیست ونابود کرنے کی کوشش کی اور کبھی ایک تو کبھی دوسری قوم نے غلبہ پایا اور فتح کے شادیانے بجائے۔

کیا بنی اسرائیل کے خلاف شاہ بابل بخت نصر نے ملک شام پر حملہ نہیں کیا تھا؟ اور بنی اسرائیل کی تہذیب وتمدن کو تاخت وتاراج نہیں کردیا تھا؟ اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجادی تھی؟ اور کیا بے شمار انسانوں کو قتل اور لاتعداد لوگوں کو قیدی نہیں بنالیا تھا؟ کیا بیت المقدس میں خون کی ندیاں نہیں بہادی تھیں؟

اسی طرح ساسانی اور بازنطینی شہنشاہیاں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی رہیں، جس کے نتیجے میں سیاسی وسماجی افراتفری پیدا ہوگئی تھی۔ یورپ جہاں کبھی تہذیب وتمدن کے تناور درخت نے ایک عالم کو اپنے سایے سے سکون و قرار بخشا تھا، وہاں تہذیب وتمدن کی جگہ ایک طویل زمانے تک وحشت ناک وخوف ناک تاریکی نے لے لی تھی۔ عربوں کی زندگی کا امتیاز ہی خوف ناک لڑائیوں، آپسی نزاعات، ظلم وزیادتی سے قائم تھا۔

پھر دور اسلام میں اسلام کے خلاف کی جانے والی تخریبی کارروائیوں، سازشوں، کوششوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے جس میں مختلف مذاہب اور تہذیبوں، متعدد قوموں اور ملکوں

نے حصہ لیا اور مسلمانوں اور ان کے مذہب کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی ناپاک وگھناؤنی کوششیں کیں اور اس ارادے کی تکمیل اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں مختلف حربے اور تدبیریں استعمال کیں اور اس میں انھوں نے کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

پھر اُس دور کی تاریخ بھی تاریخی وثیقوں میں محفوظ ہے جبکہ ساتویں صدی میں تاتاری قوم سارے عالم اسلام پر چھا گئی اور اس ارادے سے وہ ملک در ملک بڑھتی چلی گئی کہ مسلمانوں کو کرۂ ارضی سے نابود کر دیا جائے، اور ان کی سیاسی وعسکری قوت کو پاش پاش کر دیا جائے، ان کا یہ حملہ اس قدر شدید و مدید تھا اور انھوں نے وحشت و بربریت کا وہ ریکارڈ قائم کر دیا تھا کہ اس کو پیش کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے؛ حتی کہ علامہ ابن الاثیر جو خود اس حادثہ کے وقت موجود تھے، انھوں نے اس کی تاریخ لکھتے ہوئے تمہید میں لکھا ہے:

” لقد بقيتُ عدة سنين مُعرِضاً عن ذكر هذه الحادثة استعظاماً لها ، كارهاً لذكرها ، فأنا أقدِّمُ إليه رِجلاً وأؤخِّر أخرى ، فمن الذي يسهل عليه أن يكتب نعى الاسلام و المسلمين ومن الذى يهون عليه ذكر ذلک ؟ فياليت أمى لم تلدنى ويا ليتنى مت قبل حدوثها وكنت نسيا منسيا .....ولو قال قائل : ان العالم مذ خلق الله تعالى آدم إلى الآن لم يبتلو بمثلها لكان صادقا فإن التواريخ لم تتضمن ما يقاربها ولا ما يدانيها .“

(میں کئی سالوں تک اس حادثے سے اس کی خوفناکی کی وجہ سے اعراض کرتا رہا اور اس کے ذکر کو برا خیال کرتا رہا، کبھی تو اس کی جانب قدم بڑھاتا اور کبھی قدم پیچھے کر لیتا، کس کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی مصیبت کا ذکر کرنا آسان ہے اور کون ہے جس پر اس کا ذکر کرنا سہل ہے؟ اے کاش کہ میری ماں

مجھے نہ جنتی اور اے کاش کہ میں اس حادثے سے پہلے ہی مرجاتا اور نسیا منسیا ہوجاتا ! اگر کوئی کہنے والا یہ کہدے کہ جب سے اللہ تعالی نے عالم میں حضرت آدم کو پیدا کیا اس وقت سے اب تک کبھی لوگ اس قسم کے حادثے میں مبتلا نہیں ہوئے تو وہ صادق ہوگا ، کیونکہ تاریخوں نے ایسا کوئی واقعہ نہیں ذکر کیا ہے جو اس کے برابر کا ہو یا اس کے قریب قریب ہو)

(الکامل لابن الاثیر: ۳۰۴/۵)

اور آج بھی دنیا میں یہ سیاسی کشمکش اور تہذیبی تقابل کا سلسلہ جاری ہے اور ہم بھی اپنی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کررہے ہیں ، ابھی چند ہی سال پہلے فرانس ، اٹلی اور روس کے ہاتھوں شمالی افریقہ کے مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے ، ان کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ، اس وقت اٹلی نے طرابلس کے اسی ہزار عرب مسلمانوں کو عورتوں اور بچوں سمیت ان کے گھروں سے نکال کر ریگستان میں ڈال دیا جہاں نہ کوئی کھانے کی چیز میسر نہ پانی ، جہاں بہت سے لوگ موت کے آغوش میں چلے گئے ۔ امریکہ کی سربراہی میں متعدد ملکوں میں قیامت خیز حالات و واقعات پیش آچکے ہیں ، کئی ملکوں میں ہلاکت خیزیوں کا وہ خوف ناک منظر سامنے آچکا ہے جس نے بہت سے سابقہ ریکارڈ توڑ دئے ہیں ۔ اسرائیل اور فلسطین کا مسئلہ ایک طویل عرصے سے انسانیت کے چہرے کا داغ بنا ہوا ہے ، افغانستان کی بلا خیز جنگ کو ابھی تک ذہنوں نے فراموش نہیں کیا ہے ، عراق کے جنگی طوفان کی ہلاکت خیز موجوں نے جو تباہ کاریاں کیں ، ان کو دیکھنے والی آنکھیں اب بھی موجود ہیں ، داعش نے ابھی جو انسان دشمنی اور وحشیانہ کردار کا ریکارڈ قائم کیا اور بے تحاشہ انسانوں کو تہہ تیغ کیا ہے ، اور انتہائی بے دردی کے ساتھ ان کا قتل عام کیا اور مکھیوں اور مچھروں کی طرح ان کو مسل کے رکھ دیا ، تاریخ میں اس کو انسانیت کا سب سے ''سیاہ و منحوس واقعہ'' کہا جائے گا اور اب ملک شام میں ہونے والے مظالم اور عوام الناس کے ساتھ روا رکھا گیا بدترین رویہ ، جس نے لاکھوں لوگوں کو زندگی سے محروم کردیا ، لاکھوں انسانوں کو بے گھر کردیا ، بے حساب لوگوں کو مفلوج و

محتاج بنا دیا، ہزاروں بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ بنا دیا اور شہروں کے شہروں کو ویران کر دیا، یہ دور حاضر میں- جو تہذیب و تمدن کا اور تعلیم و تثقیف کا دور کہلاتا ہے- پیش آنے والا نہایت بدترین اور انسانیت سوز واقعہ ہے۔

پھر ہمارا یہ ہندوستان جو مختلف تہذیبوں کا علمبردار اور مختلف مذاہب کا گہوارا ہے، اس میں آئے دن پیش آنے والے واقعات، خواہ وہ سیاسی نوعیت کے ہوں یا تہذیبی نوعیت کے ہوں، مذہبی فرقہ بندی کی بنا پر رونما ہونے والے ہوں یا آپسی رنجشوں کا نتیجہ ہوں، انسانیت سوز واقعات ہیں، جو دنیا میں انسانوں کے لیے جہنم کا نمونہ پیش کر رہے ہیں، جن سے ملک کی ساکھ داغدار ہوتی جا رہی ہے، سیاسی نظام مختل ہوتا جا رہا ہے، لوگوں کا سکون غارت ہو چکا ہے، تجارتیں سسکیاں لے رہی ہیں، نظام عدل و انصاف مفلوج ہو چکا ہے، رواداری و محبت، انسانیت و اخلاق، ہمدردی و غم خواری، رحم دلی و دل سوزی مفقود ہوتی جا رہی ہے، اور یہ سب اس کے علاوہ ہے کہ ہزاروں انسانی جانیں موت کے گھاٹ اتر چکی ہیں۔

یہ سارے وہ حقائق و واقعات ہیں جو سب کو معلوم ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب واقعات کے پیچھے وہ کیا چیز ہے جو ان کا محرک و باعث بن رہی ہے؟ اور انسانوں کو درندہ صفت بننے پر مجبور کر رہی ہے؟ حتی کہ ایسا لگتا ہے کہ خود درندے بھی ان واقعات پر شرم کے مارے سر جھکا لیتے ہوں گے اور یہ کہتے ہوں گے کہ ان انسانوں نے درندگی کا اور تباہ کاریوں کا وہ ریکارڈ قائم کیا ہے کہ ہم نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا؟

اس سوال کے جواب میں بعض وہ حضرات جو زیادہ دقت نظری اور وسیع الفکری سے کام نہیں لیتے، یہ کہہ جاتے ہیں کہ ان سب کی وجہ دراصل تعلیم و تعلم کا فقدان اور تہذیب و تمدن سے دوری ہے۔ لہذا اگر لوگوں میں تعلیم و تہذیب عام کی جائے، ان میں جدید علوم کے ماہرین پیدا کئے جائیں، سائنسی تحقیقات اور انکشافات کا ذوق پیدا کیا جائے، اس کے لیے جامعات اور یونیورسٹیاں قائم کی جائیں، پھر یہاں سے پڑھ لکھ کر پیدا ہونے والے لوگ جا کر حیرت انگیز ایجادات اور محیر العقول چیزیں تیار کریں، اس طرح لوگوں میں سمجھ

بوجھ پیدا ہو جائے گی اور بالخصوص مسلمان اس میں خوب حصہ دار بنیں اور ان میں ہمہ علوم کے ماہرین پیدا کیے جائیں تو پھر دنیا کے وہ مالک ہو جائیں گے اور دنیا میں ایک عظیم وصالح انقلاب آجائے گا اور یہ سسکتی انسانیت میں جان آجائے گی۔

لیکن اس جواب پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیا میں متمدن ملکوں اور تہذیب یافتہ قوموں میں یہ کشمکش نہیں دیکھی گئی؟ کیا ساسانی اور بازنطینی حکومتیں متمدن حکومتیں نہیں تھیں، ان میں کیا اپنے دور کی تعلیم وتثقیف کا رواج نہیں تھا؟ اور امریکہ اور اس کے مخالف ممالک جو آج برسر پیکار ہیں، ان میں کیا تعلیم وتمدن کی کمی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں وہی کشمکش جاری ہے، وہی تقابل آرائی پائی جارہی ہے، وہی انسانیت سوز باتیں پیش آرہی ہیں، وہی انسانوں کو تہہ تیغ کرنے اور ان کے قتل عام کے واقعات پیش آرہے ہیں؟ معلوم ہوا کہ ان حضرات نے جو وجہ تلاش کی ہے وہ سو فی صد وجہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

لہذا جب پوری سنجیدگی کے ساتھ اور دقت نظری ووسیع الظرفی سے غور کیا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو چیز ان سارے واقعات کے پیچھے کارفرما ہے وہ ہے نفس پرستی، مادہ پرستی اور مفاد طلبی، غلبہ پسندی، قساوت وبہیمیت، قومی عصبیت، نسلی کشمکش، جاہلی حمیت، مادی ہوس، اخلاقی بے راہ روی اور معاشرتی انارکی۔ یہ سب انسانی بیماریوں کی فہرست میں سے چند بیماریاں ہیں جو انسانوں کے دلوں میں لگ جاتی ہے اور ان کو فساد زدہ کردیتی ہے اور پھر کیا ہے؟ ان کے عقیدے ونظریے میں، ان کی معاشرت وتہذیب میں، ان کے اخلاق و طرز عمل میں اور ان کے معاملات میں گھن لگ جاتا ہے اور وہ وہ سب کچھ کرنے لگ جاتے ہیں جن کا تصور کرتے ہوئے بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔

یہ ہے اصل وجہ جو ان ساری انسانیت سوز حرکات کے پیچھے کام کرتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ایک متمدن ملک اور تعلیم یافتہ قوم میں بھی یہ ساری بیماریاں پائی جاسکتی ہیں، بلکہ واقعۃً پائی جاتی ہیں، ممکن ہے کہ کوئی بڑا تعلیم یافتہ ہو، مگر دل فساد زدہ ہو، کوئی بڑا تہذیب کا دلدادہ

ہو، مگر نفس پرستی نے اس کو مار دیا ہو، کوئی بڑا گرایجویٹ ہو، لیکن قومی عصبیت کا شکار ہو، کوئی ڈاکٹر ہو مگر ہوا و ہوس کا پجاری ہو، کوئی بیرسٹر ہو اور ساتھ ساتھ اخلاقی گراوٹ کا مریض ہو، کوئی انجینئر ہو مگر مادہ پرست ہو، اس لیے تعلیم و تہذیب اور تمدن و معاشرت کے علمبر دار ہونے کے باوجود وہ انسانیت کے لیے ایک دھبہ اور داغ بن جاتے ہیں اور درندوں کا رول ادا کرتے ہیں، بلکہ کبھی ان سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام دنیا میں جو نظام و نصاب لے کر آتے ہیں اور جو ربانی پیغام و ہدایت پیش کرتے ہیں، وہ خدا پرستی، خدا ترسی، انسان دوستی، دل سوزی ورحم دلی، ہمدردی و غم خواری، ایثار و قربانی اور اخلاق و کردار کے اصول و اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں، یہی وہ انسانیت کے لیے "جلیل الشان ربانی ہدیہ" اور "عظیم الشان نبوی تحفہ" ہے جس نے ہمیشہ ایسے نازک ترین وقت اور ماحول میں سسکتی انسانیت کو دم توڑنے سے بچالیا، اس کو نیا عزم و حوصلہ، نئی قوت و طاقت عطا کی، تباہی کی شکار انسانیت کو تعمیر انسانیت کا ذوق بخشا، ظلم و زیادتی کی جگہ عدل و انصاف کا مقدس پیمانہ دیا، تہذیب و تمدن کے بے روح ڈھانچے میں اخلاص وللّٰہیت کی روح پھونکی، خوبیوں اور نیکیوں سے محبت اور برائیوں اور رذائل سے نفرت کا جذبہ دیا، وحدت انسانی اور مساوات انسانی کا تصور دیا۔

آج کی سیاسی کشمکش اور تہذیبی و تمدنی مقابلہ آرائی اور انسانیت کے خلاف مظالم اور روز روز پیش آنے والے انسانیت سوز حالات و واقعات سے یوں لگتا ہے کہ ہر ایک پریشان ہے اور انسان کو انسان سے نفرت ہوگئی ہے، یا کم از کم بے اطمینانی و بے اعتمادی پیدا ہو چکی ہے، انسان انسان سے اس طرح بدک رہا ہے جیسے وہ کوئی درندہ یا کوئی موذی جانور ہو۔

لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب انسانیت کو اس عالم نزع سے کس طرح نکالا جائے اور اس سسکتی انسانیت کو کس طرح بچایا جائے؟ افسوس کہ اس سوال کا جواب دینے والے اب بھی وہی ناقص جواب دیتے ہیں جو اوپر ذکر کیا گیا، مگر کہہ چکا ہوں کہ یہ اس مرض کی دوا نہیں، بلکہ اس کی اصل دوا وہ ہے جو پیغمبرانہ نصاب و نظام میں موجود ہے، جس کا سب سے آخری و

حتمی وقطعی نسخہ ہمارے آقا حضرت نبی آخرالزماں محمد ﷺ نے پیش کیا ہے۔

مسلمانو! یہ ''نسخۂ انسانیت'' کسی کے پاس نہیں ہے، یہ صرف ہمارے پاس ہے، ہم ہی اس کے امین ہیں، لہذا ہم ہی حقیقتاً سب سے بڑے اس امانت کے گراں بار اور ذمہ دار ہیں جن کو روئے زمین سے برائی اور بداخلاقی اور ظلم و جور کے مٹانے اور معروفات کی ترویج و اشاعت، مظلوموں کی دادرسی اور قیام امن جیسی نازک ترین ذمہ داری دی گئی ہے، لہذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس ''نسخۂ انسانیت'' کو آج اس سسکتی انسانیت کو بچانے، اس کو راہ راست دکھانے، اس کو ظلم وزیادتی کے طوفانوں سے بچانے، اس کو حق وصداقت کے قریب لانے، اس میں رحم وکرم، ہمدردی وغم خواری، شرافت وسعادت، الفت ومحبت، عدل و انصاف پیدا کرنے کے لیے استعمال کریں۔

اس سے پہلے بھی انسانیت کو اس کا مقام بتانے، اس کو صحیح انسانیت کا سبق پڑھانے کے لیے وہی اٹھے تھے جو اس امانت کے امین تھے، اور انھوں نے ہی اس کا رخ ہلاکت خیز موجوں کی جانب سے موڑ کر اس کو بچایا تھا، لہذا آج بھی وہی معماران انسانیت اس کام کو انجام دے سکتے ہیں، لہذا یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہوں کہ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز

ایک روزہ، جس کو بھلا دیا گیا ہے

رمضان المبارک کے ایام گزر گئے جس طرح ہمیشہ سے آتے اور گزر جاتے ہیں، مگر ہم میں بہت کم لوگ ہوں گے جنھوں نے اس پر توجہ دی ہو کہ رمضان نے ہمیں کیا پیغام دیا اور اس کی آمد ورفت نے ہمارے اندر کیا اثر چھوڑا اور ہم نے اس کا کیا اثر لیا؟ عموماً دیکھا یہ جاتا ہے کہ رمضان کی آمد سے مساجد میں مصلیوں کی تعداد میں ایک قابل ذکر اضافہ ہو جاتا ہے، ذاکرین اور شاغلین کی کثرت و بہتات ہو جاتی ہے، عبادتوں میں ذوق وشوق کی ایک عجیب لہر پیدا ہو جاتی ہے اور طاعتوں اور نیکیوں کا نور ہر طرف چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے، نیز گناہ کے بادل چھٹتے دکھائی دیتے ہیں، اہل معاصی اہل طاعت کی فہرست میں نظر آتے ہیں اور اپنے گناہوں سے نفور و دور محسوس ہوتے ہیں اور ان کے دلوں سے سیاہی مٹتی معلوم ہوتی ہے؛ لیکن حیرت واستعجاب کی انتہاء ہے کہ جونہی رمضان رخصت ہوتا ہے، اسی وقت سے علی الفور ایک معکوس انقلاب سامنے آتا ہے کہ ان نمازیوں، ان ذکر وفکر والوں، ان طاعات ونیکیوں میں دلچسپی کا مظاہرہ کرنے والوں اور ان تلاوت کرنے والوں کو مساجد میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتے، مساجد ویرانی کا شکوہ کرتی محسوس ہوتی ہیں، سارے بازار آباد ہو جاتے ہیں، گناہوں میں اضافہ وترقی ہو جاتی ہے، وہ نورانیت وروحانیت کی فضائیں یک لخت مفقود ہو جاتی ہیں اور لوگ بیک دم الٹے پاؤں اپنی پرانے روش پر ایسا لوٹ جاتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید بڑے انتظار میں تھے کہ نہ جانے کب یہ رمضان ختم ہو اور ہم اس کی قید و بیڑی سے باہر نکلیں؟

یہ صورت حال ہر سال دیکھنے میں آتی ہے، جو نہایت افسوس ناک بھی ہے اور دینی لحاظ

سے خطرناک بھی؛ کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ لوگ اس بات کو بھول گئے کہ رمضان ہمیں ایک پیغام دیتا ہوا آتا ہے اور وہ پیغام دے جاتا ہے اور بزبان حال گویا وہ یہ کہتا ہے کہ تم نے رمضان میں صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک جو کھانے، پینے اور اپنی جائز خواہشات سے پرہیز کرتے ہوئے روزہ رکھا، یہ مختصر روزہ تھا، جو صبح صادق سے شام تک کا ہوا کرتا تھا، اور شام ہونے پر ختم ہوجاتا تھا؛ لیکن اب رمضان کے بعد تمہیں ایک طویل و مدید روزہ رکھنا ہے اور درحقیقت رمضان اسی طویل اور مدید روزے کے لیے بطور مشق وتمرین ایک کورس تھا اور اس سے تمہیں یہ سکھانا مقصود ہے کہ تم زندگی بھر تمام قسم کے معاصی اور گناہوں سے پرہیز کا روزہ رکھو۔ لہذا اے مسلمانو! میری دوبارہ حاضری تک معاصی و گناہوں سے بچتے ہوئے روزہ کا فریضہ انجام دیتے رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے جاتے ہی تم مجھے بھی بھول جاؤ اور میرے اس پیغام کو بھی نظرانداز کرڈالو۔

مگر افسوس کہ لوگ رمضان کے جاتے ہی اس پیغام کو بھول جاتے ہیں اور پھر اسی حالت کی جانب لوٹ جاتے ہیں جس میں وہ پہلے تھے اور معروفات سے دوری اور منکرات سے وابستگی پیدا کرلیتے ہیں۔

قرآن کریم نے روزے کی اس حکمت کی جانب اشارہ دیتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون﴾

(تم پر بھی اسی طرح روزے فرض کئے گئے جس طرح کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم تقوی شعار بن جاؤ)

اس آیت نے واضح کردیا کہ روزے کی مشروعیت دراصل اسی وجہ سے ہوئی ہے کہ انسان میں تقوی پیدا ہوجائے اور وہ اپنی زندگی میں تقوی شعار بن کر رہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ الہند کے ترجمے پر ''اپنے فوائد تفسیریہ'' میں لکھتے ہیں:

”روزے سے نفس کو اس کی مرغوبات سے روکنے کی عادت پڑے گی تو پھر اس کو ان مرغوبات سے جو شرعاً حرام ہیں، روک سکو گے اور روزے سے نفس کی قوت وشہوت میں ضعف بھی آئے گا تو اب تم متقی ہو جاؤ گے۔ بڑی حکمت روزہ میں یہی ہے کہ نفس کی اصلاح ہو اور شریعت کے احکام جو نفس کو بھاری معلوم ہوتے ہیں، ان کا کرنا سہل ہو جائے اور متقی بن جاؤ۔“

(فوائد تفسیر)

اور حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ اپنی تفسیر ”معارف القرآن“ میں لکھتے ہیں:

”اے ایمان والو! ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ بجائے اہل ایمان کے اپنے نفس موذی کو مارو، کہ جو ہر وقت تمہاری تاک میں ہے اور تمہارے خدا کے درمیان سد راہ ہے، تمہارا دشمن ہے اور تمہارے جانی اور ایمانی دشمن یعنی شیطان کا دوست بلکہ حقیقی اور جڑاوں بھائی ہے، مثل مشہور ہے کہ شیطان اور نفس دونوں حقیقی بھائی ہیں، ساتھ پیدا ہوئے، اس لیے ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ اس دشمن کو مارو اور روح کو زندہ کرو جو تمہارے پاس فرشتوں کی جنس کی ایک چیز ہے۔ نفس کے مارنے اور روح کے زندہ کرنے کا بہترین طریقہ صبر ہے اور صبر حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ چند روز روزے رکھو، قوت شہویہ اور قوت غضبیہ، جو تمام معاصی کا منبع ہے اس کے کچلنے کے لیے روزہ تریاق اور اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔“

(معارف القرآن ادریسی: ۱/۳۶۰)

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

”روزہ تعمیل ارشاد خداوندی میں تزکیۂ نفس و تربیت جسم دونوں کا ایک بہترین دستور العمل ہے، اشخاص کے انفرادی اور امت کے اجتماعی ہر دو نقطۂ نظر سے ”لعلکم تتقون“ کے ارشاد سے اسلامی روزے کی اصل غرض و غایت

کی تصریح ہوگئی کہ اس سے مقصود تقوے کی عادت ڈالنا اور امت اور افراد کو متقی بنانا ہے۔‘‘

(تفسیر ماجدی)

الغرض رمضان کا روزہ صرف ایک روزہ نہیں، بلکہ ایک اور بڑے اور طویل روزے کی تیاری ہے، اور وہ روزہ اسلامی زبان میں ’’تقوی‘‘ کہلاتا ہے۔

تقوی کیا ہے؟ تقوی کی حقیقت ہر اس چیز سے خود کو بچانا ہے جو خدا کی ناراضی کا سبب و باعث بنتی ہے۔ بالفاظ دگر تمام طاعات و معروفات کی بجا آوری اور ہر قسم کے معاصی و منکرات سے اجتناب و احتیاط کا نام تقوی ہے۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تقوی دراصل ایک طویل ترین روزہ ہے، جس میں انسان کو پوری زندگی میں اور زندگی کے ہر لمحے میں ان امور سے اجتناب و احتیاط لازم و ضروری ہوتا ہے جو رضائے الٰہی میں خلل ڈالتے اور قہر خداوندی کا باعث و موجب بنتے ہیں۔ یہ ہے وہ طویل و مدید روزہ جس کا سبق رمضان ہمیں دیتا ہے۔

لہذا رمضان ہی میں اس جانب توجہ دینے اور اس کی فکر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم اس طویل روزے کی قابلیت اپنے اندر پیدا کریں؛ کیونکہ مقصد ربانی و منشأ نبوی روزے سے صرف ’’بھوک و پیاس کا روزہ‘‘ نہیں ہے، بلکہ مقصود و مطلوب وہ قابلیت و صلاحیت پیدا کرنا ہے جس سے آدمی میں زندگی بھر کے روزے (جس کا اسلامی نام ’’تقوی‘‘ ہے) کی سکت پیدا ہو جائے، اگر اس رمضان کے روزے سے زندگی بھر کے روزے کی قابلیت و صلاحیت نہ پیدا ہوئی تو اس سے مقصود حاصل نہ ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ایک موقعے پر ارشاد فرمایا:

’’ من لم يدع قول الزور والعمل به ، فليس لله حاجة أن يدع طعامه و شرابه ‘‘

(بخاری:۱۹۰۳، ابوداود:۲۳۶۲، ترمذی:۷۰۷)

(جو شخص جھوٹ اوراس پر عمل کو نہ چھوڑے، اللہ تعالی کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے)

اس میں اشارہ ان لوگوں کی جانب ہے جو بھوکے پیاسے تو رہتے ہیں، مگر جو اس بھوک و پیاس کا مقصد ہے کہ تقوی حاصل ہو اور انسان اس کی وجہ سے گناہوں سے بچنے کا عادی ہو جائے، اس کی جانب ان کا کوئی دھیان نہیں ہوتا۔

اور اسی قسم کے روزے داروں کے بارے میں ایک اور حدیث میں یہ ارشاد ہوا:

" ربَّ صائم ليس له من صيامه إلا الجوع "

(بہت سے روزے دار ایسے ہیں جنھیں ان کے روزوں سے سوائے بھوک کے کچھ حاصل نہیں۔)

(ابن ماجہ:۱۶۹۰، احمد:۹۶۸۳، سنن کبری نسائی:۳۲۳۶)

امام بیضاوی سے علامہ سیوطی نے اس حدیث کی شرح میں نقل کیا ہے:

" المقصود من إيجاب الصوم و مشروعيته ليس نفس الجوع والعطش ، بل ما يتبعه من كسر الشهوات و إطفاء نار الغضب و تطويع النفس الأمارة للنفس المطمئنة ، فإذا لم يحصل له شيء من ذلک ولم يكن له من صيامه إلا الجوع والعطش لم يبال الله تعالى بصومه ولم ينظر إليه نظر القبول " .

(روزے کو واجب و مشروع کرنے سے مقصود محض بھوک و پیاس نہیں ہے ؛ بلکہ اس سے ظاہر ہونے والے اثرات، جیسے شہوت کو توڑنا اور غضب کی آگ کو بجھانا اور نفس امارہ کو نفس مطمئنہ کے تابع کرنا مقصود ہے، لہذا اگر اس سے یہ بات حاصل نہ ہوئی اور محض بھوک و پیاس ہی نصیب میں آئی تو اللہ تعالی اس روزہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور اس کو بہ نظرِ قبول نہیں دیکھتے۔)

(مصباح الزجاجۃ: ونور مصباح الزجاجہ:۴۸)

الغرض رمضان روزے کا تحفہ لے کر آتا ہے اور اس سے مقصود یہی تقوی کی مشق کرنا ہوتا ہے تا کہ سال بھر ہم تقوے کی زندگی گزار سکیں ، اور زندگی بھر کا یہ روزہ ہمارے لئے آسان ہوجائے ، مگر لوگ اس اہم روزے سے غافل ہیں اور رمضان کے اس پیغام کو بھلا بیٹھے ہیں ، لہذا اب جبکہ رمضان کے ایام گزر چکے ہیں ، ہم اس کے لیے کمر ہمت باندھ لیں کہ ہم اس طویل روزے کی کوشش کریں گے جس میں ہمیں تقوی شعار بننا ہے اور تمام معاصی و منکرات سے بچنے کا اہتمام کرنا ہے۔

☆☆☆